رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

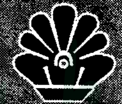




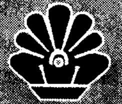
ماہنامہ
نئے اُفق



مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین



جلد	41
شمارہ	06
جولائی	2017



رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس



پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ... ای میل: info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کون کتنا پہلوان ہے......؟

ہمارے اہل سیاست ہوں کہ اہل صحافت دونوں اپنی اپنی جگہ شیر ہیں پر سے کوا بنا کر اڑا دینا دونوں کا ہی خاصہ ہو کر رہ گیا۔ اہل سیاست تو اپنی جگہ انہیں عوام کو سنانے بے وقوف بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑتا ہے اکثر اہل سیاست تو اپنی بات سنانے سمجھانے کے لیے برقی ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہیں ان میں سے اکثر چینل کا وقت خریدنے کے لیے خاصی رقم ادا بھی کرتے ہیں ٹی وی پر بیٹھ کر میل کا بیل بنا کر اپنی ہوشیاری، دانش مندی، باخبری سے زیادہ بے خبری کا اظہار کرتے ہیں ایسے ہی کرم فرماؤں سے بہت سے اہل صحافت کا دال دلیہ چلتا ہے بلکہ قورمہ، بریانی چلتی ہے کچھ تو دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں چینلز مالکان کو اپنے چینل سے اس قدر آمدنی ہو نہ ہو لیکن اینکر محترم کی آمدنی بے حساب ہوتی ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہمیں مرنا ہی نہیں ہے نہ روز آخرت ہمارا واسطہ ہمارے اعمال کے حساب کتاب سے ہونا ہے جو کچھ ملنا ہے اسی دنیا میں ملنا ہے کشمیر اور کشمیری عوام جو پاکستان سے اپنا تعلق جوڑنے اور بھارت سے قائم تعلق توڑنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور خالی ہاتھوں جدید ترین ہتھیار والوں سے مقابلہ کر رہے ہیں اگر ہم بحیثیت مسلمان دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں تو کشمیری دور جدید میں ''جنگ بدر'' کی معرکہ آرائی میں مصروف ہیں جنگ بدر میں تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں نے اپنے سے دس گناہ بڑی اور ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس کفار مکہ کی فوج کا مقابلہ کیا تھا، اس جنگ بدر اور اس جنگ آزادی کشمیر میں یہ فرق ہے کہ وہ جنگ اللہ کے دین کے لیے لڑی گئی تھی اس لیے اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کی جنگ آزادی کشمیر بھی لڑی تو کفار سے ہی جارہی ہے لیکن یہ جنگ اللہ کے دین کی جگہ پاکستان سے الحاق کے لیے لڑی جارہی ہے جس میں پاکستان کسی بھی طرح ان کا حامی و ناصر نہیں بن رہا وہ اکیلے ہی اپنی جنگ لڑ رہے ہیں اپنی جانیں اپنی عزت اپنی ناموس داؤ پر لگا رہے ہیں ہمارے حکمرانوں کو اپنے ذاتی اور سیاسی مسائل سے اتنی فرصت نہیں کہ ان کی زبانی کلامی ہی حمایت کر سکیں مخالفین بھی الزام لگانے میں کسی سے کم نہیں ان کے خیال میں موجودہ حکمران میاں نواز شریف کے بھارتی ہم منصب نریندر مودی سے چونکہ بہت اچھے تعلقات ہیں جو سیاسی سے کہیں زیادہ تجارتی ہیں کیونکہ میاں صاحب کی فیملی کا کاروبار بھارت کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ ہے اور کئی کے ساتھ تو میاں صاحب کے کاروباری تعلقات بھی مستحکم رہے جس کے باعث میاں صاحب کی زبان تالو سے لگی رہتی ہے اب چونکہ بظاہر الیکشن نزدیک آتا جارہا ہے میاں صاحب کو آنے والے الیکشن نے گھیر لیا ہے اب وہ رات و دن الیکشن جیتنے کی مہم جوئی میں جت گئے ہیں انہیں ہر طرف

الیکشن میں اپنے مد مقابل عمران خان اور زرداری نظر آ رہے ہیں اور کئی لوگوں کے خیال میں تو میاں صاحب آج کل بدخوابی کا شکار ہیں اگر کہیں ان کی آنکھ لگ بھی جاتی ہے تو انہیں خواب میں بھی عمران خان اور زرداری کہیں نہ کہیں جلسہ کرتے ان کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن میاں صاحب کو اپنے اردگرد کی اپنے پڑوسیوں کی کوئی خیر خبر نہیں نہ انہیں کشمیری عوام کی فریادیں سنائی دے رہی ہیں نہ ہی اپنے عوام کی چیخ و پکار سنائی دے رہی ہے ان کے کان تو پانامہ لیکس کی جے آئی ٹی کی آواز پر لگے ہوئے ہیں جن سے وہ کسی بڑی خوش خبری کی توقع لگائے بیٹھے ہیں جبکہ ان کی مخالفین کے خیال میں بہت جلد میاں صاحب کی کھاٹ کھڑی ہونے والی ہے۔

وزیراعظم اپنے ہر جلسے اور تقریر میں اپنے مخالفین کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں انہیں موٹروے پر سفر کی دعوت دے رہے ہیں ان کے خیال میں ان کے حریف ان کے ترقیاتی کاموں سے خوف زدہ ہو کر الٹے سیدھے بیانات دے رہے ہیں حالانکہ میاں صاحب خود کلامی کا شکار ہیں کسی نے بھی ان کی مخالف برائے مخالفت نہیں کی ہاں اپنے تحفظات اور خدشات کا ضرور برملا اظہار کر رہے ہیں۔ میاں صاحب کی گھبراہٹ دیکھ کر ہی ان کے مخالفین کو دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا ہے ابھی تو پانامہ لیکس کے حصار سے میاں صاحب باہر نہیں نکل سکے ہیں میاں صاحب نے جلدی میں میدان انتخاب سجا دیا ہے ان کی دیکھا دیکھی دوسری بڑی جماعتوں نے بھی الیکشن کی تیاری ہی نہیں کی بلکہ وہ بھی میدان میں نکل آئے ہیں اور اب روز خطابت کا مقابلہ شروع ہو چکا ہے دیکھنا ہے کہ کس کے بازوں میں کتنا دم ہے کون عوام کو قائل کر سکتا ہے ویسے تو سب کا ووٹ بینک عوام سے زیادہ خواص کے ہاتھوں میں ہوتا ہے خصوصاً دیہی آبادی اپنے سردار اپنے چوہدری اپنے وڈیرے کو ووٹ دیتی ہے وہ جس کے ساتھ کھڑا ہو جائے وہ سارے ووٹ اسی کو پڑتے ہیں سیاسی جماعتیں عوام سے سودا کرنے کے بجائے چند وڈیروں سرداروں چوہدریوں سے اپنی کامیابی کا سودا کر لیتے ہیں اور یوں الیکشن الیکشن کھیلنے والے جب کہیں شکست سے دوچار ہوتے ہیں تو بدعنوانی دھاندلی کا شور مچانے لگتے ہیں اور کامیاب ہونے والوں کیخلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وطن عزیز میں تمام تر احتیاط و انتظام کے باوجود دھاندلی کے الزامات تو لگتے رہے ہیں اور آئندہ بھی لگتے رہیں گے دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ آنے والے انتخابات جس کی تیاری شروع کی جا چکی ہے کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے کس کے سر پر ہما بیٹھتا ہے کون اقتدار کی مسند پر بیٹھتا ہے ابھی الیکشن کا میدان دور ہے لیکن تمام ہی حلیفوں حریفوں کی دوڑ شروع ہو چکی ہے عوام حیرانگی و پریشانی سے ان تمام ہی اہل سیاست کو تک رہے ہیں اللہ اہل وطن کی وطن کی حفاظت فرمائے اور بدعنوان بدکردار لوگوں سے محفوظ رکھے، آمین۔



گفتگو

اقبال بھٹی

حضرت ابن مسعود و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا آدمی کی ہلاکت اس کی بی بی اور ماں باپ اور اولاد کے ہاتھوں ہوگی کہ یہ لوگ اس شخص کو ناداری سے عار دلائیں گے۔ اور ایسی باتوں کی فرمائش کریں گے جن کو یہ نہ اٹھا سکے گا۔ سو یہ ایسے کاموں میں گھس جاوے گا جس سے اس کا دین جاتا رہے گا پھر یہ برباد ہو جائے گا۔
(بیہقی حیوۃ المسلمین)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

نئے افق کا شمارہ جولائی حاضر خدمت ہے۔

آپ کے اس محبوب نئے افق کو شائع ہوتے ہوئے چالیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اسی ماہ مبارک رمضان میں جولائی کا مہینہ تھا جب 26 تاریخ کو ہم سے ہمارے اور آپ سب کے محبوب مصنف جناب ابن صفی صاحب جدا ہو گئے تھے اور راہی ملک عدم ہوئے تھے آپ سب محترم قارئین سے گزارش ہے کہ اس ماہ مبارک میں جس قدر بھی ہو سکے ان کی مغفرت اور بلند درجات کی دعا کریں اللہ انہیں جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے عطا فرمائے، ایک اور اہم گزارش ہے کہ ہمارے دیرینہ ساتھی اور نئے افق کے مدیر جناب اقبال بھٹی شدید علیل ہیں ان کی صحت کاملہ و عاجلہ کے لیے دعا کی درخواست ہے اللہ تعالیٰ اقبال بھٹی صاحب کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین

(مشتاق احمد قریشی)

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم خوب صورت اور دلنشین سرورق لیے ماہ جون 2017ء کا اعزازی پرچہ 22 مئی کو بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا تو بے قراری کو قرار آ گیا سب سے پہلے حسب معمول دستک پڑھی مشتاق احمد قریشی صاحب کا وزیر اعظم پر یہ مشورہ بہت اچھا ہے کہ ان کی عزت اس میں ہے کہ وہ آخری فیصلہ آنے سے پہلے اسمبلیاں تحلیل کر کے ساٹھ یا نوے دن کے اندر انتخاب کا ڈول ڈال دیں اور استعفیٰ دے دیں خیر اس پر مزید تبصرہ نہیں کیا جا سکتا آگے بڑھے تو گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب خوب صورت خط پر انعام دینے کے سلسلے میں بند کرنے کی وجہ بیان کر رہے تھے، بہر حال یہ سلسلہ چلتا رہتا تو اچھا تھا لیکن جب بد مزگی پیدا ہو جائے تو پہلا خط ہے مجید احمد جائی صاحب کا بھائی آپ کا خط ہمیشہ کی طرح مفصل اور بہترین ہے خیالات ارفع و اعلیٰ ہیں میری کہانی کو اتنی پزیرائی

دینے کا بہت شکریہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی میرے اندر لکھنے کی جوت جگائے ہوئے ہے میرا موبائل کسی شریف آدمی نے دوران سفر نکال لیا تھا وہ سم میں نے بند کروادی ہے میرا نیا نمبر (سب قارئین کے لیے) 0313-8807945 ہے مجھے امید ہے جو لوگ میرے ساتھ رابطے میں تھے ان کی پریشانی دور ہوگئی ہوگی صائمہ نور بہن واقعی آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ اردو ادب کے نامور نام اب ہم میں نہیں رہے۔ ان کا خلا پر کرنا بہت مشکل ہے میرا خط یعنی تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ میری کہانی سب سے پہلے پڑھنے اور اسے سب سے اچھی تحریر کہنے پر بہت بہت شکریہ، مہربانی آپ کا تبصرہ بھی عمدہ ہے، شبیہہ مظہر رانجھا آپ کا اور میرا قلمی ساتھ آداب عرض سے ہے وہاں بھی آپ لکھتی تھیں اور کمال لکھتی تھیں بہر حال اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری تحریریں آپ کو اچھی لگتی ہیں جس کے لیے شکریہ، عمر فاروق ارشد بھائی آپ بھی میری طرح حساس دل رکھتے ہیں آپ کے ریاض حسین قمر بھائی کے متعلق الفاظ سونے میں تو لنے کے قابل ہیں خدا آپ کو خوش رکھے اور دعائے مغفرت کروانے کا اجر دے، آمین۔ پرنس افضل شاہین بھائی آپ کا سرورق پر شعر خوب صورت اور حسب حال ہے، میری کہانی اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ذوق آگہی میں بھی آپ کو میرا انتخاب پسند آیا جس کے لیے مہربانی عبدالجبار رومی انصاری آپ کا تبصرہ بھی بمع قطعہ خوب ہے آپ نے میری کہانی کو غور اور دلچسپی سے پڑھا جو آپ کے ادبی ذوق کو ظاہر کرتی ہے رہی بات بر کتے سے بیان دلوانے کی تو اس بابت عرض ہے کہ توفیق نے ایک شریف عورت کو نہ صرف پریشان کیا تھا بلکہ اسے بدنام بھی کرادیا تھا اس لیے یہ ضروری تھا بہر حال ایسے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ عدالت سے زیادہ سے زیادہ سزا پا سکیں۔ عبدالغفار عابد آپ نے میرا مان رکھتے ہوئے محفل میں حاضری دی جس کے لیے ممنون و مشکور ہوں محمد رفاقت بھائی آپ کا تبصرہ بھی بہترین ہے میری کہانی پراسرار پیکٹ آپ کو بھی پسند آئی جس کے لیے شکریہ اور نوازش آپ کی اگلی کہانی کا انتظار رہے گا ریاض حسین قمر بھائی شکر ہے آپ نے حالات کا ادراک کرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے جو خلا آپ کی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے وہ بے شک کبھی بھی پورا نہیں ہوگا میں ان شاء اللہ مرحومہ کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کا انتظام کرتا رہوں گا خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ ایم حسن نظامی آپ کا تبصرہ خوب ہے لفظوں کی جادوگری سے محفل لوٹ لی ہے میری پذیرائی کرنے پر بہت مہربانی واقعی ہماری زندگی برف کی مانند ہے جو لمحہ لمحہ پگھل رہی ہے اور ہمیں آخرت کے لیے کچھ کرنا چاہیے ورنہ شاید ہمارے پاس وقت نہ رہے جو بند مٹھی میں ریت کی مانند آہستہ آہستہ سرک رہا ہے اقرا پڑھ کر بے اختیار طاہر قریشی صاحب کے لیے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں اب بات ہو جائے کہانیوں کی مہتاب خان کی جنون کے کیا کہنے ایک اچھی تحریر پڑھنے کو ملی ہم سفر یاسین صدیق کی ایک سبق آموز تحریر ہے کاش عذرا پہلے سمجھ جاتی تو یوں پچھتاوے اس کا مقدر نہ بنتے ایک سو سولہ چاند کی راتیں عشنا کوثر سردار کی بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے قصہ چہار مفرور بھی فلک شیر ملک نے خوب لکھی ہے معصوم مجرم محمد جمیل اختر کی لاجواب تحریر ہے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق بجکم نے ماسٹر رب نواز کے ہاتھوں میں قلم کی بجائے پستول پکڑا دیا اور اس نے وہ کر دیا جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا وہ واقعی معصوم قاتل تھا سخاوت حسین کی کہانی مکافات عمل نے تو رلا دیا واقعی یہ ہر دوسرے گھر کا فسانہ ہے ہر

جوان بیٹے کی کہانی ہے ویل ڈن خلیل جبار ہمیشہ ایک اچھی اور سبق آموز کہانی لے کر آئے ہیں اس باری کہانی سفاک قاتل بھی ایک سبق آموز کہانی ہے نشہ اور انتقام انسان کو اندھا کر دیتا ہے وہ ایسا کام کر گزرتا ہے کہ بعد میں سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا اب اجازت کیونکہ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں اور ابھی اپنی تفتیش کہانی بھی مکمل کرنی ہے۔

جاوید احمد صدیقی...... **راولپنڈی۔** محترم بھٹی صاحب السلام علیکم۔ کافی عرصے کے بعد حاضر خدمت ہوں پرچہ تو باقاعدگی سے ملتا رہا اور مطالعہ بھی کرتا رہا مگر چند ناگزیر وجوہات ایسی تھیں کہ حاضر خدمت نہ ہو سکا اب عید سعید بھی ہے روزے امید ہے گرمی کے خوب گزر رہے ہوں گے ہم نے جب سے دین کی روح کو چھوڑ دیا ہے اور مال و دولت کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں سب برکتیں، محبت پیار، احترام اور پروقار قوم کے نام پو بھول گئے ہیں حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا کہ میری امت مال اور اولاد کے پیچھے نہ پڑھ جائے یہ ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں (مفہوم) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پاک آج ہم پر دو سو فیصد پورا اترتا ہے غیر مسلم قومیں تہواروں پر زبردست چیزیں سستی کر دیتی ہیں اور ہم لیموں جیسی چیز 50,60 کے بجائے 360,400 روپے میں بیچ رہے ہوتے ہیں ہم غیر قوموں کے معیار پر مجھے تو اندازہ ہے کہ کم از کم دو سو سال لگیں گے۔ مکافات عمل کے ہزاروں واقعات ہمارے سامنے وقوع پزیر ہو رہے ہیں مگر مجال ہے جو ذرا بھی ہم لوگ سدھر جائیں اور اپنے پہ آئے تو پھر عام دنیا سر پر اٹھا لیتے ہیں ہماری نئی نسل یہی کچھ سیکھ رہی ہے پروفیشنلز تو 90 فیصد باہر چلے جاتے ہیں ایک رپورٹ پڑھی کہ 2015ء کے پہلے چھ ماہ میں 12 ہزار انجینئرز نے باہر کا رخ کیا اور وہیں سیٹ ہو گئے اور یہی صاحب ہے کہ بڑے بڑے منصوبوں کے لیے ایسے انجینئرز، دوسرے پروفیشنلز نہیں مل رہے اور سی پیک جیسے منصوبوں پر 80 فیصد ایسے ماہر لوگ چین اپنے ہی ملک س لا رہا ہے۔ خیر یہ تو ہماری رام کہانی چلتی رہے گی ٹائٹل بے انتہا اچھا ہے منفرد اور پرکشش مشتاق احمد قریشی صاحب کا تبصرہ بھی گہری سوچ دیتا ہے گفتگو میں حرام حلال کے بارے میں حدیث شریف، کاش ہم لوگوں کے کان کیا دلوں کو کھول دے آمین، انعام بند کرنے کی مضبوط صاحب بتا دی گئی ہے اور تفسیر عباس بابر کی بھی کہانی زبردست چلے گی اور ہاں مرشد کا شدت سے انتظار رہے گا مجید احمد جائی کا تبصرہ خوب صورت تھا اور تمام اچھے لکھنے والوں کی وفات سے بھی واقفیت ہوئی جزاک اللہ، ریاض بٹ صاحب جناب کہانی ہر ماہ پڑھ لیتا ہوں زبردست خوب اللہ کرے زور قلم اور زیادہ عمر فاروق کا پورا تبصرہ چشم کشا تھا، باقی تمام تبصرے خوب تھے ہاں ریاض حسین قمر کی خدمت میں معافی کے ساتھ کہ فوری تعزیت نہ کر سکا عظیم اور جانکسل حادثہ، اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، ہزاروں دعائیں کہانیوں میں جنون اول نمبر کی زبردست داستان، ہم سفر میں یاسین صدیقی نے معاشرے کی بڑی ہی دکھتی رگ چھیڑ دی اور انجام کار زندگی بھر کا پچھتاوا مقدر بن گیا ہاں یہ قصہ چہار مفرور تو زبردست مزہ دے گیا واہ فلک شیر زبردست استاد رب نواز کا کردار ہمارے معاشرے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ آخر اس معاشرے کا کیا

بنے گا، دردناک، اذیت ناک، نصیحت آموز کہانی لکھنے پر جمیل اختر کو مبارک باد اسی طرح مکافات عمل تقریباً اکثر گھروں کی آپ بیتی ہے کاش ہم وقت جانے سے پہلے سمجھ جائیں سخاوت حسین کی خوب صورت مشرقی کہانی خلیل جبار پھر سفاک قاتل خوب صورت انداز میں لکھی کہانی لائے مبارک ہو ہاں اس ماہ عارف شیک کی کہانی ''فضل چپراسی'' منفرد نصیحت آموز اور عام ڈگر سے ہٹ کر تھی اور بڑی ہی خوب صورت اور دل چسپ یہ کم پڑھے لکھے لوگ مگر پرامن ہیں آپ کا انتظار رہے گا پتی ورتا واقعی بڑی دلچسپ داستان رہی معاویہ عنبر وٹو صاحب یہ عنبر تو فی میل ہے کیا نام رکھا ہے آپ نے؟ ریاض بٹ کی وفا گزیدہ دلچسپی کے عروج کو چھو رہی ہے اور ساتھ ہی دوسری قسط کا انتظار بھی کب تک بڑی اچھی کہانی رہی اور ادھوری عورت بھی فن پارے تو اب ہمارے لیے فن کا ایک خاص طرز بن گیا ہے زبردست خیال تھا اور اب دس دس کہانیاں ڑھنے کو ملتی ہیں ایک سے ایک بڑھ کر زبردست اور لکھائی کی جاتی، ہاں کچھ کہانیوں میں مچھلی کی دم طرز منٹو کو دیتا گیا ہے صرف ذرا احتیاط سے، ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن زبردست ذوق آ رہی میں میرا اقتباس ''متوازن شخصیت'' شائع کیا شکریہ جناب، ابھی قسط وار اور زرین قمر کی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ تمام احباب مجلس کو دعائیں کہ رسالے کا بہترین اور زبردست ترقی والا مواد بنا کر بڑے بڑے رسالوں میں نمایاں کھڑا کر دیا ہے۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم اقبال بھٹی صاحب مزاج گرامی امید ہے کہ آپ اور آپ کی تمام ٹیم خیر خیریت سے ہوں گی اللہ سے دعا گو ہوں کہ آپ سب جب تک دم میں باقی ہے خوش و خرم رہیں اور صحت اور تندرستی کے ساتھ زندگی گزرے۔ اس دفعہ رسالہ وقت پر مل گیا بہت خوشی ہوئی اور پڑھنے کے لیے بھی وقت ملا اور خط بھی آسانی سے لکھا گیا اس دفعہ نئے افق کو مکمل پڑھ کر خط ارسال کر رہا ہوں گفتگو میں ریاض بٹ، شبیہہ مظہر رانجھا، صائمہ نور، مجید احمد جائی کے خط پڑھنے کے قابل تھے تفصیل سے لکھے خط رسالے کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ وطن کی مٹی کا قرض بھی اتار رہے ہیں، شبیہہ مظہر رانجھا نے میری کہانی کی تعریف کی شکریہ۔ ریاض بٹ، ایم حسن نظامی، پرنس افضل شاہین آپ نے میری کہانی کو پسند کیا آپ سب کا بہت بہت شکریہ پرنس افضل شاہین شاید وہ ہیں جو کافی عرصہ پہلے جنگ اخبار میں ''بچوں کے قصہ'' میں لکھتے تھے اس دفعہ بھی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں جن میں جنون، ہم سفر، مکافات عمل، معصوم مجرم، سرفروش، پتی ورتا، کب تک، فضل چپراسی، وفا گزیدہ، ادھوری عورت، بیس سال بعد شاندار کہانیاں تھیں، وفا گزیدہ میں بٹ صاحب پڑھ سب سے بازی لے گئے میری نظر میں بہت ہی اچھی کہانی ریاض بٹ صاحب نے پیش کی ہے میری طرف سے مبارک باد قبول ہو، اسلم آزاد اور زرین قمر بھی کسی سے کم نہیں ہیں، میری طرف سے آپ کو بھی بہت بہت مبارک قبول ہو ایم اے راحت صاحب کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا اللہ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیر بانٹتے ہوں گے اور خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں، نعمتوں کے صدقے ہمیشہ خوش حال اور ہنستا مسکراتا رکھے، دین اسلام کا پکا سچا پیروکار بنائے اور اُس صراط والے راستے پر چلائے جس پر، اپنے نیک بندوں

کوانعام واکرام سے نوازتا ہے۔آمین ثم آمین !یہ سطور لکھ رہا ہوں تو ماہ صیام اپنی رحمتیں برسا رہا ہے ۔گرمی کے روزوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔اللہ تعالیٰ جسے چاہے توفیق دے۔بے شک بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے ماہ صیام پایا اور روزے رکھے۔نئے اُفق ماہ جون جلد 41،شمارہ نمبر 5 میرے ہاتھوں میں ہے۔سرورق عید سعید کی مبارک باد دے رہا ہے۔آنکھوں کو خیرہ کرتے سرورق پر جل پری بڑی لی بڑے انہماک سے اپنے مشغلے میں محو ہے۔بنانے والے نے بہت پیارا اور دلکش سرورق بنایا ہے۔ماہ جولائی کا نئے اُفق جب ہاتھوں میں آئے گا تو عید سعید کی آمد آمد ہوگی۔میں بحثیت قاری ،لکھاری ،اپنے تمام دوستوں اور اہل اسلام کو دل سے عید سعید کی مبارک باد دیتا ہوں۔ہمیں اپنے اردگرد نظر رکھنی ہے کہ کہیں پڑوس میں کسی کو ہماری ضرورت تو نہیں۔کوئی ہمارا منتظر تو نہیں۔اپنی خوشیوں میں رشتہ داروں ،ہمسائیوں ،غریبوں ،مسکینوں ،یتیموں کو ضرور شامل کر لینا چاہیے کیونکہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور غم بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے ہمیں ایسے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔آمین !دستک میں مشتاق احمد قریشی پوچھ رہے ہیں ''کیا وزیراعظم واقعی بچ گئے'' یہ اُلجھا دینے والا سوال ہے جس پر ہر ادنیٰ و اعلیٰ بندہ تبصرہ کرتا رہتا ہے۔ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انصاف کہاں سے ملتا ہے۔انصاف کے چرچے تو بہت سنے ہیں لیکن اپنی زندگی میں انصاف کو انصاف کرتے نہیں دیکھا۔کیا ہی اچھا ہو حضرت عمر فاروقؓ جیسا دور حکومت پھر سے آجائے۔عدلیہ ،عدل کرنے لگ جائے۔گفتگو میں اقبال بھائی ذخیرہ اندوزی کو کوس رہے ہیں ،کتنی تعجب کی بات ہے اب ہم مثالیں بھی غیر مسلموں کی دیتے ہیں ،کیا مسلمان اپنا نہیں رہا ،کم از کم اپنے لیے تو انصاف کرلے ۔پہلا خط میرا لگانے پر شکریہ ،گفتگو کی محفل سے کچھ پرانے ساتھی غائب ہیں ،کہاں ہو جی؟ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ریاض بٹ صاحب تفتیشی کہانیوں کے ساتھ ساتھ آپ کے خطوط بھی تفتیشی ہوتے جارہے ہیں ،جاز کا نمبر کیوں بند رکھا ہوا ہے۔صائمہ نور ،ریاض بٹ ،عمر فاروق ارشد ،پرنس افضل شاہین ،عبدالجبار رومی انصاری ،عبدالغفار عابد ،محمد رفاقت ،ریاض حسین قمر ،ایم حسن نظامی کے خطوط شامل حال ہوکر محفل کو رونق بخش رہے ہیں۔احسان سحر ،ناز ذشے ،کہاں ہیں؟ اقراء میں ''السلام'' پناہ دینے والا ،پڑھا ،اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔کہانیوں میں ہم سفر طویل غیر حاضری کے بعد یاسین صدیق جلوہ گر ہوئے ،معصوم مجرم ،جمیل اختر کو خوش آمدید کہتے ہیں۔فضل چپراسی ،پتی ورتا ،تفتیشی کہانی ،وفا گزیدہ ،بہت خوب تھی۔اب تو عادت سی ہوگئی ہے ،تفتیشی کہانی کا بے تابی سے انتظار ہوتا ہے ۔سرفروش ،پہلا حصہ خوب رہا۔مکافات عمل ،سفاک قاتل بہترین کہانیاں ہیں۔اسی طرح فن پارے میں برگد کا درخت ،خالی خانے ،بے وفا ،سیاہ چہرہ ،میری چاہت گلابوں سی ،غلطی محبت ،ازلی تضاد ،فہد ،کائی بہت اچھی رہیں۔''بھوک'' دستگیر شہزاد کی کہانی ،دوبارہ نئے افق کے صفحات پر شائع کی گئی ۔اس کی وجہ نہ جان سکا ،کوئی تو وجہ رہی ہوگی۔بہتر ہوتا اس کی جگہ کسی نئی کہانی کو جگہ دی جاتی۔ذوق آگہی ،خوش بوئے سخن خوب رہے اور زرین قمر نے ''بیس سال بعد'' لکھ کر کمال کر دیا۔زرین قمر صاحبہ آپ کی محبتوں کے مقروض ہیں۔سدا سکھی سلامت رہیں آمین!

صائمہ نور...... ملتان۔ آداب! رمضان المبارک ایک بار پھر سے بہاریں لوٹانے آن پہنچا ہے۔ اُمید ہے آپ اِس کی مہمان نوازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کتنا سوہنا مہمان ہمارے نصیب میں کیا ہے۔ مہمان بھی ایسا جو ہماری بخشش کا سبب بن جائے۔ سبحان اللہ! ماہ جون کا نئے اُفق ملا تو حیران رہ گئی، عید سعید، جب کہ رمضان بھی ابھی نہیں آیا تھا البتہ جب جولائی کا پرچہ ہمارے دسترس میں ہوگا تب عید سعید اپنی تمام تر خوشیوں کے ساتھ ہر گھر کو رونق بخشنے کے لئے بے تاب ہوگی۔ اللہ کرم فرمائے، آنے والی عید سعید سبھی کے لئے خوشیوں بھری ہو۔ آمین۔ تمام اہل وطن ،اہل ایمان ،اہل مسلم کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ مسلمان کے لئے تو ہر دن، ہر رات عید ہوتی ہے اگر وہ خود کو دین اسلام کا صحیح پیروکار بنالے۔ حالت یہ ہے کہ اِدھر گرمی زوروں پر ہے اُدھر لوڈشیڈنگ نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بازاروں میں ذخیرہ اندوزی ایسی کہ سال بھر اُنہوں نے اِسی کمائی پر پیٹ بھرنا ہے۔ توبہ۔۔ توبہ۔ آج کا مسلمان کیا سے کیا سوچ رہا ہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے چکر میں دوسروں کے بچوں کا پیٹ کاٹ رہا ہے۔ یہ بھی تو انسانیت کا قتل ہے۔ پھر سزا کیوں نہیں؟ کیا کسی بڑے عذاب کے اُمیدوار ہیں؟ رحیم مولا! تو ہی کرم فرما کیونکہ تو ہی تو رحیم ہے، سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا۔ سرورق بہت جاندار ہے پھر بھی مناسب ہوتا اگر عید کے حوالے سے، یا رمضان المبارک کو سامنے رکھتے ہوئے سرورق تیار کیا جاتا۔ بحرحال نئے اُفق نے اپنی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی صاحب نے سیاسی کالم لکھ کر سوال کر دیا ہے کہ کیا واقعی وزیراعظم بچ نکلے گا، آثار سامنے ہیں وزیراعظم تو سزا پائے نہ پائے عوام کی سزا روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بس حق اور سچ کا بول بالا ہو آمین۔ گفتگو کا آغاز حدیث مبارکہ سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ صدارت مجید احمد جائی کر رہے تھے اور ہمیں دوسرے نمبر پر ٹانک دیا گیا ہے۔ بہت شکریہ ریاض بٹ، آپ نے بہن کہا، خلوص بھرا سلام بھی پیش کیا۔ آنکھیں نم سی ہوگئیں۔ بس یہ مان ٹوٹنے نہ دینا۔ وفا گزیدہ، بہت پیاری کہانی ہے۔ پرنس افضل شاہین، شکریہ، عبدالجبار رومی انصاری، مشکور ہوں محمد رفاقت بھائی، آپ کا خط مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ مدلل ہوتا ہے، ریاض حسین قمر، میں تو ابھی تک بھابھی جان کی وفات کے غم میں ڈوبی ہوئی ہوں، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے، آمین! ایم حسن نظامی بہت شکریہ۔ سبھی خطوط پیارے اور شیریں بھرے تھے۔ اقراء، انکل طاہر قریشی نے تحقیقی اور مدلل لکھا۔ کہانیوں میں ''جنون'' نے دشمن کو دوست بنا ہی لیا۔ ہم سفر بھی اپنے ہم سفر کے قصدے پڑھ رہی تھی، کیا ہم سفر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اچھا اور نیک ہم سفر دے آمین۔ معصوم مجرم، ہلا دینے والی تحریر ہے۔ سفاک قاتل، مکافات عمل، پتی ورتا، اور تفتیشی کہانی خوب رہی۔ فن پارے بھی فن دکھاتے نظر آئے اور ذوق آگہی نے خوب آگہی دی، خوش بوئے سخن نے گرمی میں بھی معطر معطر خوشبو پھیلا دی۔ بیس سال بعد نے ہمیں اپنا بچپنا یاد دلا دیا۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب اقبال بھٹی صاحب اور ان کے رفقا السلام وعلیکم امید قوی ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے اور اپنے اپنے میں مصروف ومگن ہوں

گے۔ سالانہ خریدار بننے کے بعد بے فکری ہوگئی اور جریدہ بروقت ملنا شروع ہوگیا ماہ جون کا نئے افق بائیس مئی کو ہی میرے ہاتھوں میں آ گیا اس بار ٹائٹل میں سادگی مگر خوب صورتی ہے ٹائٹل پر ہی دلوں میں امنگیں جگانے والا لفظ عید سعید موجود ہے دستک میں لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس معاملے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ بڑا گمبھیر ہے اب دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ دراصل ہم من حیث القوم جھوٹ بولنے کے رسیا اور عادی ہوچکے ہیں معاملہ کوئی بھی ہو ہم سچ کو جھوٹ کے دبیز پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے ہمیں سیکڑوں بار جھوٹ بولنا پڑتا ہے پھر بھی جھوٹ چھپ نہیں سکتا رب کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں جھوٹ بولنے کی عادت سے محفوظ فرمائے، آمین۔ گفتگو کا آغاز آپ نے بڑی پیاری حدیث سے فرمایا اپنی بات میں آپ نے انعامات کا سلسلہ بند ہونے کا ذکر فرمایا اس سے صاف لگتا ہے کہ قارئین نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے، کیا کسی ایک قاری نے اور خمیازہ سب قارئین بھگتتے رہیں گے مجید احمد جائی صاحب آپ کا خط ایک بہترین تبصرہ ہے زوجہ محترمہ کے بارے میں آپ نے جو لکھا میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں، محترمہ صائمہ نور صاحبہ آپ نے بھی اپنے دلی جذبات کا اظہار خوب صورت انداز میں فرمایا شکریہ، پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب آپ نے جس طرح میرے غم میں شرکت فرمائی ہے یہ میرے لیے بڑے حوصلے اور ڈھارس کی بات ثابت ہوگی مشیت ایزدی کے آگے ہر انسان مجبور محض ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش اور سلامت رکھے آمین اس بار آپ کی تفتیشی کہانی وفا گزیدہ نے بہت مزہ دیا اس بار بھی میں نے اسے سب سے پہلے پڑھا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ بہت ہی پیارے دوست عمر فاروق ارشد صاحب آپ کا خط یقیناً بالیقین خلوص بے پایاں کا مظہر ہے آپ نے جس طرح اپنے دکھ اور دلی جذبات کا اظہار فرمایا میں اس پر آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے آپ نے جس طرح اپنی مسجد میں جس طرح دعائے مغفرت کا اہتمام فرمایا رب کریم اسے مرحومہ مغفورہ کے لیے بخشش کا سبب بنائے آمین اور رب لم یزل اس سے آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا فرمائے، آمین۔ عبدالجبار رومی صاحب آپ کی تعریف کے لیے میں سپاس گزار ہوں عبدالغفار عابد صاحب آپ میرے دکھ میں شریک ہوئے اللہ اس پر آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے آمین، پیارے محمد رفاقت بھائی خلوص دل سے کی گئی تعزیت کے لیے بہت بہت شکریہ، رب کریم آپ کی دعا کو قبول فرمائے آمین، جناب مرغوب ملی راحت صاحب کے انتقال پر ملال کا پڑھ کر دلی رنج ہوا ان کے جانے سے کہانی نویسی کا ایک باب ختم ہوگیا خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے جس طرح رب ذوالجلال کے اسم پاک اسلام کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ نہایت خوب صورت ہے اور ایمان والوں کے لیے بڑی خوشخبری رب کائنات انہیں اس پر اجر عظیم سے نوازے آمین۔ جنون مہتاب خان کی ایک دھما کہ خیز تحریر تھی جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے کہانی پر ان کی گرفت بڑی مضبوط رہی، کشمیر کے پس منظر لکھی جانے والی کہانی ''کب تک'' غاصب بھارتی کتوں کے اس روپ کو ظاہر کرتی ہے جسے ساری دنیا ابھی تک دیکھ پا نہیں رہی یہ وہ المیہ ہے جسے

عالمی امن کے ٹھیکیدار ادارے اور ہیومن رائٹس کی نام نہاد تنظیمیں نہ دیکھ رہی ہیں نا سمجھ پا رہی ہیں اور ہم مسلمان ان کی خبیث گود کو اپنی جائے پناہ سمجھ رہے ہیں یہ نام نہاد قوتیں کلبھوشن جیسے سیکڑوں انسانوں کے قاتل کو تو بچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کو تیار ہیں مگر کشمیر میں معصوم کشمیری عورتوں کی عصمت دری کرنے والے بھیڑیوں کو سزا دینے کے بارے میں نہیں سوچتیں عالمی امن اور انصاف کی دھجیاں بکھیرنے والا ادارہ اقوام متحدہ سابقہ لیگ آپ نیشن کی طرح بری طرح ناکام ہو چکا ہے رب کریم مظلوم لوگوں کو اس ادارے کے ظلم وستم سے محفوظ فرمائے، آمین اور بڑی کافر طاقتوں کی داشتہ اس تنظیم کو اپنے منطقی انجام تک پہنچائے، آمین ثم آمین۔ خوش بوئے سخن میں انتخاب خوب ہے، خاص کر محمد قمر شہزاد آسی کامران مغل میثم علی آغا اور رمضان نجمی کا کلام پسند آیا، ذوق آگہی کے گلدستہ میں سباس گل صاحب نے ایسے ایسے پھول سجائے ہیں کہ زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ نکل گیا مجموعی طور پر جون کا شمارہ خاص شمارہ لگ رہا ہے جس کے لیے آپ لائق صد مبارک باد ہیں۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ سلام عقیدت امید ہے آپ اور افقی قبیلہ کے سبھی احباب بخیریت ہوں گے جون کا پرچہ اپنی تمام تر روایات کے ساتھ عروج کی گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں جلوہ گر ہوا اس وقت دھوپ بھی افقی بلندیوں کو عبور کر رہی تھی۔ دستک سے شروع کرتے ہوئے زرین قمر کے ''بیس سال'' تک پورا پرچہ گرم ترین پایا یا پھر یوں کہہ لیں کہ ہمارے جذبات واحساسات پر موسم گرما حاوی رہا تبھی پرچہ گرم نظر نواز ہوا۔ گفتگو کے حوالے سے سبھی ساتھی گھر کے دستر خوان پہ اپنی خوش گپیوں میں مصروف محسوس ہوئے تفسیر عباس اور ساحر جمیل سید کو اپنے پرچے میں ویلکم کرتا ہوں امید ہے اب وہ ہمارا ساتھ نبھائیں گے۔ صائمہ نور، ریاض بٹ، عبدالرؤف، یونس افضل شاہین، عبدالجبار رومی، عبدالغفار عابد، محمد رفاقت اور ریاض حسین قمر سبھی اپنے اچھے عمدہ اور معیاری تجزیوں کے ساتھ محفل جان پائے اور ایک دوسرے سے خوب دکھ سکھ شیئر کیے ان کی شیریں اور مٹھاس بھری گفتگو کی روشنی میں پرچہ جگمگا اٹھا۔ طاہر قریشی اقرا میں اپنی ایمان افروز باتوں سے سبھی کو منور فرما رہے تھے ان کی باتیں ایمان افروز تھی جو روح تک اترتی چلی گئیں۔ مہتاب خان کا جنون، یاسین صدیقی کا سفر، عشنا کوثر سردار کی تاریخ ساز سوچ، فلک شیر کے مجرم، محمد جمیل کے معصوم مجرم، سخاوت حسین کا بزرگوں پر تجزیہ خلیل جبار کی عمدہ سوچ، سفاک قاتل، سرفروش اور مرشد دونوں عمدہ تحریروں کا انداز عارف شیخ کا فضل چپراسی، معاویہ عنبر ٹو کا تاریخ ساز تجربہ، ریاض بٹ کی وفا یہ لازوال تحریر، غلام یاسین نوناری کی آزادی کشمیر پر لکھی جانے والی بے مثال تحریر۔ فن پارے، خوش بوئے سخن، مراسلے، آیات اور حدیث نبوی سبھی کالمز پرچے کو چار چاند لگا گئے آپ نے اگلے ماہ تک موثر اور بہترین مواد فراہم کرتے ہوئے اپنی قابلیت کا لوہا منوا دیا بے شک پرچہ معیاری اور منفرد پایا، میری طرف سے سبھی احباب کو عیدالفطر مبارک ہو۔

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور۔

اک ادا ہے حسین کومل لمحات کی

اک ادا ہے پیار میں شامل جذبات کی
کیا سرخیل کیا مچھلی کیا صنف نازک ہے با کمال
اک ادا ہے روحی سب دل محسوسات کی

تمام اہل وطن کو اور پیارے سے نئے افق قارئین کو رمضان المبارک کے ساتھ ساتھ عید سعید کی خوشیاں مبارک ہوں ہ دستک اس دفعہ پانامہ کیس اور وزیراعظم کے گرد ہی بچ رہی تھی اصل بات تو ہے پاکستانی قانون کی اگر اس پر پورا پورا عمل درآمد ہوا تو وہ نہیں بچ پائیں گے باقی اثر ورسوخ کی بنا بڑے بڑے مگر مچھ بھی قانون سے بچتے آئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں عرب کانفرنس میں پاکستان کو قطعی نظر انداز کرنا دنیا کے لیے پاکستانی وزیراعظم کا عہدہ مشکوک ہے تبھی انہوں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ باہر کی دنیا میں قانون بھی کوئی شے ہے یہ تھوڑی ہے کہ اپنے ملک میں نہ مانوں کی رٹ لگانے والے باہر بھی اپنے ملک کا قانون سمجھ کر دوڑ پڑتے ہیں اس طرح تو جمہوریہ پاکستان کا تشخص اجاگر نہیں ہوتا نا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کبھی بھی تاجر کو اپنا بادشاہ نہ بنانا کیونکہ وہ عوام کا نہیں اپنا تجارتی فائدہ زیادہ سوچے گا سو یہی کچھ ہوتا ہے اب الیکشن آنے والے ہیں تو غیرت مند عاوم کو بھی چاہیے کہ اپنے ووٹ اسے دیں جو پاکستانیت کا خیال رکھے کشمیر کو آزاد کروائے اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا ہو۔ گفتگو میں حرام مال کے متعلق خوب صورت حدیث اللہ تعالیٰ تمام مسلمان کو نیک بنائے اور نیک کمائی کی توفیق دے باقی ماہ صیام میں مہنگائی یہ تو ہر سال ہی ہوتی لیکن کون سمجھے حالانکہ غیر تو میں اپنے خاص دنوں میں ہر طرح سے اشیا میں رعایت کر دیتی ہیں، مجید احمد جائی، صائمہ نور، شبیہہ مظہر، عمر فاروق ارشد، عبدالغفار عابد اور ایم حسن نظامی کے تبرے عمدہ رہے باقی ریاض بٹ، پرنس افضل شاہین، محمد رفاقت اور محترم ریاض حسین قمر آپ سب کی حوصلہ افزائی مجھے خوشی سے سرشار کر دیتی ہے، بہت شکریہ اقرا میں اسلام یہ خوب صورت باتیں بہت اچھی تھیں خدا عمل کی توفیق دے معروف قلمکار ایم اے راحت کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ انہیں جنت میں جگہ دے ریاض بٹ کی وفا گزیدہ بہن نے اپنی قربانی دے کر بھائی کو ثوبیہ سے ملایا اور پھر جب خود کے ساتھ برا ہوا تو نسرین نے ہی ثوبیہ کو اغوا بھی کروا دیا عجیب ہی وفا گزیدہ تھی خیر اگلی تحریر کا انتظار ہے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے دوست خواب چھینتے نہیں بلکہ انہیں تعبیر دیتے ہیں عادل اور ساحر شروع میں ایک دوجے سے کھار کھانے تھے اور آخر میں انہیں بہترین دوست بنا دیا انتقام لینے والا کوئی اور ہی نکلا ''جنون'' زبردست کہانی تھی معصوم مجرم آخر کہاں تک صبر و برداشت کرتا آخر اس نے ہتھیار اٹھا لیا لیکن اسے خودکشی نہیں کرنا چاہیے تھی اور ایک استاد کے ساتھ ایسا رویہ افسوس ناک تھا جو بوئے گا وہ کاٹے گا انسان کو جھنجوڑتے خوب صورت لفظوں کی کہانی مکافات عمل زبردست تھی ادھورعورت دنیا کے ظلم وستم سہتی رہی آخر دنیا سے ہی آزادی حاصل کرلی اسلم آزاد کی کہانی غمزدہ کر گئی۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار نئے افق جون کا شمارہ عید سعید نمبر جلد ہی مل گیا اس لیے تبصرہ بھی جلد ہی بھیج رہا ہوں سب سے پہلے تو میری طرف سے نئے افق کے سارے اسٹاف کو اور اس کے تمام پڑھنے والوں کو دلی عید مبارک قبول ہو دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کو ایسی ہزاروں

خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔ سرورق کی چنچل حسینہ زلفیں بکھیرے بہت ہی اچھی لگ رہی تھی میں تو حسینہ کو کہوں گا، سر سے گرتی ہیں تو شانوں پر بکھر جاتی ہیں تم نے زلفوں کو بڑا سر پر چڑھا رکھا ہے، طاہر قریشی اقرا میں السلام پر اللہ کے بابرکت نام کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے، دستک میں مشتاق انکل پانامہ کیس پر اور اس کے فیصلے پر روشنی ڈال رہے تھے واقعی لگتا ہے وزیراعظم کیخلاف پکا فیصلہ آنے والا ہے تاکہ آئندہ کوئی بھی سیاستدان وزیراعظم بنے تو وہ صادق اور امین ہو۔ گفتگو میں آپ ہم مسلمانوں کا ضمیر جھنجوڑ رہے تھے لیکن ہمیں لگتا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنی اصلاح نہیں کرنی، کیا ہم سے مسیحی لوگ اچھے نہیں ہیں جو کہ کرسمس پر عوام کو خصوصی ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں اور ہم اپنے متبرک مہینے رمضان میں اپنی ہی عوام کو لوٹتے ہیں ہم اللہ کے گھر جا کر اپنے خدا کو کیا منہ دکھائیں گے مجید احمد جائی، صائمہ نور، ریاض بٹ، عبدالجبار رومی، عبدالغفار عابد، ریاض حسین قمر، ایم حسن نظامی کے خطوط جاندار تھے۔ کہانیوں میں وفا گزیدہ، مکافات عمل، جنون، سفاک قاتل، کب تک، ادھوری عورت پسند آئیں۔ کہانی بیس سال بعد نے ٹاپ کیا ذوق آگہی میں عائشہ اعوان، جاوید احمد صدیقی، علی اصغر انصاری، ریاض بٹ، خوش بوئے سخن میں میثم علی آغا، آبرو نبیلہ خان، نسیم سکینہ صدف، عبدالجبار رومی، عنبرین اختر کے کلام اچھے تھے آپ سے گزارش ہے کہ نئے سلسلے شروع کریں جن میں ایک تو بیاض کے نام سے ہو جس میں رائٹرز کے ارسال کردہ اشعار شائع ہوں اور دوسرا سلسلہ سوال و جواب کا ہو جس میں ہم رائٹرز آپ سے دلچسپ سوال کریں اور آپ ان کے جواب دلچسپ پیرائے میں دیں امید ہے تمام پڑھنے والے میری اس رائے سے اتفاق کریں گے پلیز خطوط پر انعامات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں اب ایک دو لوگوں کی سزا ہم سب کو تو نہ دیں ناں، آپ انعامی خط کا منی آرڈر ارسال کریں تو اس کی وصولی کی رسید سنبھال کر رکھا کریں تاکہ کوئی کہے کہ میرا انعام مجھے نہیں ملا تو آپ اس منی آرڈر کی رسید اسے ارسال کر دیا تاکہ اسے تسلی ہو، خدا حافظ۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب ایک ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

المومن

(امن وامان دینے والا)

المومن۔اس کا مادہ امن ہے اور امن کے معنی خوف سے محفوظ ہونا اور مومن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ مومن یوں ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔

المومن۔اسم فاعل واحد مذکر مرفوع معرفہ ایمان کا مصدر' امن دینے والا' سکون واطمینان بخشنے والی ذات' اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وہ ذاتِ عالی ہے جو ہر خوف سے محفوظ کر کے امن بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مومن اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کو امن دیتا ہے۔اس کی تمام مخلوق اس خوف واندیشے سے قطعی محفوظ ہے اور اہلِ ایمان کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کسی بھی مخلوق پر کسی بھی طرح ظلم وزیادتی نہیں کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ صفت مومن اس کی ذات کی یہ خوبی واضح کرتی ہے کہ وہ ایسی ذاتِ عالی ہے جو نہ تو ظالم ہے نہ کسی طرح اپنی مخلوق پر ظلم کرتی ہے' نہ ہی ان کا کسی طرح حق مارتی ہے' نہ ان کا اجر کسی طرح ضائع کرتی ہے اور جو وعدے وہ اپنی خلق سے کرتی ہے وہ سچے ہوتے ہیں ان وعدوں کی خلاف ورزی نہیں ہوتی' المومن کا مفہوم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ساری کائنات کی ہر ہر چیز کو امن دیتی ہے۔

اہلِ ایمان اور متقی بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے مومن کہہ کر پکارا ہے۔جس کے معنی ایمان رکھنے والے کے ہیں' یقین اور تصدیق کرنے والے کے ہیں۔اس طرح ایمان کے معنی ہوئے امن وسلامتی' اس صفتِ الٰہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے' مومن جو اللہ کے دین پر یقین کرتا ہے اور اللہ کا دینِ اسلام جو ایک تہذیب ہے بھائی چارے امن وسلامتی کی اس طرح مومن ہو کر انسان اللہ کی صفات میں سے ایک صفت کو اپنا لیتا ہے۔اور اس پر مومن ہونے کی حیثیت سے

لازم آتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظم وضبط امن وامان کی ذمہ داری ادا کرے' یوں وہ اپنے مومن ہونے کا فرض ادا کرتا ہے۔

ترجمہ:۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان ملاپ کرادیا کرو' اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (الحجرات۔۱۰)

تفسیر:۔ مومن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں کیونکہ ان سب کی اصل ایمان ہے اس لئے ان کے ایمان کا تقاضہ ہے کہ وہ آپس میں نہ لڑیں بلکہ وہ ایک دوسرے کے دست بازو' ہمدرد غم گسار' مونس وخیر خواہ بن کر رہیں۔ دینِ اسلام تو مومنین (مسلمانوں) کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتا ہے' اسلام ایک تہذیب ہے شائستگی کا نظام ہے جو معاشرے میں بھائی چارہ میل ومحبت کو فروغ دیتا ہے اور ایک عالم گیر برادری قائم کرتا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سکھ چین پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں اسلام اپنے ماننے والوں' ایمان والے مومنین کے ذریعے ایک پرامن پرسکون معاشرہ تشکیل دیتا ہے اور ہر قسم کے داخلی فتنہ وفساد کو روکتا ہے۔ اس لئے ہی آیت میں ارشاد ہے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں' اگر کسی بھی وجہ سے کسی مومن بھائی کا دوسرے مومن بھائی سے اختلاف یا کوئی جھگڑا ہو جائے تو ان میں ملاپ کرادو یعنی فتنہ وفساد ختم کر کے امن وامان کی فضاء قائم کردو اور اللہ کی ذاتِ عالی جو بڑی رحیم وکریم ہے اس سے ڈرتے رہو اور احکامِ الٰہی پر عمل پیرا رہو۔

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''گروہِ اہلِ ایمان کے ساتھ مومن کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے سر کے ساتھ جسم کا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے۔ (مسند احمد)

جو شخص کسی خوف کے وقت اس صفتِ الٰہی ''المومن'' کا ورد' ۶۳ مرتبہ کرے گا ان شاء اللہ وہ خوف اور نقصان سے محفوظ رہے گا۔



میں اور میرا تخلیقی عمل

دستگیر شہزاد

ہم وقفے وقفے سے نئے افق کے ابتدائی صفحات اور اپنے کسی لکھنے والے کا تعارف دیتے تھے، ہیں اسے آپ انٹرویو بھی کہہ سکتے ہیں اس کا مقصد لکھنے والے کا اپنے پڑھنے والے سے تعارف ہوتا ہے گزشتہ دنوں ہم نے اپنے پرانے قلمکار دستگیر شہزاد سے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے انٹرویو سے انکار کرتے ہوئے اپنا تعارف خود کرانے کی خواہش کا اظہار کیا انہوں نے لکھنا کیوں اور کیسے شروع کیا سوان کا تعارف انہی کی زبانی حاضر ہے۔

ذہن میں کسی نئے خیال کا یوں تیر جانا جیسے فضا میں برف کے گالے اڑتے ہیں لفظوں کا آپ سے آپ قلم کی نوک سے کاغذ تک اترتے جانا جیسے پھولوں پر شبنم بچھتی ہے یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیونکر ہے؟ کہاں سے آتا ہے کوئی خیال اور اس خیال کو لفظوں میں خوش بو کی طرح بسانے کے لیے ہماری انگلیوں میں وہ جادوئی چھڑی کہاں سے آجاتی ہے جو سفید کاغذ پر کہانیوں کے گل بوٹے کاڑھتی ہے کسی اجاڑ باغ میں پھدکتے ہوئے مینڈکوں کو سنڈریلا کی سنہری بگھی میں چھ مشکی گھوڑوں کا روپ دے دیتی ہے چڑیوں، طوطوں اور بگلوں سے باتیں کراتی ہے اور جیتی جاگتی شہزادیاں اور شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں لفظوں کی یہ کنچن مالا انگلیاں کیسے پروتی ہیں؟ آخر کیسے پروتی ہیں تخلیق کے اس عمل کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری نگاہوں میں وہ لمحہ گھوم جاتا ہے جب میرے والد نے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر فیصل آبادی مٹی سے لپی ہوئی تختی پر فارسی کا ایک جملہ لکھوایا تھا عرق گلاب میں کھرل کیا ہوا زعفران سفید چینی کی فنجان میں تھا میں اس لمحے کی سنسنی کو آج تک نہیں بھلا سکا ہوں میں نے لرزتی انگلیوں سے سرکنڈے کا قلم زعفرانی روشنائی میں ڈبویا تھا اور لالہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا تھا میرے ہاتھ میں لالا کے ہاتھ کی جنبش کے ساتھ حضرت شرف الدین یحییٰ منیر کے ایک خط کا القاب برادرم شمس الدین وزین الدین اور دوسری سطر میں (قلم گوید کہ منشاہ جہانم) لکھا تھا فارسی مجھے آج بھی نہیں آتی کہ اس وقت میں بھلا کیا جانتا لالا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ مصرع قلم کی بادشاہت کا اعلان ہے شاید اسی لمحے سے میں نے قلم کی قلمرو میں قدم رکھا اور اس کی رعیت بن گیا یہ بیس سال پہلے کا قصہ ہے اس زمانے میں لڑکوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر عمر بھر رزق کا خرچہ چلائیں گے اور لڑکیاں زیادہ سے زیادہ دھوبی کا حساب لکھیں گی ہماری دنیا ابھی جدید نہیں ہوئی تھی لالا نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ جو مجھ سے مثنوی مولانا روم کے شیخ سعدی کے اشعار اور حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات نقل کرنے کی مشق کرا رہے ہیں میں ان کی ساری محنت پر پانی پھیر دوں گا اور نو برس کی عمر میں ایک صدی

رومانی کہانی لکھ ڈالوں گا مجھے اپنی پہلی تحریر پھاڑ کر پھینکنا پڑی اور اس کے بہت دنوں میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی لکھنے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا لالا مجھے اپنا مرتب کردہ نصاب پڑھا رہے تھے اور اس میں کہانی لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی یوں بھی ان کی خواہش تھی کہ میں وقیع اور تحقیقی مضامین لکھا کروں اپنے دوست ریاض حسین خستہ اور اپنے شناسا انور محمود خالد کی طرح وہ مجھے نقاد یا بھاری بھر کم مصنف دیکھنے کے خواہش مند تھے اپنے عزیز دوست رام ریاض کی کہانیوں کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے جو انہوں نے پریم پجاری کے نام سے لکھی تھی میرے مضامین لکھنے کی اصل مشق اسکول میں ہوئی اس مشق کا آغاز استاد محترم نیک محمد نے آٹھویں میں کرایا جو اس وقت مجھے اردو پڑھاتے تھے نویں اور دسویں میں بھی ہم سے ہر ہفتے ایک مضمون لکھوایا جاتا تھا غرض میرے لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ اسکول سے شروع ہوا میری پہلی تحریر ماہنامہ تعلیم و تربیت میں شائع ہوئی اور میں نے پہلا افسانہ 2007ء میں لکھا جو سنہرے دل کے عنوان سے فنون میں شائع ہوا تخلیقی عمل میرے اندر کسی طرح جنم لیتا ہے یا نمو پذیر ہوتا ہے لکھنا ایک فن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہنر بھی ہے اور ہنر میں کمال دکھانے کا معاملہ قصہ حاتم طائی جیسا ہے کہ جس میں کچھ شرطیں پوری کیے بغیر گوہر مراد ہاتھ نہیں آتا کچھ لکھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس بات کو طے کریں کہ اپنا اظہار ہم کس طور کرنا چاہتے ہیں۔ ہم افسانہ، ناول، ڈرامہ، انشائیہ یا فکاہیہ کیا لکھنا چاہتے ہیں ہم جب اپنے اظہار کا میڈیم طے کر لیتے ہیں تو پھر اسی حوالے سے وہ خیال ذہن میں جنم لیتا ہے جس پر ہماری تخلیقی تحریر کی بنیاد رکھی جائے گی کبھی اچانک کوئی خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپک جاتا ہے اور اس کی روشنی میں ہم اپنی کہانی بنتے ہیں اور کبھی اس بارے میں ہمیں غور کرنا پڑتا ہے ناول کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اچانک ہمیں خیال آجائے اور ہم اسے لکھنے کے لیے بیٹھ جائیں جس قسم کے ناول میں لکھتا ہوں ان کے لیے تو ریسرچ ظاہر ہے کہ بے حد ضروری ہے علاوہ ازیں مصوری، آرٹ، ہسٹری آرکیالوجی اور موسیقی سے میری گہری دلچسپی اس چھان پھٹک میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

جب ہم کسی منظر کسی صورت حال کسی خبر یا کسی ذاتی تجربے سے متاثر ہو کر اسے سپرد قلم کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خیال کے ساتھ ہم کچھ وقت گزارتے ہیں یوں جیسے کسی بیج کو زمین کے حوالے کر دیا جائے اور پھر اسے پانی دیا جائے تو چند دنوں میں ننھا سا کھوا زمین سے اپنا سر باہر نکال لیتا ہے خیال کے طے پا جانے کے بعد ہم اپنے مشاہدے کو بنیاد بنا کر خیال کے پھیلاؤ کے لیے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں عموماً یہ کردار اپنے ارد گرد سے اٹھائے جاتے ہیں اور ان میں کچھ تبدیلی کر کے انہیں ایک نیا رنگ دیا جاتا ہے یہ مشاہدے کا عمل ہے جو ہماری تخلیق میں کام آتا ہے اسی لیے ہمارا مشاہدہ جتنا گہرا ہوگا ہمارے کردار اتنے ہی جاندار اور زندگی سے قریب تر ہوں گے اب اپنی تخلیق کو کاغذ پر لکھنے کا وقت آتا ہے جس کے لیے زبان کا ماہرانہ استعمال بنیادی چیز ہے جس میں لغزشیں ہمارے کام آتی ہیں اور ایک لفظ کو سو طرح برتنے کا سلیقہ سکھاتی ہیں زبان کی مہارت اور روانی کے ساتھ ساتھ مطالعے کی رنگا رنگی و لاشعوری طور پر ہماری تخلیق میں لہو بن کر دوڑتی ہے اس کے

ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر شعوری طور پر زبان کی مہارت اور مطالعے کی وسعت کو برتا جائے مشکل لفظ جان بوجھ کر استعمال کیے جائیں کتابوں میں پڑھی ہوئی باتیں یا تاریخ کے حوالے بلا ضرورت دیے جائیں تو وہ تخلیق سے الگ نظر آتے ہیں اور ان کی حیثیت کو کم کر دیتے ہیں ہم موسیقاروں، گلوکاروں خطاطوں یا نقاشوں کے بارے میں سنتے اور پڑھتے ہیں کہ وہ گھنٹوں ستار بجاتے ہیں ریاض کرتے و خطاطی کی مشق جاری رکھتے اور بدن کے ایک ایک حصے کو سو سو مرتبہ نقش کرتے ہیں تب ہی ان کی انگلیوں، ان کی آواز ان کی لکھتے اور ان کے کھینچے ہوئے نقوش میں جان پڑتی ہے بالکل ایسا ہی معاملہ لکھنے کا ہے ہم لکھنے کی جس قدر مشق کریں گے ہماری تحریر میں اتنی ہی روانی اور اتنی ہی جان آئے گی وہ اتنی ہی سجل ہوتی جائے گی اچھا لکھنے کے لیے ہمیں بھی کسی موسیقار یا گلوکار جتنی ریاضت اور اتنے ہی ریاض کی ضرورت ہے۔ مصوری، نقاشی، مجسمہ سازی یا خطاطی سیکھنے والوں سے بڑے کلاسیکی مصوروں مجسمہ سازوں اور خطاطوں کے کام کی انگلیوں اور ان کے ہاتھ میں لوچ اور خطوط میں لچک پیدا کرتی ہیں اسی طرح ہم اگر اچھا لکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بڑے لکھنے والوں کی تحریروں کے ترجمے کرنے چاہیں یوں ہم ان کو تحریروں کی نزاکتوں اور اسرار و رموز سے لاشعوری طور پر آگاہ ہوتے جاتے ہیں اور ہمیں زبان کو برتنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے ترجمہ ایک جدید کام ہے اگلے وقتوں کے لوگ کسی کہانی کو سنتے تو اس کو کسی دوسرے انداز میں نئے سرے سے لکھنے بیٹھ جاتے یا کسی دوسری زبان میں اسے نئی فضا اور نئے رنگ میں بیان کرنے کی یہی وجہ ہے کہ پرانی داستانیں اور کہانیاں ہمیں مختلف زبانوں میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں اگلے زمانوں میں یہ کام مترجمین کی بجائے داستان گو کرتے تھے وہ تاروں کی چھاؤں اور رات کے سکوت میں لوگوں کا دل دور دراز کی کہانیوں سے بہلانے ایک کارواں سرائے سے دوسری کارواں سرائے ایک بادشاہ کے دربار سے دوسرے امیر کی دہلیز تک پہنچتے کچھ فاصلہ طے ہوتا تو بولی بدل جاتی زبان کچھ سے کچھ ہو جاتی لیکن وہ داستان گو ہی کیا جو کئی زبانیں نہ جانتا ہو آج کے دور میں یہ پرانے داستان گو زندہ ہوتے تو ان بہت سے عالموں کا چراغ ذرا مد ہم چلتا جن کی ہفت زبانی کے چرچے ہوتے ہیں یہ نرالے لوگ نئی زبانوں میں ڈوب ڈوب جاتے، فنیقی، سمیری، اشوری اور مصری ملاحوں کی کشتیاں پر شور لہروں سے لڑتی ہوئی ایران، ہندوستان، چین کے ساحلوں سے لگتیں تو ان ملاحوں کی زبانی شراب خانوں اور قہوہ خانوں میں ایک ملک کی کہانی دوسرے ملک کی عورتوں، مردوں، خواجہ سراؤں، جمالوں اور بقالوں تک پہنچتی تو کچھ سے کچھ ہو جاتی مختلف زبانوں کی قصہ کہانیوں اردو میں منتقل کرنے کے کام آج سے دو صدی سے ہو رہا ہے فارسی، سنسکرت، پالی و ترکی، بنگلہ، عبرانی اور لاطینی کی داستانیں اور کہانیاں جانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی اردو میں منتقل ہوئیں اب تک کہانیاں پنچ تنتر، کتھا، الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال اور قصہ چار درویش جس نے اردو میں باغ و بہار کے نام سے بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی میرے یہاں لکھنے کا عمل پڑھنے سے جڑا ہوا ہے میرے لکھنے کو شاید میرے پڑھنے نے مہمیز دی گھر میں امی کی ابا کی کتابیں تھیں پڑھنے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی اس لیے ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے لے کر مولانا اشرف

تھانوی کے بہشتی زیور تک جو جی چاہا پڑھا بات سمجھ میں آئی یا نہ آئی لیکن آنکھوں سے گزار لی پھر جاسوسی ناولوں کا چسکا لگا تو ابن صفی سے لے کر اے حمید تک سب کو پڑھ ڈالا نہ انتخاب کی فرصت تھی نہ یہ فکر کہ اس طرح پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بس اسی راستے سے گزرتے ہوئے کہانیاں اور مضامین لکھنے کا عمل شروع ہو گیا لکھنا ایک پیچیدہ عمل ہے اس میں شعر، روغنی تصویریں، موسیقی کی لہریں، ہوا کا چلنا، بادلوں کا برسنا اور پیاسی مٹی اور پانی کے وصال کی سوندھی خوشبو آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے اور زمین پر تیزی سے لہرا کر چلتی ہوئی گہری ندی سب ہی شامل ہوتے ہیں شعور لاشعور اور تحت الشعور میں سلسلہ خیال کی اشرفیاں جمع ہو جاتی ہیں اور پھر جانے کب ان کا سنہرا پن کہانی میں لشکارے مارنے لگتا ہے اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہو ادراک واکتساب، تجربہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی یہ سب ایک عمل میں شامل ہے کوئی معمولی سا واقعہ پھولوں کی شاخ، گلی میں اکیلا کھڑا ہوا بچہ و رات کے وقت سنسان سڑک پر گزرتی ہوئی روشن بس، خزاں کی ہوائیں دور کی موسیقی، دوپہر کے سناٹے میں کمرے کا سنہرا رنگ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں ساری دنیا ساری کائنات کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نقطے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح یہ کتابیں جو ہمیں نرالے آسمانوں اور زمینوں کی سیر کراتی، نئے محسوسات سے آشنا کراتی ہیں نئی حالتوں سے گزارتی ہیں اور پھر جانے کیا ہوتا ہے کہ ان ہی حالتوں اور ان ہی کتابوں سے خیالات کی نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں نئے گل بوٹے سانس لیتے ہیں شعرا عجم حافظ و سعدی کا کلام، شاہنامہ فردوسی، یونان، مصر کی دیویاں اور دیوتا تاریخ کی کتابیں، کہانیوں کے مجموعے، میر و سودا غالب و انیس و دبیر، طلسم ہوشربا اور الف لیلیٰ و لیلیٰ، رسوی، فرانسیسی اور انگریزی کے ادیب اخباروں کی خبریں بھلا کون سی چیز ہے جو لکھنے کے عمل میں اپنا کردار ادا نہیں کرتی تخلیقی عمل میں مطالعہ کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے اس بارے میں عالمی ادب کا ایک بڑا نام میکسم گورکی ایک اپنے مضمون ''آن بک'' میں لکھتا ہے۔

''ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں انسان کو سمجھنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اس کے بارے میں لکھی جانے والی وہ کتابیں نہ پڑھیں جو ادیبوں اور سائنسی شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے لکھی ہیں اپنے اسی مضمون میں وہ آگے چل کر کہتا ہے۔

''میں انسانوں کے سوا کسی چیز کو جاننے اور اس کی آگہی رکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اور انسانوں تک پہنچنے کے لیے کتابوں سے زیادہ دوست دار اور دریا دل رہنما کوئی اور نہیں ہو سکتا لکھتے ہوئے دو چیزیں میرے محسوسات کو سب سے زیادہ مہمیز کرتی ہیں وہ شاعری اور موسیقی ہے اس کے علاوہ کسی فلم میں دیکھا ہوا کوئی منظر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے میر، سودا اور غالب یا جدید شاعروں کے مصرعے میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں میں انہیں اپنے اندر دہراتا رہتا ہوں اور پھر کسی ایک روز وہ اپنے آپ کسی افسانے میں نمودار ہو جاتے ہیں یہ ایک لاشعوری عمل ہے میں نہیں جانتا کہ لکھتے ہوئے یہ کیسے ہوتا ہے کہ اچانک کوئی مصرع کوئی بھولا بسرا گیت و افسانے کی بنت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

مجھے امی نے کہانیاں سنائیں اور لالا نے کتابیں پڑھائیں کہانیاں میں نے شاید ڈھائی تین برس کی عمر سے سننی شروع کیں اب ان کی کترنیں یاد رہ گئی ہیں چھ سات برس کی عمر سے میں کہانیوں کی، تاریخ اور مذہب کی کتابیں پڑھنے لگا تھا گھر میں ادبی اور نیم ادبی رسالے اور اخبار آتے تھے پڑھنے کا ایسا ہوکا تھا کہ مہینے بھر کا سودا آنے کے بعد امی سے ڈانٹ پھٹکار سننی ضروری تھی ان دنوں پلاسٹک کے تھیلے ایجاد نہیں ہوئے تھے اخبار اور رسالوں کی ردی سے لفافے بنتے تھے میرے لیے ہلدی مرچ دھنیا اور سونف کی پڑیاں و دالوں کے تھیلے اپنے اندر ایک عجیب رمز رکھتے تھے مہینے بھر کا سودا آتے ہی میں انہیں پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ان میں خبروں کی اور کہانیوں کی کترنیں ہوتی تھیں ان نامکمل خبروں یا کہانیوں کو میں پھر سے اپنے انداز میں مکمل کرتا تھا میرے اندر نئی نئی کہانیاں جنم لیتیں میں ان کہانیوں کو اپنی بوا کو سناتا۔

میرے خیال میں کہانیاں لکھنا یا مضامین اور کالم لکھنا میرے لیے ممکن ہی نہ ہوتا اگر میں نے دیوانوں کی طرح پڑھا نہ ہوتا ہم جتنی زیادہ اور مختلف النوع کتابیں پڑھیں گے زندگی کے اتنے ہی گہرے اور آبی رنگ ہمیں اپنی جھلک دکھائیں گے انکل ٹوم کو بن کو پڑھے بغیر ہم غلامی کے بارے میں بھلا کیا جان سکتے ہیں انسانوں کے ساتھ ان کے رنگ اور نسل کی بنا پر کیسے ستم ہوئے ہیں اسے جاننے کے لیے ایسے ناولوں اور آپ بیتیوں سے گزرنا ہوتا ہے عین اسی زمانے میں یا آس پاس کے زمانوں میں سفید فام خاندان امریکا میں کیسی زندگی گزار رہے تھے اس لیے ہم آگاہ نہیں ہو سکتے اگر دا لٹل وومن نہ پڑھی ہو یہ دو امریکی ناول امریکی کی دو متضاد دھاروں سے ہماری ملاقات کراتے ہیں اور ہم ان کے تضاد سے اپنی اقلیتوں اور اپنے دلتوں کے بارے میں کوئی نئی چیز تخلیق کرتے ہیں لکھنے کے عمل میں زبان دانی سب سے اہم ہے آپ کی رسائی اپنی زبان کے کتنے لفظوں تک ہے ایک ہی بات کو کتنی طرح کہنے کی مہارت ہے ایک لفظ کے کتنے مترادفات آپ کے علم میں ہیں، کتنی نعتیں آپ کی دسترس میں ہیں کتنے محاورے وضرب الامثال، آوارہ گرد اشعار اور کلاسیکی شاعروں کے دیوان تک آپ کی پہنچ ہے آپ کی تحریر میں کسی خاص پیشے سے تعلق رکھنے والے کردار ہیں اور اس پیشے سے متعلق اصلاحات اگر آپ کے علم میں نہیں ہیں تو خود سوچیں کہ ایک نائی و نان بائی یا درزی کے کردار کو کس طرح لکھا جا سکتا ہے نا اگر کسی خاص علاقے کے بارے میں کہانی اور بطور خاص ناول لکھا جا رہا ہے تو اس علاقے کے بارے میں مکمل جغرافیائی تفصیلات علاقے کے لوگوں کا تمدن ان کی لوک روایات اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے آگاہ ہوئے بغیر اوسط درجے کا ناول بھی نہیں لکھا جا سکتا نہ کہ بڑا یا اہم ناول کے لکھنے کی توقع کی جائے شوکت صدیقی جن دنوں جانگلوس لکھ رہے تھے ان کے کمرے میں پنجاب کے ان علاقوں سے متعلق کتابیں جرائد ورسائل گزیٹر اور کمرے کی دیواروں پر اس علاقے کے نقشے آویزاں رہتے تھے۔

2015ء کی بات ہے ایک خوبصورت شاعرہ اور مونتاج کی ایڈیٹر منصورہ احمد کا مجھے ایک ای میل ملا ای میل کیا تھا ایک محبت نامہ تھا جو مجھے شرمسار کر رہا تھا صبح کا وقت تھا لیکن اس محبت نامے کی آمد سے میرے آس پاس بہت ساری شام اور اس کا دھندلکا [illegible] آیا [illegible] سائے گم ہونے لگے تو موہ نے مجھے اپنی

مٹھیوں میں قید کرلیا چھچھم نے شاید اس وقت کوئی دریچہ کھول دیا تھا آ کاش لوبان کی طرح سلگتا ہوا اس دریچے سے نظر آرہا تھا وہاں کہیں ضرور اس لوبانی میں ایک بہت بڑا سا قلعہ تھا چھپا ہوا تھا میں ایک سمندر لہریں مار رہا تھا لہریں گھنٹوں اور شہنائیوں کے لہن میں شاید یہی کہہ رہی تھی اگر اسے دیکھنا ہے تو اسے دیکھنا ہے تو اپنے جسم و دل کے اندر دیکھوا اے میرے کہانی کار تمہاری کہانیاں تمہاری شاعری ایک بیج ہے اور یہ بیج کائنات ہے اے میرے کہانی کار سچ بتا تو کسی وقت کہانی لکھتا ہے کہ تیری کہانی میں وقت ایک تمثیل نہیں بلکہ خون بن کے دوڑنے لگتا ہے اور اس خون کا رنگ موسم بہار کا لال رنگ نہیں بلکہ موسم خزاں کا زرد اور سنہرا رنگ ہوتا ہے سچ کہانی کار کیا تو کہانی اس وقت لکھتا ہے۔

جب حاملہ زمین اپنے پیٹ کے اندر سے اکھولے نکالنے کے لیے جگہ جگہ تڑخنے لگتی ہے۔

جب مولانا روم شمس تبریز، جامی، خیام، سعدی، ابن عربی اور حافظ کے دامن کی ہوا تیرے دامن کی ہوا سے مل جاتی ہے۔

جب پورا چاند سمندر کے ساحل سے ملنے کی کوشش کرتا ہے فرشتے صف صف کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں تو جنت کی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور زمین مقدس پر سربسجود ہو جاتی ہے جب ناقدین ادب اپنے اپنے چہرے پر مکھوٹے چڑھا کر دلالی کرنے لگتے ہیں اور سمندر العتش العتش پکارنے لگتا ہے۔

جب سورج ڈرنے لگتے ہیں اور سرسبز اشجار منافقین کے چہروں پر پھونکنے لگتے ہیں جوان عورتیں اپنے اپنے پیٹوں کی قلعی کراتی ہیں اور نامرد اپنے نیفوں میں مردوں کو چھپانے لگتے ہیں۔

جب بوڑھے مرد لونگ کھانے لگتے ہیں۔

اور بوڑھی عورتیں اپنی چھاتیوں سے لونڈوں کو دودھ پلانے کی ناکام کوشش میں مصروف نظر آتی ہیں۔

جب مگس پھولوں سے رس کشید کرتے ہیں اور پرندے زمین کے قصے دھراتے ہیں جب کلیاں دستک دینے لگتی ہیں اور زخم موسیقی سنانے لگتا ہے

تو اس وقت کہانی لکھتا ہے کیا تو واقعی اس وقت کہانی لکھتا ہے اے میرے کہانی کار میں سوچتی ہوں خزاں کے موسم کا آدمی بنا جب تو ملن کی شدید پیاس لیے ایک انام گپھا کے نزدیک پہنچتا ہے اس گپھا میں مسلسل بارش کا چھم چھم رس بہہ رہا، دبا جا نہیں بج رہا ہے لیکن اس جھنکار کا عود اٹھ رہا ہے دھیان لگا کے اگر اس جھنکار کے عود کو سونگھا جائے تو اس سے کہانیاں اور شاعری صاف سنائی دے رہی ہیں یہ شاعری اور کہانیاں آواز کے پردوں میں مست ناگنوں کی سرسراہٹ گھول رہی ہیں سرسراہٹ کے گھول کے پاس ہی کنول کے پھول بھی کھلے ہوتے ہیں۔ لیکن تالاب غائب ہیں محبوب رحیم و کریم تھا اس لیے تجھ پر مہربان ہو گیا شاید یہی تیری کہانی ہے اور یہی تیری کہانی کا وقت اے میرے کہانی کار دستگیر شہزاد۔

لکھنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آیئے ہم دنیا کے سب سے بڑے ناول جنگ اور امن کی بات کریں یہ ناول جو ایک بڑا تخلیقی رزمیہ ہے ٹالسٹائی پر اچانک کسی آسمانی کتب کی طرح نازل نہیں ہوا اسے لکھنے

کے لیے اس نے بے پناہ ریاضت کی اس نے نپولین کے محلے کے بارے میں تاریخ کی کتابیں روسی جرنیلوں کی یادداشتیں فوجی افسران کے درمیان خط و کتابت اور اس عہد کے اخبار و رسائل اور جرائد پڑھنے شروع کیے عرض ہزار ہا صفحوں پر پھیلا ہوا سامان اس نے پڑھ ڈالا اس کی یادداشتیں لکھیں وہ ان روسی بوڑھوں سے جا کر ملا جو نپولین کی افواج سے مختلف محاذوں پر لڑتے تھے جنھوں نے پہلے ماسکو کی فتح اور پھر فرانسیسی افواج کی گرتے پڑتے پسپائی دیکھی تھی پہلے ان کی وردی میں ٹنکے ہوئے بٹن اور سنہری فیتوں پر ابھرتے ہوئے سورج کی تابانی دیکھی تھی اور بعد میں انہیں چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے فاقہ زدہ حالات میں فرانس کی طرف واپس جاتے دیکھا تھا وہ ان میدانوں میں گیا جہاں روسی اور فرانسیسی فوجوں کی لڑائیاں ہوئی تھیں اس نے ان میدانوں کی مٹی کو اپنی مٹھی میں اٹھا کر ان کا رنگ دیکھا، انہیں سونگھا، مٹی کی اس خوشبو میں فتح اور شکست کے رنگ یکجا تھے اس مٹی میں روسی اور فرانسیسی سپاہیوں کا خون جذب ہوا تھا ان لق و دق میدانوں میں اس نے چشم تصور سے نپولین کی افواج قاہرہ کی فتح بھی دیکھی ہوگی ان کے ہتھیاروں کی جھنکار بھی سنی ہوگی اور پھر یہ دیکھا ہوگا کہ جنگ کا میدان مغرور گھوڑوں نخریلے افسروں اور پریشان حال سپاہیوں سے خالی ہے وہ سب اپنے اپنے کردار ادا کر کے عدم کو جا چکے ہیں وہاں تو بس اب فطرت کی رونمائی ہے جو کہیں سبزے کہیں اونچی گھاس اور کہیں گل بوٹوں کی شکل میں نمودار ہوئی ہے اور انسانوں پر ہنستی ہے ٹالسٹائی نے روس پر نپولین کے حملے اور جنگوں کو لکھنے کے لیے اس عہد کو جاننے کا بیڑہ اٹھایا اور وہ اس دور کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے لگا اس نے جب لکھنا شروع کیا تو جنگ اور امن ایسے ضخیم مسودے کو اس نے سات بار بدلا کہیں کچھ بڑھایا کہیں کچھ گھٹایا کوئی کردار پھر سے لکھا کسی واقعے کو نئے تناظر میں بیان کیا اس نے اپنے اس ناول کے لیے جس قدر کشت اٹھایا، اسے نقاد عظیم ریاضت کے نام سے یاد کرتے ہیں دنیا کا یہ عظیم ناول ریاضت و بے اندازہ مطالعے اور بے پناہ مشاہدے کا شاہکار ہے ایک ایسا ناول جس کے تخلیق و نور کی ساری دنیا میں مثالیں دی جاتی ہوں ایک ایسی عظیم تخلیقی تحریر جسے ہاتھ لگانے سے پہلے باوضو ہونے کو جی چاہے اس کے پیچھے کس قدر غیر تخلیقی عمل شامل تھا اسے لکھنے والوں کو جاننے سمجھنے اور برتنے کی ضرورت ہے خود ٹالسٹائی نے اپنے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے فنکار کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تاریخی شخصیات اور واقعات کے مقبول عام تصور کی اساس، خیالی باتوں پر نہیں بلکہ تاریخی دستاویزات پر جنہیں جس حد تک مورخین یکجا کرنے اور ترتیب دینے میں کامیاب رہے ہوتی ہے اگرچہ فنکار ان دستاویزات کو مختلف انداز سے سمجھتا اور پیش کرتا ہے لیکن مورخ کی طرح اسے بھی تاریخی مواد سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے میرے ناول میں جہاں بھی تاریخی شخصیات باتیں کرتی یا روبہ عمل ہوتی ہیں میں نے اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں گھڑی بلکہ میں نے وہ تاریخی مواد جس کی میں نے کتاب کی تحریر کے دوران پوری لائبریری اکٹھا کر لی تھی استعمال کیا ہے۔

جنگ اور امن چونکہ تاریخی ناول ہے اس لیے ٹالسٹائی کو یہ ریاضت کرنی پڑی لیکن یہ بتائیے کہ کیا ٹالسٹائی کا ہی اینا کرینا ایسا روح میں اتر جانے والا عشق بلا خیر، مشاہدے، مطالعے اور کرداروں کی تعمیر کی ریاضت

کے بغیر لکھا جاسکتا تھا کیا قرۃ العین حیدر آگ کا دریا یا گردش رنگ چمن بے پناہ مطالعے اور گہرے مشاہدے کے بغیر لکھ سکتی تھیں آپ کا دل جب مصوری یا مجسمہ سازی کے لیے چاہتا ہے کہ موسم بہار کی ایک صبح آپ نے موقلم اٹھایا رنگ نکالے اور کینوس پر ایک شاہکار بنتا چلا گیا اسی طرح اگر مجسمہ بنایا جارہا ہے تو پتھر یا لکڑی میں سے اس کی چہرہ کشائی کس قدر ریاض اور ریاضت کی طلبگار ہے یہ وہی جانتے ہیں جوان مرحلوں سے گزرتے ہیں آپ یقین کیجیے ناکام اور کامیاب اور لائق اور نالائق شخص میں صرف محنت کا فرق ہوتا ہے لائق اور کامیاب لوگ اپنا میجر ٹائم اپنے کام اور اپنے پروفیشن کو دیتے ہیں جبکہ ناکام اور نالائق لوگوں کا قیمتی وقت فضول ضائع ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ کی نظر لائق و نالائق دونوں برابر ہوتے ہیں قدرت دونوں کو اپنا بندہ سمجھتی ہے کامیابی کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اللہ کا کرم اور محنت دنیا میں اللہ کے کرم سے بڑی کوئی طاقت اور محنت سے بڑا کوئی استاد نہیں ہوتا۔

ہم لوگ زندگی بھر اپنی جس عادت کو اپنا مشغلہ اپنا شوق سمجھتے رہتے ہیں میرے پاس اللہ کا کرم اور محنت کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور یہ انسان کا وہ اثاثہ ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی کیونکہ دنیا کی دس ہزار سال کی ریکارڈ ہسٹری میں آج تک کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے محنت اور اللہ سے دعا کرنے کا حق نہیں چھین سکا محنت وہ عطیہ ہے جس کے ذریعے انسان پتھر کو ہیرا اور ہیرے کو شیشہ بنا سکتا ہے اور اللہ کا کرم وہ طاقت ہے جو نمرود کی آگ کو بھی گلزار بنادیتی ہے چنانچہ آپ محنت اور اللہ کے کرم کو اپنا سہارا بنالیں یقین کیجیے دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کامیابی کی چوٹی تک پہنچنے سے نہیں روک سکے گی میں نے تین ناول لکھے ہیں۔

بات ہے رسوائی کی، چشم دید گواہ، خواب سارے عذاب سارے۔

یہ ناول بڑی مشکل سے چھپے تھے کچھ مٹی کے گولک کے پیسوں سے کچھ میرے استادوں کے پیسوں سے کچھ میرے باپ کے تہجد سے لے کر جاگتی ہوئی راتوں سے اور کچھ پیسے میری ماں کے آنچل کے بندھے ہوئے تھے ان سب کو ملا کے یہ ناول چھپے ہیں تخلیق و عشق کا معاملہ ہے اس میں اتاؤلے ہونے سے کام نہیں چلتا عشق بھلا کو اپنے در پر آسانی سے شرف باریابی بخشتا ہے۔ اس کے لیے زندگی صرف کرنی پڑتی ہے جگر خون ہوجاتا ہے۔

غالب نے شاید اسی کیفیت کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے کہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

لوگ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے ان سب کے نام کس کو معلوم نہیں اسی طرح میں بھی دو لاکھ 48 ہزار ادیبوں میں آیا ہوں ہوسکتا ہے کہ کل کلاں کو کوئی میرا نام بھی نہ جانے مگر میرے لیے یہ احساس ہی بڑا قیمتی ہے کہ کل آنے والا ہے۔



حاضر غائب

زرین قمر

اس بار Stephen A Hunt کا ناول In the company of ahosts پیش خدمت ہے یہ اپنی طرز کا انوکھا ناول ہے اس ناول کا مرکزی کردار اگا تھا وچلے برطانیہ کے اسپیشل سیکرٹ سروس ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کرتی ہے اس کی عاشق روح نیوان بہت سے کیس حل کرنے میں اس کا ساتھ دیتی ہے یہ بات آہستہ آہستہ دفتر کے لوگوں پر آشکار ہوجاتی ہے اگا تھا کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کی بے سروپا حرکتوں کی وجہ سے اسے ذہنی مریض سمجھ کر ایک نفسیاتی ادارے میں داخل کردیا جاتا ہے نیوان وہاں بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے پھر ایک سال بعد اسپیشل برانچ کو ایک اور الجھا دینے والے کیس کے سلسلے میں اگا تھا کی خدمات درکار ہوتی ہیں اور اسے نفسیاتی اسپتال سے آزاد کرادیا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی مدد کرسکے۔





DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

گیری ڈیول اس اپارٹمنٹ کی سجاوٹ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ وہاں ملک کے مایاناز اور سب سے زیادہ مشہور اور مہنگے اداکار سائمن ورک کی موت کی تحقیقات کے سلسلے میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی اسسٹنٹ تھریسیا بھی تھی' جس نے ایک ماہ پہلے ہی مغربی لندن کے CSI ڈپارٹمنٹ کو جوائن کیا تھا' وہ آثار قدیمہ کی شناخت کی صلاحیت رکھتی تھی اور نوادرات اس کا خاص موضوع تھا۔ اس وقت بھی اس کی نظریں ایک میز پر جمی ہوئی تھیں' یہ میز شاید خودکشی کی واردات میں استعمال کی گئی تھی لیکن تھریسیا کچھ اور ہی دیکھ رہی تھی۔

''اوہ...... گیری' اس میز کو دیکھو یہ تو آثار قدیمہ میں بہت اہم مقام رکھتی ہوگی۔'' تھریسیا کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''کیا مطلب؟'' گیری نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی یہ نپولین بوناپارٹ کے زمانے کی میز ہے اور وہ دیکھو...... جس پر سائمن کا کمپیوٹر سیٹ رکھا ہے وہ بھی اس جیسی ہی میز ہے۔'' تھریسیا نے کہا۔ ''تم نہیں جانتے ہوگے کہ یہ دونوں نادر میزیں فرانس کے ایک تاجر نے ایک زمانے میں ایک نیلامی سے خریدی تھیں۔''

''مجھے تمہاری آثار قدیمہ کے بارے میں معلومات پر حیرت ہے لیکن ہم یہاں میزیں دیکھنے نہیں بلکہ ملک کے مشہور اور دولت مند ترین اداکار سائمن ورک کی موت کی تحقیقات کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' گیری نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں میں جانتی ہوں۔'' تھریسیا نے کہا۔ ''لیکن اس اپارٹمنٹ میں ایسی بہت سی نادر چیزیں نظر آرہی ہیں اس کا مطلب ہے کہ سائمن نوادرات جمع کرنے کا شوقین تھا۔''

''ہاں' ایسا ہی لگتا ہے...... تم نے ٹشو پیپرز دیکھے... میں نے اپنی زندگی میں اتنے خوبصورت نرم و گداز ٹشو پیپرز نہیں دیکھے۔'' گیری نے تعریفی انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ آنے والا کمپیوٹر ہیکر اسپیڈ اس وقت سائمن ورک کے پرسنل کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا وہ اس کا ڈیٹا اور ریکارڈ چیک کر رہا تھا تاکہ ایسی معلومات جمع کر سکے جس کی مدد سے سائمن کی موت کا معمہ حل ہو سکے اس وقت سائمن ورک کی لاش کمرے کے فرش پر پڑی تھی اور اسے گیری اور اسپیڈ نے مل کر نیچے اتارا تھا ورنہ وہ چھت میں لگے ایک کنڈے سے بندھی ایک رسی کے ذریعے لٹک رہی تھی جو میز تھریسیا کی توجہ کا مرکز بنی تھی وہ سائمن کے پیروں کے نیچے تھی اور سائمن کا جسم کنڈے سے لٹکا جھول رہا تھا' سائمن کا کمپیوٹر انہیں آن ملا تھا اور اس کی مونیٹر کا اسکرین روشن تھا' کمرے کی لائٹیں آف تھیں اور مانیٹر اسکرین پر ایک این میڈ فلم چل رہی تھی' اسپیڈ نے اپنا لیپ ٹاپ بھی سائمن کے کمپیوٹر سے کنیکٹ کیا ہوا تھا اور اس کا سارا ڈیٹا کاپی کر رہا تھا۔ گیری نے سفید رنگ کے دستانے پہنے ہوئے تھے اور وہ موقع پر موجود شواہد جمع کر رہا تھا اچانک اس کی نظر میز کی ٹوٹی ہوئی ایک ٹانگ پر پڑی اس کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا قریب ہی پڑا تھا جسے اٹھا کر گیری نے پلاسٹک کے ایک بیگ میں ڈال لیا تھا۔

''جس میز پر سائمن کا کمپیوٹر رکھا ہے وہ اپنی جگہ پر بھی نہیں ہے یوں لگتا ہے جیسے اسے اس کی جگہ سے کھسکایا گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسرے کمرے میں اس کی سیکرٹری کی جو میز رکھی ہے وہ اس کی میز سے بڑی ہے۔'' گیری نے کہا۔

''ہاں...... یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔'' تھریسیا نے جواب دیا۔ ''تم نے ایک اور بات نوٹ کی یہ میز ایک میکینیکل میز ہے اس کی دراز یں اس کی سطح سے اوپر اٹھ جاتی ہیں ایسا جب ہوتا ہے جب تم اس میں لگے گیئر کو چھوتے ہو۔''

''کیا یہ مہنگی ہوگی؟'' گیری نے پوچھا۔

''یقیناً' کیونکہ یہ بھی نوادرات میں شامل ہے اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہوگی۔'' تھریسیا نے کہا۔

''اس کی لاش دیکھ کر مجھے عجیب سا لگ رہا ہے یوں پھانسی لگا کر مرنا عجیب سا ہے دیکھو...... اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں اور آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئی ہیں۔'' اسپیڈ نے کہا۔

''تمہیں اس ادارے کو جوائن کیے ہوئے ایک مہینہ تو ہوگیا ہے اب تک تو تمہیں ایسی باتوں کا عادی ہوجانا

چاہیے تھا۔'' گیری نے آہستہ سے کہا اور اسپیڈ سر ہلا کر خاموش ہوگیا' وہ اپنے کام میں خاصا منہمک تھا۔

''یوں لگتا ہے جیسے میز کا ایک پایہ سائمن کے وزن سے ٹوٹا ہوگا۔'' گیری نے کہا اس کی نظریں کمرے میں لگے سیکیورٹی کیمرے کی طرف تھیں ایسے ہی تین مزید کیمرے اور بھی وہاں لگے ہوئے تھے وہ بہترین کیمرے تھے اور ڈیجیٹل سیکیورٹی کے لیے استعمال ہونے والے مہنگے ترین کیمروں میں ان کا شمار ہوتا تھا' اس میں طاقتور ترین لینس لگے ہوئے تھے جو نقل وحرکت کو خود ہی محسوس کر کے ایکشن لیتے تھے اور ان میں دن اور رات کے حساب سے کام کرنے کا آٹو میٹک سسٹم تھا اندھیرے میں فلم بنانے کے لیے بھی اس میں الگ سے سسٹم موجود تھا۔ گیری پہلے ہی کیمرے کی لی گئی تصاویر اور فلمیں دیکھ چکا تھا اس نے اس فلم میں سائمن ورک کو مرنے کی کیفیت میں محسوس کیا تھا اس کا چہرہ تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کا لٹکا ہوا جسم میز گرنے کے بعد ہوا میں لٹک رہا تھا اور اس کے گلے سے نکلتی ہوئی کراہیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس کا جسم ساکت ہوگیا تھا۔

''اس کمرے کی شان وشوکت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت جس طرح خرچ کرتا تھا اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔'' گیری نے کہا۔

''اسے دولت جمع کرنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا وہ اپنے آسکر ایوارڈ تک بھاری قیمت پر فروخت کر دیتا تھا۔'' اسپیڈ نے کہا اس کی نظریں اپنے لیپ ٹاپ پر لگی ہوئی تھیں۔

''نہیں میرا یہ خیال نہیں۔'' تھریسیا نے کہا۔ ''اس کی زیادہ دولت On line کی دنیا سے آتی تھی اس کے آفس میں موجود ایک خاص عملہ اس کی فلموں کی آمدنی on line وصول کرتا تھا اس کی دولت کا ایک ذریعہ گرین ٹیکنالوجیز بھی تھیں اور اس کے علاوہ ایرو اسپیس سلائینس اور نیر کنٹرول ورکس سے بھی حاصل ہوتی تھی اسے اپنے ہر بزنس سے بے شمار آمدنی ہو رہی تھی۔''

''میرا خیال ہے بزنس میں اس کا جڑواں بھائی کرٹس ورک اس کا پارٹنر ہے۔'' تھریسیا نے پوچھا وہ بہت دلچسپی سے گیری اور اسپیڈ کی باتیں سن رہی تھی۔

''جب یہ حادثہ پیش آیا اس وقت کرٹس ورک ڈربن سے فلائی کر کے واپس آرہا تھا اس نے یہ خبر ابھی میڈیا سے پوشیدہ رکھی ہے' وہاں وہ ایک نیا پلانٹ کھولنے گیا تھا جب سائمن کی موت کی اطلاع لوگوں کو ملے گی تو میڈیا میں تو بڑا شور ہوگا وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔'' گیری نے کہا وہ اسپیڈ کی طرف مڑا۔ ''میں وہ فلم دیکھنا چاہتا ہوں جو کمپنی کے منیجر نے سی سی کیمرے میں دیکھی ہے۔''

''لیکن وہ تمام فلمیں تو منیجر کے دیکھنے کے بعد سیکیورٹی کے پیش نظر لاک ڈاؤن کر دی گئی ہیں اور انہیں باقاعدہ سیل کر دیا گیا ہے۔'' اسپیڈ نے بتایا اور اسی وقت اپارٹمنٹ کے دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ گیری نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا ہوا تھا جس کی ڈیوٹی سائمن کے اپارٹمنٹ ہی پر تھی۔

''ابھی تک سائمن کی باڈی یہاں کیا کر رہی ہے آخر اسے پیتھالوجی فریزر میں کب رکھا جائے گا؟''

''ایک گھنٹہ تک لگ سکتا ہے۔'' گیری نے کہا اس کی نظریں تھریسیا پر تھیں جس نے ہاتھوں میں نوٹ بک پکڑی ہوئی تھی۔

''چیف انسپکٹر وارڈن؟'' تھریسیا نے آنے والے کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں میں اس تحقیقات کا انچارج ہوں۔'' آنے والے نے بتایا۔

''آج صبح تک تم انچارج تھے اور دوپہر سے میں ہوں۔'' گیری نے کہا۔ ''اور یہ صرف تحقیقات نہیں ہے بلکہ اب ذمہ داری تمہارے ادارے سے لے کر میرے ادارے کو دے دی گئی ہے چنانچہ تم جاسکتے ہو۔''

''گویا اسپیشل برانچ نے مجھے اس معاملے سے نکال باہر کیا ہے؟ کیوں یہ کیا سیاست ہے؟'' انسپکٹر وارڈن نے کہا۔ ''تم مجھے نکال کر یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ تعاون کروں گا؟''

''جب مجھے تمہاری ضرورت ہوگی تو مجھے کیسے تمہارا تعاون حاصل کرنا ہوگا یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں ابھی مجھے تمہاری ضرورت نہیں تم جاسکتے ہو۔'' گیری نے اسے

چڑانے والے انداز میں کہا۔

"بھاڑ میں جاؤ" انسپکٹر نے غصے سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ زور سے بند کیا تھا اور تھریسیا اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"ادھر آؤ گیری' دیکھو میں نے اس کی اہم فائلوں تک رسائی حاصل کر لی...... جلدی آؤ۔ یہ بند ہو رہا ہے۔" اسپیڈ نے سامنے کے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کسی نے اس کو سیٹ کر دیا تھا کہ دوسری بار اگر اسے چلایا جائے تو یہ ایک نئی Key کے تحت صرف دو منٹ چل کر لاک ہو جائے اور پھر ہوا بھی یہی تھا گیری کے کمپیوٹر تک پہنچتے پہنچتے کمپیوٹر پھر لاک ہو گیا تھا۔

"اوہ شٹ!" اسپیڈ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے اگر ہم کورٹ سے رجوع کریں اور فلورنس کے نفسیاتی سینٹر کے لاک اپ میں موجود سپر میکس کی خدمات حاصل کریں تو یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔" گیری نے کہا۔

"اسپیڈ' کیا تم اب بھی یہی کہو گے کہ ہمیں اس کی خدمات کی ضرورت نہیں ہے؟" تھریسیا نے پوچھا۔

"میں نے اس کے ساتھ کام نہیں کیا لیکن لوگوں سے یہی سنا ہے کہ وہ ایسے کیسوں کی گتھیاں بڑے آرام سے سلجھا لیتی ہے وہ اپنے کام میں ماہر ہے اور اسے کسی سپر اسپرٹ کی توجہ حاصل ہے اسی لیے تو اسے سپر میکس کا خطاب دیا گیا ہے۔" گیری نے کہا۔

"ہاں ہمیں اس کی ضرورت ہے۔" تھریسیا نے کہا۔

"ٹھیک ہے تھریسیا میں تمہیں ذمہ داری دیتا ہوں 'سپر میکس' کو وہاں سے باہر نکالو اور اس سلسلے میں جو بھی اقدامات اٹھانے ہیں جلدی کرو۔" گیری نے کہا اور پھر اسپیڈ کی طرف مڑا۔

"اس فلم کی ایک کاپی مجھے بھی دو اور دھیان رکھنا کاپی بالکل نیٹ اینڈ کلین ہو یہ فلم خود بخود پانچ سیکنڈ میں ختم ہو جائے گی میں اس کی کاپی محفوظ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آسکے۔" گیری نے کہا۔ اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" تھریسیا جلدی سے بولی۔

"واپس آفس جا رہا ہوں۔" گیری نے کہا اور تھریسیا بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئی۔



بیڈلم کے نفسیاتی کیئر سینٹر میں بعض اوقات کچھ فیملیز وزٹ کرنے بھی آ جاتی تھیں جہاں سلاخوں کے پیچھے بنے ہوئے کمروں میں نفسیاتی مریض موجود ہوتے پھر وہاں کا سیکیورٹی گارڈ ایک ایک مریض کے بارے میں اس کی دلچسپ کہانی آنے والوں کو سناتا ایسے ہی کمروں میں سے ایک کمرے میں اگاتھا وچلے بھی رہتی تھی لیکن اس کا کمرہ دوسروں کے مقابلے میں بہت مختلف تھا اس کا کمرہ صاف ستھرا اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے آراستہ تھا اس کے فرش پر موٹا خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا ایک کونے میں ٹی وی رکھا تھا اور دوسرے کونے میں رائٹنگ ٹیبل موجود تھی اس کمرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی نفسیاتی سینٹر میں موجود ہے' ایک دیوار میں شیشہ لگا تھا جو اندر سے باہر کا منظر نہیں دکھاتا تھا بلکہ باہر سے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا اگاتھا وچلے کو ایسی جیکٹ پہنائی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کے بازو بندھ گئے تھے اور اس اسٹریٹ جیکٹ کی وجہ سے اسے ڈیوڈ نیوان کے ساتھ رقص کرنے میں مشکل ہوتی تھی۔

ڈیوڈ نیوان جس کی روح آج بھی وہی رائل ایئر فورس کا یونیفارم پہنے ہوئی تھی جو اس نے ایک اداکار کی حیثیت سے فلم Amother of life and death میں پہنا تھا یہ فلم 1946 میں بنی تھی اور اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی تھی اس فلم میں نیوان نے ایک ایسے عاشق کا کردار ادا کیا تھا جو مر چکا تھا اور اس کی روح اپنی معشوقہ کو اپنے غم سے دور رکھنے اور سکون بخشنے کے لیے واپس آ جاتی ہے اس فلم میں ہیروئن کا کردار وقت کی مشہور اداکارہ کم نیٹر نے ادا کیا تھا۔ اگاتھا کسی کی محبت نہیں تھی لیکن وہ یہ جانتی تھی کہ اگر کوئی روح چاہے تو وہ انسانوں کے ساتھ رابطے میں آ سکتی ہے نیوان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا اگاتھا نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر کوشش نہیں کی تھی کہ وہ نیوان کی روح سے رابطہ کرے لیکن وہ خود ہی اس سے رابطے میں رہتی تھی اسے آنے والے حالات کے

بارے میں بتاتی تھی اور اگاتھا کو بہت سے کیس سلجھانے میں اس کی مدد کرتی تھی۔ اگاتھا نے CIA کے سیکرٹ سروس کے اسپیشل ڈپارٹمنٹ میں کافی عرصہ ملازمت کی تھی اور بہت سے مشکل کیس سلجھائے تھے لیکن پھر نیوان کے ساتھ اس کی ملاقاتیں اتنی کثرت سے ہونے لگیں کہ پبلک مقامات پر بھی وہ عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی اور اسے نفسیاتی مریض سمجھ کر نفسیاتی کیئر سینٹر بھیج دیا گیا جہاں وہ کافی عرصے سے تھی لیکن کافی علاج کے باوجود اس کی ذہنی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی درحقیقت وہ نفسیاتی مریض تھی ہی نہیں اسی بات کو بنیاد بنا کر تھریسیا نے کاغذات تیار کروائے تھے اور کورٹ سے رضامندی لینے کے بعد گیری کے حوالے کر دیئے تھے اور آج گیری اپنے ساتھیوں کے ساتھ اگاتھا سے ملنے آیا تھا اور کمرے کے باہر موجود تھا وہ دیوار میں لگے شیشے سے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے' انہیں نظر آ رہا تھا کہ اگاتھا جیسے ڈانس کر رہی ہو لیکن اس کے دونوں بازو اسٹریٹ جیکٹ میں بندھے ہوئے تھے پھر بھی وہ رقص کے انداز میں گھوم رہی تھی بالکل ایسے جیسے کسی نے اسے رقص کے لیے سہارا دیا ہو اور وہ کسی کی بانہوں کے سہارے رقص کر رہی ہو۔

''تم نے مجھے بتایا نیوان کے مجھ سے ملنے کچھ لوگ آئے ہیں؟'' اگاتھا نے نیوان کے کان میں سرگوشی کی جو اسے بانہوں میں لیے رقص میں مصروف تھا۔

''ہاں...... ڈیئر میں انہیں دیکھ سکتا ہوں...... وہ دیوار میں لگے شیشے سے ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔'' نیوان نے کہا۔

''تمہیں بھی؟'' اگاتھا نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ ''تم تو روح ہو نا؟''

''وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن میں انہیں دیکھ سکتا ہوں کیونکہ مجھے انہیں دیکھنے کے لیے شیشے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' نیوان نے کہا اور اگاتھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی وہ ٹی وی سے آنے والے میوزک کی آواز پر بار بار نیوان کے ساتھ بل کھاتی اور رقص کرتی رہی تھی۔

''ان میں تین ڈاکٹرز اور ایک بوڑھی نرس بھی ہے۔'' نیوان نے اگاتھا کو بتایا۔ ''ایک ڈاکٹر اسے کچھ ہدایات بھی دے رہا ہے۔''

''یقیناً وہ ڈاکٹر بی شپ ہوگا۔'' اگاتھا نے کہا بات کرتے وقت وہ اس بات کا خیال رکھ رہی تھی کہ جب اس کی پشت دیوار میں لگے شیشے کی طرف ہو تب وہ نیون سے بات کرے تاکہ باہر موجود لوگ اس کے ہونٹوں کی جنبش نہ دیکھ سکیں۔ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر بی شپ ہونٹوں کی حرکت سے الفاظ کا اندازہ لگانے کا ماہر ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی پرسنل فائل میں اس کے خلاف موجود الزامات میں اضافہ ہو۔

''ڈاکٹر کچھ خوش نظر آ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے لیے آئے ہیں۔'' نیوان نے کہا۔

''ہاں' اسے خوش ہونا بھی چاہیے۔'' اگاتھا نے کہا اور نیوان نے ایک ہاتھ بلند کر کے اپنی مونچھوں کو سہلایا۔

''ان کی کاریں چند منٹ پہلے ہی باہر آ کر رکی تھیں۔'' نیوان نے اگاتھا کو بتایا۔ ''ڈاکٹرز سارا دن مختلف فون کالز کا جواب دیتے رہے ہیں جو تمہیں یہاں سے لے جانے کے انتظامات کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔'' نیوان آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہا تھا وہ اس کی بانہوں میں جھول رہی تھی اسے دیکھ رہی تھی محسوس کر رہی تھی' لیکن کمرے کے باہر کھڑے لوگوں کو وہ نظر نہیں آ رہا تھا انہیں صرف اگاتھا نظر آ رہی تھی جو اکیلی محو رقص تھی۔ پھر رقص کرتے کرتے اس کا چہرہ نیوان نے شیشے کی طرف کر دیا تھا اس کے بال سفید تھے اور عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی اس کے باوجود اس کا جسم کسی جوان عورت کی طرح چست اور پھرتیلا تھا۔

''جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کو بتانا کہ سائمن ورک نے خودکشی کیسے کی۔'' نیوان نے اگاتھا سے کہا۔

''کیا تم میری مدد کرو گے؟'' اگاتھا نے پوچھا۔

''ہوں...... ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے۔'' نیوان نے کہا۔

''تم نے ان کے آنے سے پہلے ہی مجھے ان کے آنے کی خبر دے کر اچھا کیا نیوان۔'' اگاتھا نے خوش دلی سے کہا۔

''میرا خیال ہے یہی بات بہتر تھی کہ تمہیں بتا دیا جائے۔''

''کیا میں تم سے درخواست کر سکتی ہوں کہ کچھ دیر اور

مجھے اپنی بانہوں میں رہنے دو' مدتیں ہوگئیں میں نے کسی کے ساتھ یوں ڈانس نہیں کیا۔'' اگاتھا نے کہا۔
''میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں میں نے بھی اپنا آخری رقص فلم ''Better late than never'' کے سیٹ پر میکی اسمتھ کے ساتھ کیا تھا وہ میری زندگی کا آخری رقص تھا۔''
''ہوں..... تم یہ بات کئی بار مجھے بتا چکے ہو۔'' اگاتھا نے کہا۔
''تمہیں پتہ ہے باہر کھڑے لوگوں میں کیا بحث ہو رہی ہے؟'' نیوان نے اگاتھا سے پوچھا۔
''نہیں..... تم جانتے ہو یہ شیشہ صرف باہر سے اندر کا منظر دکھاتا ہے اندر سے باہر کا نہیں وہ تو صرف تم ہی ایک روح ہونے کے ناطے دیکھ سکتے ہو۔''
''ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو اس وقت ڈاکٹر بی شپ غصے میں ہے کیونکہ اس کی مرضی کے خلاف یہ لوگ تمہیں لے جانے آئے ہیں اور انہوں نے تمہارے لے جانے والے ضروری کاغذات بھی اسے دیئے ہیں۔''
''تم کیا سمجھتے ہو' کیا یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے؟'' اگاتھا نے پوچھا۔
''ہاں..... ڈاکٹر بی شپ اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔'' نیوان نے اگاتھا کو سمجھایا اور اسی وقت گیری نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں کی ایک موٹی فائل اپنے ساتھ کمرے کے باہر کھڑے ہوئے ڈاکٹر بی شپ کو تھمادی۔
''تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو وہ اب بھی پاگلوں کی طرح ناچ رہی ہے۔'' ڈاکٹر بی شپ نے دیوار میں لگے شیشے کی طرف اشارہ کیا جہاں اگاتھا اکیلی رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔
''کیا اسے اسٹریٹ جیکٹ پہنانا بہت ضروری تھا..... میرا مطلب ہے اس عمر میں وہ کسی کو کیا نقصان پہنچا سکے گی۔'' تھریسیا نے کہا جو گیرن کی ساتھ وہاں آئی تھی۔
''پچھلے منگل کو اگاتھا نے میرے ایک ٹرینی ڈاکٹر کا گھٹنہ توڑ دیا تھا اور دوسرے کے بازو کی ہڈی اتار دی تھی وہ اس وقت دوا کی ان گولیوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے جو اگاتھا نے کھانے کی بجائے چھپا دی تھیں اس نے یہ گولیاں صوفے کے کشن کے نیچے چھپائی تھیں۔''
''بھلا جیکٹ پہنے پہنے وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے اس کے بازو تو بندھے ہوئے ہیں۔'' تھریسیا نے کہا۔
''اس نے اپنے ننگے پیروں سے یہ کام کیا تھا خدا جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔'' ڈاکٹر بی شپ نے کہا۔
''تم نے اس کی رہائی کے کاغذات دیکھ لیے؟'' گیری نے ڈاکٹر سے پوچھا۔
''ہاں......دیکھ لیے۔''
''ٹھیک ہے اب تم اس کی اسٹریٹ جیکٹ کی چابیاں مجھے دے دو۔'' گیری نے کہا۔
''کیا کسی نے اسرائیلی سفارت خانے کو بتا دیا ہے کہ اگاتھا کو رہا کیا جا رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا اور گیری نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔
'اگاتھا کو انہوں نے ہی یہاں رکھا ہوا تھا...... تم احمقوں نے اس کی کیس فائل بھی پڑھی ہے؟ اس نے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اسرائیلی وزیراعظم کے باڈی گارڈ پر حملہ کیا تھا وہ وزیراعظم کو اغوا کرنا چاہتی تھی اور اغوا کر کے ہیگ لے جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ بہت سے جنگی جرائم کا مرتکب ہوا تھا...... یہ جنونی ہے' پاگل ہے' نفسیاتی ہے' اس کے اندر وہ ساری علامات ہیں جو کسی جنونی اور خبطی میں ہوتی ہیں اور وہ عقل سے بالا حرکتیں کرتی ہے وہ اکثر زور زور سے باتیں کرتی ہے اور یوں ظاہر کرتی ہے جیسے وہ جان لینن' یا جولیس سیزر سے باتیں کر رہی ہو اس پر اکثر ایسے دورے پڑتے ہیں۔ ایک سال سے اس کا علاج ہو رہا ہے لیکن اس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔''
''اگر تم کوئی اعتراض کرو گے تو میرے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔'' گیری کے کمرے کے دروازے کے باہر رکھی ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں کچھ دوائیں ایک سرنج اور اسٹریٹ جیکٹ کی چابی رکھی تھی۔
''میں یہ سرنج استعمال کروں گا جو تم اگاتھا کو بے ہوش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہو۔'' گیری کی بات پر

ڈاکٹر مزید برہم ہو گیا تھا۔

"مجھے اسرائیلی سفارت خانے سے بھی اجازت لینا ہو گی اگر مجھے وہاں سے تسلی بخش جواب نہیں ملا تو اسرائیلی حکومت سے رابطہ کرنا پڑے گا اور ان کے وکیلوں کے ذریعے تمہیں سبق سکھانا ہو گا۔" ڈاکٹر نے غصے سے کہا اس کی بات پر گیری طنزیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

"تمہارے اتنے محتاط ہونے کے لیے میں تمہارا مشکور ہوں ڈاکٹر۔" گیری نے کہا۔

"ہم خود اس کا کیس ہینڈل کر لیں گے ہمارے پاس ہماری حکومت کی اجازت ہے۔" تھریسیا نے کہا۔

پھر جب تھریسیا اور گیری سیکورٹی یونٹ میں داخل ہوئے تھے تب اگا تھا رقص نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنے صوفے پر پُرسکون انداز میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی اس نے میز پر رکھی کیتلی سے تین کپوں میں چائے انڈیلی اور اس کام کے لیے اس نے اپنے پیروں سے مدد لی تھی کیونکہ اس کے بازو تو اسٹریٹ جیکٹ میں بندھے ہوئے تھے وہ پیروں کی انگلیوں سے اتنی مہارت سے کپوں میں چائے ڈال رہی تھی جیسے کسی ماہر کرتب باز نے اسے یہ کرتب سکھایا ہو۔

"ہیلو اگا تھا...... میں گیری ڈیول ہوں...... میرا خیال ہے تم میری ساتھی تھریسیا کو جانتی ہو گی۔"

"بیٹھ جاؤ تم لوگ۔" اگا تھا نے آہستہ سے کہا اس کی آواز میں بلا کی سنجیدگی تھی کہ گیری کو حیرت ہوئی تھی کوئی نفسیاتی مریض اتنی سمجھداری اور سنجیدگی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔

"ہیلو تھریسیا...... اگر تمہارے پاس میری اس جیکٹ کی چابی ہے تو مہربانی کر کے اسے کھول دو تاکہ میں تمہیں چاکلیٹ بھی پیش کر سکوں۔" اگا تھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں تمہیں اس قید تنہائی سے آزادی دلوانے آیا ہوں؟" گیری نے مسکراتے ہوئے اگا تھا سے پوچھا۔

"مجھے میرے ملنے والی یہاں آ کر نہیں ملتے اور پھر تم نے آفس کا کورٹ پہنا ہوا ہے اور تم مجھے کوئی ماہر نفسیات بھی نہیں لگ رہے ہو۔" اگا تھا نے آہستہ آہستہ کہا۔

"تم نے پہلے سے تین کپ تیار کیے ہوئے ہیں تمہارا اندازہ بہت تیز اور درست ہے۔" تھریسیا نے کہا جس پر اگا تھا صوفے سے پشت لگا کر بیٹھ گئی اور بغور گیری اور تھریسیا کو دیکھنے لگی پھر اس نے پیروں سے پکڑا ہوا کپ گیری کی طرف بڑھایا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ چائنیز تھی اور تمہاری خون میں چائنیز خون شامل ہے۔" اگا تھا نے بغور گیری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ایسکس میں پیدا ہوئے...... تم نے ہانگ کانگ کی رویئل فورس میں بھی ملازمت کی اور کافی عرصے بعد تم یو کے واپس آ گئے اور یہاں پولیس کا محکمہ جوائن کر لیا اور میرا خیال ہے کہ تمہارے تجربے کے مقابلے میں تمہارا عہدہ خاصا چھوٹا ہے۔"

"تھینک یو ماسٹر نوسٹرا ڈیموس۔" گیری نے طنزیہ انداز میں اگا تھا سے کہا۔

"میں برا نہیں مانتی گیری...... مجھے خوشی ہے کہ یہاں مارگریٹ نہیں آئی آزاد کروانے کے لیے۔"

"وہ ریٹائر ہو چکی ہے۔" گیری نے بتایا' مارگریٹ گیری ہی کے ڈیپارٹمنٹ میں تھی اور عرصہ ہوا ریٹائر ہو چکی تھی وہ اگا تھا کی ساتھی تھی جب اگا تھا اس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی۔ "میں سیکشن کا نیا ہیڈ ہوں۔"

"وہ جہاں بھی ہو گی کچھ اچھا ہی کر رہی ہو گی میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔" اگا تھا نے کہا اور پھر اپنی اسٹریٹ جیکٹ کی طرف دیکھا۔ "یہ کب تک یونہی مجھے جکڑے رہے گی؟" اگا تھا کی بات پر گیری نے تھریسیا کو اشارہ کیا تھا اور اس نے آگے بڑھ کر جکٹ کو ان لاک کرنا چاہا لیکن وہ خود اتر کر نیچے گر گئی تھی اور گیری نے پیر کی ٹھوکر سے اسے کمرے کے کونے کی طرف اچھال دیا تھا۔

"اگر تم اسے یونہی اتار سکتی تھیں تو ہمارا انتظار کیوں کرتی رہیں؟" تھریسیا نے کہا۔

"اگر میں پہلے ایسا کرتی تو آرڈر ملنے پر ملازمین مجھے دوبارہ اس جیکٹ میں قید کر دیتے انہیں بار بار یہاں آنا پڑتا جبکہ مجھے ان کا یہاں آنا بالکل پسند نہیں ہے۔ یہاں موجود زیادہ تر مریض نفسیاتی نہیں ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" گیری نے ایک بیگ اگا تھا کو

دیتے ہوئے کہا بیگ میں اگاتھا کا وہ لباس تھا جو اس نے وہاں آتے وقت پہنا ہوا تھا۔

"شکر ہے کافی عرصے بعد میں کوئی ایسا لباس پہنوں گی جس نے پیچھے سے میرے ہاتھ جکڑے ہوئے نہیں ہوں گے۔" اگاتھا نے کہا اور کپڑے لے کر کمرے میں موجود واش روم کی طرف بڑھ گئی کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئی تو گیری کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"تم نے یہ ذمہ داری لے تو لی ہے لیکن کیا تم نے ایک رسی کا بھی مطالبہ کیا ہے انتظامیہ سے؟" اس نے پوچھا۔

"رسی کا مطالبہ؟" گیری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں رسی کا...... جو تمہاری پسند اور تمہاری مرضی کی ہو اور جس سے بعد میں تم خود کو لٹکا بھی سکو۔" اس کی بات پر گیری اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

"پروا مت کرو...... اگر تمہیں رسی سے لٹکنا نہیں آتا تو میں تمہاری مدد کردوں گی میں بہت اچھی گرہیں لگانا جانتی ہوں۔" اس نے مذاق کرنے والے انداز میں کہا۔

"تم اتنا سب کچھ کرنے کے بجائے ایک کام کردو مجھے قاتل کا نام بتادو۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے کیوں نہ ہم یہاں سے جلدی نکلیں اور تمہیں تمہارے گھر پہنچادیں اس سے پہلے کہ ڈاکٹر بی شپ تمہیں اس سینٹر میں مزید قید رکھنے کا کوئی منصوبہ بنالے۔" گیری نے کہا۔

"میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔" اگاتھا نے کہا اور وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے تھے۔



گھر پہنچنے کے بعد اگاتھا نے کچھ دیر آرام کیا تھا گیری اسے دوسرے دن آفس پہنچنے کا کہہ کر چلا گیا تھا وہ جب گھر پہنچی تو غیر متوقع طور پر گھر بالکل صاف ستھرا تھا اور گرم گرم کھانا بھی ٹیبل پر موجود تھا اسے نیوان کی موجودگی کا احساس ہوا وہ ہمیشہ ہی اس کے آرام کا خیال رکھتا تھا۔

"میں جانتی ہوں تم یہاں موجود ہو۔" اگاتھا نے سرگوشی میں کہا اور تب ہی میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر نیوان اسے بیٹھا نظر آیا وہ حسب معمول اپنی رائل ایئر فورس کے یونیفارم میں ملبوس تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم گھر آؤ اور اتنے عرصے بعد تمہیں یہاں خوش آمدید کرنے والا کوئی نہ ہو گھر کی صفائی تمہارا پسندیدہ گرم گرم کھانا اور تمہارے لیے آرام دہ بستر میری طرف سے ایک حقیر تحفہ ہے۔" نیوان نے کہا اور اگاتھا مسکرادی اس نے کپڑے تبدیل کرکے کھانا کھایا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی لیکن نیوان بھی اس کے ساتھ موجود تھا وہ کافی دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی اور پھر نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

جب وہ سو کر اٹھی تو شام اپنے پر پھیلا رہی تھی نیوان ایک گل دان میں پھول سجا رہا تھا اس نے مسکرا کر اگاتھا کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے اگاتھا آخر مسائل ہمیں ڈھونڈھ کر ہم تک پہنچ ہی جاتے ہیں اس میں پولیس کے محکمے میں تمہاری ماضی کی شہرت کا بہت ہاتھ ہے۔"

"نہیں نیوان...... میں ایسا نہیں سمجھتی میرا خیال ہے لوگ میرا نام بھی بھول گئے ہوں گے اور وقت بہت ظالم ہے ہر چیز کے آثار ونشانات مٹا دیتا ہے کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑے زبردست کارنامے انجام دیئے ہیں جو مدتوں یاد رکھے جائیں گے لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ سب کچھ مٹ جاتا ہے لوگ سب بھول جاتے ہیں۔" اگاتھا کے لہجے میں اداسی تھی۔

"لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا لوگ اتنی جلدی ہمیں نہیں بھول سکیں گے۔" نیوان نے کہا وہ ہوا میں تیرنے کے انداز میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس بار انہیں صرف ہمارے اوپر انحصار کرنا ہوگا۔" نیوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیشہ کی طرح وہ کیس مجھ پر چھوڑ دیں گے۔"

"تمہارا جیسا کوئی اور ہے بھی تو نہیں اگاتھا۔" نیوان نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرا شوہر تھا...... میرے بچے تھے...... بالکل مجھ جیسے۔" اگاتھا نے دکھ سے کہا۔

"لیکن اب وہ نہیں ہیں...... انہیں یاد کرکے خود کو

اداس مت کرو۔" نیوان نے سمجھایا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم میرے ساتھ ہو ورنہ میں تو تنہائی کے خوف ہی سے مر جاتی۔" اگاتھا نے کہا۔ "اگر تم نہ ہوتے تو میں کیا کرتی؟" اگاتھا نے کہا اور میز پر رکھے کاغذات اٹھالے جو کیس کے متعلق تھے اور گیری نے اسے پڑھنے کے لیے دیئے تھے۔

کیس کی تفصیلات پڑھنے کے بعد اگاتھا نے ان پر نیوان سے بھی بات کی تھی جس میں اس نے دلچسپی لی تھی۔

"ایک مقتول امیر امریکی۔" نیوان نے زیرلب کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پرانے دن اچھے تھے جب لوگ اپنے پاس زہر چھپا کر رکھتے تھے اور Slow poisning کے ذریعے لوگوں کو مار دیتے تھے۔"

"نیوان اگر ہم حال اور ماضی کی بحث میں الجھ گئے تو مستقبل ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔' اگاتھا نے کہا۔

"ٹھیک ہے......تو تم نے کہا کہ وہ امیر آدمی......یعنی سائمن ورک کو قتل کیا گیا لیکن وہ تو چھت میں لٹکتا ہوا ملا تھا جس کا مطلب ہے اس نے خودکشی کی تھی' یہ قتل کیسے ہوسکتا ہے؟"

"جب میں کل آفس جاؤں گی تب ہی درست بات کہہ سکوں گی۔" اگاتھا نے کہا۔ "اور ہوسکتا ہے اس بار مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ پولیس آفس سے مجھے ایک اسسٹنٹ ملا ہے جو میرا مددگار ہوگا۔"

"ٹھیک ہے یوں سمجھو کہ ایک کھرب پتی مرچکا ہے ہوسکتا ہے اسے اس کے دشمنوں نے مارا ہو تو اس میں کیا خاص بات ہے؟ تمام امیر لوگوں کے دشمن بھی ہوتے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ قتل بھی کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف دولت حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہوگا۔" نیوان نے کہا۔ "وہ دن گئے جب لوگ مذہب کی خاطر یا دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے قتل کیا کرتے تھے اب تو دولت ہی سب کچھ ہے۔"

"خیر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے اس بار شاید تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے۔" اگاتھا نے کہا۔

"تو پھر میڈم اگاتھا اور کون تمہاری مدد کرے گا...... آفس میں موجود جونیئر بچوں کا عملہ جو تمہارے مقابلے میں بہت ناتجربہ کار ہے؟" نیوان نے ہنستے ہوئے کہا تھریسیا' پولیس یا برطانیہ کی سیکرٹ سروس انٹیلی جنس کا عملہ؟"

"بھلا کون سائمن کو مارنا چاہے گا؟" اگاتھا نے فکرمندی سے کہا۔



اگلے روز اگاتھا مقررہ وقت پر برطانوی انٹیلی کی اسپیشل برانچ آفس پہنچ گئی تھی گیری اور تھریسیا اس کے منتظر تھے' گیری نے اگاتھا کا تعارف اسپیڈ سے بھی کروایا تھا اور اسپیڈ نے ایک نئی اطلاع گیری کو دی تھی۔

"گیری تم نے مجھ سے جو فلم مانگی تھی میں نے سیو کرلی ہے یہ فلم تو بلڈنگ سیکیورٹی کیمرہ نے بنائی تھی لیکن وہاں دیواروں میں سائمہ ورک نے بھی خفیہ کیمرے لگائے ہوئے تھے جن میں سے ایک کیمرے سے ہمیں اسی کمرے کی دوسری وڈیو بھی ملی ہے یہ حیرت انگیز ہے یہ دیکھو۔" اسپیڈ نے کہا اور کمپیوٹر میں وہ ویڈیو چلادی۔

فلم میں دو آدمی نظر آرہے تھے جن کے چہروں پر نقاب تھے اور تیسرا شخص سائمن ورک کے جسم کو ان دونوں کی مدد سے لٹکا رہا تھا اسے لٹکانے کے بعد اس کے پیروں کے نیچے سے میز کو ٹھوکر مار کر ہٹایا گیا تھا اس وقت میز کا ایک پایہ ٹوٹ گیا تھا اور سائمن کا جسم فضا میں جھولنے لگا تھا' سائمن کے چہرے پر بھی ایک ماسک تھا پھر تینوں افراد کیمرے کی اسکرین سے غائب ہوگئے تھے' کیونکہ وہاں موجود کھڑکی سے باہر نکل گئے تھے اور کھڑکی اپنے پیچھے بند کردی تھی۔"

"گویا اس کی پراسرار موت کی ہمیں دو ویڈیوز ملی ہیں ایک ظاہر کرتی ہے کہ اس کا قتل کیا گیا اور دوسری ظاہر کرتی ہے کہ اس نے خودکشی کی۔" اگاتھا نے کہا۔ "لیکن ان میں سے کون سی درست ہے؟"

"میں نے بار بار ان ویڈیوز کو چلا کر دیکھا ہے اور میرے مطابق یہ دونوں ٹھیک ہیں کیونکہ سوفٹ ویئر ان دونوں ہی کو درست بتارہا ہے ان میں سے کوئی بھی Fake نہیں ہے۔" اسپیڈ نے کہا۔

"اب میری سمجھ میں آیا کہ تم لوگ مجھے رہا کروا کر کیوں لائے ہو؟" اگاتھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری سمجھ میں کیا آتا ہے؟'' گیری نے اگاتھا سے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو تین وجوہات ہوسکتی ہیں پہلی تو یہ کہ سائمن ورک نے خودکشی کی اور اس نے یا کسی اور نے اس کی موت کو قتل کا کیس بنانا چاہا' دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اسے قتل کیا گیا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ وہ خودخوشی ہے اور تیسری یہ کہ وہ اب بھی زندہ ہو اور دونوں ویڈیوز جھوٹی Fake ہوں۔'' اگاتھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اگر سائمن بلڈنگ سیکورٹی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا تب ہی اس نے اپنے ذاتی خفیہ کیمرے وہاں لگوائے تھے اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے معلوم تھا کہ اسے کسی سے خطرہ ہے۔'' اگاتھا نے کہا۔ ''اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ جب وہ وہاں نہیں ہوتا تو اس کی غیر موجودگی میں وہاں کون آتا ہے؟''

''تم نے جو تیسری صورت حال کی بات کی ہے وہ خاصی حد تک سمجھ میں آتی ہے' میں نے ایک شخص کو DNA ٹیسٹ کے لیے کہا ہے سائمن ورک کا جڑواں بھائی بھی ہے کرٹس ورک' ہمیں یہ تو پتہ ہونا چاہیے کہ مرنے والا کون تھا سائمن یا کرٹس؟'' گیری نے کہا۔

''لیکن بھلا سائمن اپنی موت کو Fake کیوں بنائے گا اور غائب ہوجائے گا؟'' اگاتھا نے حیرت سے کہا۔

''میرا خیال ہے' ہمیں سائمن کے جڑواں بھائی کرٹس سے ملنا چاہیے' میں نے اخبار میں خبر دیکھی ہے کہ کرٹس نے ڈربن میں ہونے والی بزنس کانفرنس میں شرکت سے معذرت کرلی ہے میرا مشورہ ہے کہ ہمیں فوراً ہی کرٹس سے ملنا چاہیے۔'' تھریسا نے کہا۔

''میں اس کا انتظام کرچکا ہوں اس کا گھر سرے میں ہے اور میں ملاقات کا وقت بھی لے چکا ہوں۔''

''مجھے ایک بار پھر سائمن کی خودکشی والی پہلی ویڈیو دکھاؤ۔'' اگاتھا نے کہا اور اسپیڈ نے ویڈیو دوبارہ چلادی۔

''یہاں روک دو۔'' ایک مقام پر اگاتھا تیزی سے بولی اور اسپیڈ نے ویڈیو روک دی۔

''یہ دیکھو...... اس کے پاؤں جس طرح حرکت کررہے ہیں......'' اگاتھا نے کہا۔

''ہاں یوں لگ رہا ہے جیسے لٹکائے جانے کے باوجود وہ زندہ ہو اور تڑپ رہا ہو۔'' گیری نے کہا۔

''اس کی اور بھی کوئی رہائش تھی؟'' اگاتھا نے پوچھا۔

''ہاں' یہ لندن میں ہائیڈ پارک کے علاقے میں رہتا تھا۔'' گیری نے کہا۔

''ہمیں وہاں بھی تحقیقات کرنی چاہیے۔'' اگاتھا نے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن پہلے ہم سائمن کے جڑواں بھائی کرٹس سے ملیں گے۔'' گیری نے کہا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد گیری' اگاتھا' تھریسیا اور اسپیڈ کے ساتھ اپنی کار میں کرٹس ورک سے ملنے روانہ ہوگیا تھا اس کا محل نما گھر زمین کے ایک بہت بڑے خطے پر پھیلا ہوا تھا جس کے چاروں طرف اونچی دیواروں کا ایک احاطہ تھا گھر کے بیرونی دروازے پر دو مرد اور دو خواتین سیکیورٹی کے لیے موجود تھے جنہوں نے نیلے رنگ کی جیکٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھیں' لوہے کے دروازے کی سلاخوں کے پیچھے عمارت کے احاطے کے اندر بھی اسی یونیفارم میں لوگ نظر آرہے تھے گویا یہاں کے مالک کا یہ خود ساختہ سیکیورٹی سسٹم تھا ان کے پاس گنیں موجود تھیں اور وہ نہایت چوکنے اور چابک دست تھے۔ یہ جگہ ہائی وے سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ آس پاس کوئی بستی یا رہائش نظر نہیں آتی تھی اور دور دور تک کی زمین سائمن اور کرٹس ورک کی ملکیت تھی۔

اپنی کار گیٹ کے قریب روک کر گیری انتظار کررہا تھا کہ سیکیورٹی کا عملہ چیکنگ کرلے تو وہ آگے روانہ ہو ایک گارڈ گیری سے اس کا پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس لے کر سیکیورٹی روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور دو گارڈز ہاتھوں میں ایک آلہ لیے کار کے اندر اور باہر کے حصوں کو اسکین کررہے تھے کچھ دیر بعد عمارت کا گیٹ آٹومیٹک سسٹم کے تحت کھل گیا تھا اور گیری کو اس کی چیزیں واپس کردی گئی تھیں اس نے کار آگے بڑھائی تھی۔

''اب فہرست میں ہمارا نام لکھا جاچکا ہے کہ ہم کس وقت عمارت میں داخل ہوئے اور واپسی پر بھی لکھا جائے گا کہ کب واپس گئے۔'' گیری نے کہا کسی نے اس کی بات کا

جواب نہیں دیا تھا۔
''کیا تمہاری کار میں چوروں سے بچاؤں کا کوئی سسٹم بھی ہے؟'' اچانک اگاتھا نے گیری سے پوچھا۔ اس کے جواب میں گیری نے اپنی جیب سے پستول نکال کر ہوا میں لہرایا تھا۔
''اگر کسی نے میری کار پر بری نظر ڈالی تو میں اسی مار ڈالوں گا۔'' اس نے جوش سے کہا۔
''ہوں...... لیکن یاد رکھو اگر کرٹس ورک کے سیکیورٹی گارڈ اپنی ڈیوٹیز سے فارغ ہو کر گھر بھی چلے جائیں تب بھی کرٹس پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں ہو سکتا۔'' اگاتھا نے کہا۔
''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا یہ بھی تمہیں تمہارے نیوان نے بتایا ہے جو ہر لمحے تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور تمہاری معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے؟'' گیری نے مزاحیہ انداز میں کہا۔
''یہ کامن سینس کی بات ہے گیری...... میں نے دونوں بھائیوں کے معمولات زندگی کو چیک کیا ہے کسی کے لیے دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ قتل کر دینا بہت آسان تھا اور اس کو بڑے آرام سے کسی حادثے کا نام دیا جا سکتا تھا ایک خرچے میں دو کام ہو سکتے تھے وہ حادثہ کسی کار یا جہاز کا حادثہ بھی ہو سکتا تھا۔ زہر دینے کا ہو سکتا تھا' اغوا کا ہو سکتا تھا۔'' اگاتھا بول رہی تھی۔
''ہو سکتا ہے کسی کا پلان دونوں کو الگ الگ قتل کرنے کا ہو۔'' گیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں قتل کی وارداتوں میں کچھ وقفہ دینا چاہتا ہو؟''
''اب گیری کے جڑواں بھائی کو خطرے کی بو سونگھ لینا چاہیے اور اپنی سیکورٹی بڑھا دینا چاہیے۔''
''سیکیورٹی تو بہت سخت ہے ابھی ہم نے دیکھا ہے۔'' گیری نے کہا۔
''اگر مارنے والوں کا مقصد دولت حاصل کرنا ہے تو سائمن ورک کا قتل کرٹس کے لیے ایک وارننگ ہے کہ وہ اسٹاک مارکیٹ سے دستبردار ہو جائے یا اپنے شیئرز کسی کو بھی بیچ کر اپنی جان چھڑا لے۔ اسے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ جہاں بھی ہوگا قاتلوں کی پہنچ میں ہوگا اور وہ اس کی موت کو بھی ایک حادثہ ظاہر کریں گے۔'' گیری نے کہا۔
''یہ تو تمہارا خیال ہے۔'' اگاتھا بولی۔
''تم اور تمہاری نیوان کی روح اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟'' گیری نے پوچھا۔ ''کیا نیوان کو کوئی ایسی بات پتا چلی ہے کہ کرٹس کو بھی قتل کیا جانے والا ہے؟'' گیری نے اگاتھا کا مذاق اڑایا۔
''گیری میں جانتی ہوں تم موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔'' اگاتھا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔
''نہیں...... میں واقعی یقین نہیں رکھتا...... بتاؤ دنیا میں ہزاروں لوگ مرتے ہیں تمہارا رابطہ صرف اور صرف مشہور شخصیات کی روحوں سے ہی کیوں ہوتا ہے؟''
''اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔'' اگاتھا نے کہا۔ ''روحیں میری مرضی سے مجھ سے رابطہ نہیں کرتیں وہ اس سلسلے میں بااختیار ہوتی ہیں۔'' اگاتھا نے جواب دیا۔
اسی وقت گیری نے اپنی کار ایک تین منزلہ بلند و بالا عمارت کے سامنے روک دی تھی اور کار سے باہر آ گیا تھا' اس کے ساتھ باقی افراد بھی کار سے باہر آ گئے تھے اور مسحور کن انداز میں عمارت کے اطراف لگے ہوئے خوبصورت باغات کو دیکھ رہے تھے۔
''بہت خوبصورت باغات ہیں۔'' تھریسا نے کہا۔
''ہاں...... ان کی دیکھ بھال پر خرچ بھی بہت آتا ہوگا۔'' اسپیڈ نے جواب دیا۔ وہ لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عمارت کے صدر دروازے تک پہنچے تھے اور پھر اگاتھا نے بیل بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا تھا ان کے سامنے ایک ملازم بہترین یونیفارم میں موجود تھا جس نے سر کے اشارے سے انہیں اندر آنے کے لیے کہا تھا اور ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو کان سے لگا لیا تھا۔
''وہ پہنچ گئے ہیں...... تعداد میں چار ہیں...... دو مرد اور دو خواتین...... کار اب خالی ہے اس میں کوئی ڈرائیور نہیں ہے۔'' ملازم نے فون پر بات کرتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا جہاں کاؤنٹر کلرک ایک رجسٹر کے ساتھ موجود تھا گیری اور اس کے ساتھیوں نے باری باری رجسٹر پر دستخط کیے تھے۔ ملازم نے صدر دروازہ بند کر دیا تھا اور

انہیں اپنے ساتھ لے کر ایک بڑے ہال تک لے گیا تھا جہاں پہلے سے سفید بالوں والا ادھیڑ عمر شخص موجود تھا جس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اس نے اپنا تعارف ان لوگوں سے کروانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ آدھا گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیں گے کرٹس ورک کو اور بھی مہمانوں سے ملنا ہے چنانچہ وقت کا خاص خیال رکھیے گا۔'' اس نے بغیر تمہید کے کہا۔

''اور میرا تم سے یہ کہنا ہے کہ تم ہم سے دور رہنا اور جب تک ہم کرٹس سے ملنا چاہیں ملنے دینا' بیچ میں مداخلت مت کرنا جب تک مجھے میرے سارے سوالوں کا جواب نہیں مل جاتا' یہ ایک قتل کے کیس کی انکوائری ہے سمجھے؟'' گیری نے غصے سے کہا۔

''تمہیں ہمارے اصولوں کو ماننا ہوگا۔'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''تمہارا کام مالک کی حفاظت کرنا ہے چنانچہ وفادار کتوں کی طرح اپنا کام کرتے رہو بس۔'' گیری نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے اس بے کار کی بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے۔'' اگاتھا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ادھیڑ عمر شخص انہیں ایک بڑی سی لائبریری میں چھوڑ گیا تھا اور تھریسیا نے لائبریری کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا' کمرے میں چاروں طرف دیواروں میں کتابوں کے لیے الماریاں بنی ہوئی تھیں جن کے شیشوں سے کتابیں جھانک رہی تھیں درمیانی دیوار کے ساتھ ایک ٹیبل اور چند کرسیاں رکھی تھیں ٹیبل پر کمپیوٹر موجود تھا اور ایک کرسی پر کرٹس ورک بیٹھا تھا اور اس کی نظریں اپنے سامنے موجود کھڑکی سے باہر لان کا منظر دیکھ رہی تھیں اس کے چہرے پر اداسی نمایاں تھی۔ اس نے گھر کا عام سا لباس پہنا ہوا تھا اور لائبریری میں اس کے ساتھ کوئی سیکرٹری یا باڈی گارڈ موجود نہیں تھا گیری اور اس کے ساتھیوں کو اندر آنے پر اس نے سر اٹھا کر ایک نظر دیکھا تھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا۔

''آپ ہی لوگ اسپیشلسٹ کی ٹیم ہیں جو حکومت برطانیہ کی طرف سے اس کیس پر مقرر کی گئی ہے؟'' کرٹس نے پوچھا تو گیری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ لوگ بیٹھیں۔'' کرٹس نے نرم لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے آپ لوگ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں لیکن پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میرے بھائی کی موت کو قتل کیوں سمجھتے ہیں کیا آپ کو کوئی ثبوت ملا ہے جبکہ میرا خیال ہے کہ اس کی موت ایک ناگوار حادثہ ہے۔'' کرٹس نے کہا۔

''معاف کرنا اس کی موت پر تم مجھے زیادہ اپ سیٹ نہیں لگ رہے ہو۔'' اسپیڈ نے کہا جو بہت دیر سے خاموش تھا۔

''مجھے برطانوی سول ملازم کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' کرٹس نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میں سائمن سے کتنی محبت کرتا ہوں' ہم ایک دوسرے سے اتنا ہی قریب تھے جتنا کہ اس دنیا کے کوئی بھی جڑواں بھائی ہوسکتے ہیں لیکن ہم دونوں کے لیے اپنے اپنے کام زیادہ اہمیت رکھتے تھے' ہم نے سب کچھ مل کر ایک ساتھ ہی بنایا ہے' میں نہیں جانتا کہ اب آگے حالات کیا ہوں گے اس کی موت کی خبر جب دنیا کو ملے گی تو وہ اسے ایک بڑے اداکار کی موت کی طرح منائیں گے یا پھر ایک اہم کاروباری شخصیت کے طور پر......؟'' کرٹس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔'' اگاتھا نے آگے بڑھ کر کہا اور کرٹس حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب......تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' کرٹس نے پوچھا۔ ''اور میں تم لوگوں سے اس بات کی وضاحت بھی چاہتا ہوں کہ تم سائمن کی موت کو قتل کیوں سمجھتے ہو؟''

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں ہماری بات سے اختلاف ہوگا اور تمہیں یہ بات قصے کہانیوں جیسی لگے گی لیکن اس ملاقات میں تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہیں ہمیں تمہارے سوالوں کے جواب نہیں دینا۔'' گیری نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لندن میں ہمارے اپارٹمنٹ کی ویڈیو کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے' میں نے دیکھا ہے کہ میرے بھائی کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے اور یہ قتل تھا تو یقیناً یہ کوئی چال ہوگی۔'' کرٹس نے کہا۔

''ہاں' تمہارے پاس بھی ویڈیو کی کاپی ہے' میرے پاس بھی ویڈیو کی کاپی ہے۔'' گیری نے کہا۔ ''لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے ہمیں مجرموں تک پہنچنے کے لیے مزید ثبوت درکار ہوں گے' میں ایک اور بات جاننا چاہتا ہوں مسٹر ورک کیا سائمن کے مرنے کے بعد تم دونوں کے کاروبار پر اثر پڑے گا؟'' گیری نے پوچھا۔

''یقیناً اثر پڑے گا۔'' کرٹس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''جیسے ہی سائمن کی موت کی خبر نشر ہوگی زیادہ دولت مند لوگ ہماری کمپنی کے شیئرز سستے داموں خرید لیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے کاروبار کے ذریعے اسٹاک ایکسچینج پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہو؟'' تھریسیا نے کہا۔

''ہاں' لیکن ہم دونوں بھائی مل کر اس پر کام کرتے تھے۔ سائمن کبھی بھی اسٹاک کو میرے اوپر نہیں چھوڑتا تھا وہ اپنی دولت کا زیادہ حصہ رضا کار تنظیموں کو بانٹ دیتا تھا جب ہم نے کمپنی بنائی تھی تو ہم دونوں نے ایک معاہدہ کیا تھا کہ ہم اپنے کاروبار کو بھی اپنے رشتے کے درمیان نہیں آنے دیں گے۔ کاروبار میں پیسہ بھی آدھا لگائیں گے اور منافع بھی آدھا آدھا ہی لیں گے۔'' کرٹس نے کہا اور میز پر رکھا انٹرکام اٹھا کر کافی کا آرڈر دیا۔

''میں اس وقت کافی لینا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر وہ گیری کی طرف مڑا۔ ''آپ لوگ کافی لیں گے؟'' اس نے پوچھا اور گیری نے اثبات میں سر ہلایا جس پر اس نے پانچ کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔

''کیا تم نے اپنی وصیت تیار کرلی ہے؟'' گیری نے پوچھا۔

''سائمن نے شادی نہیں کی تھی' لیکن میری بیوی اور بچے ہیں۔ میری آمدنی کا زیدہ حصہ تو رضا کار تنظیموں کو چندے کے طور پر نکل جاتا ہے' بیوی بچوں کے حق کے لیے میں نے کاغذات بنوا دیئے ہیں جو وقت آنے پر انہیں مل جائیں گے۔''

''اچھی پلاننگ ہے۔'' اگاتھا نے کہا۔

''پیسہ' ہم دونوں بھائیوں کے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا ہم دونوں پچیس برس کے تھے تب ہی کھرب پتی بن گئے تھے اگر ہم اپنی دولت کو شراب' نشے' جوئے اور عورتوں میں ضائع کرتے تو اب تک ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئے ہوتے لیکن ہم دونوں نے اپنے اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھی اور کاروبار کو آگے بڑھاتے رہے اگر کوئی بلاوجہ ہمارے کاروبار کو حددرجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو ہمارے سامنے اس کے علاوہ کیا چارہ رہ جائے گا کہ ہم میز پر چڑھ کر اپنی گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیں۔'' کرٹس نے منہ بنا کر کہا۔

''آپ کا کاروبار آپ کے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے؟'' اسپیڈ نے کہا جس پر کرٹس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں میرے لیے ہی نہیں بلکہ میرے بھائی سائمن کے لیے بھی' ہم دونوں نے مل کر اپنے اس کاروبار کی انوکھی دنیا بنائی تھی۔'' کرٹس نے کہا اور اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی' ملازم نے دروازہ کھولا اور ایک شخص چائے کی ٹرالی کے ساتھ لائبریری میں داخل ہوا' ٹرالی میں چائے اور کافی دونوں موجود تھیں اور اس کے ساتھ مختلف فلیور کے بسکٹ تھے۔

''آپ کی کمپنی Space Werks کا کاروبار کن کن ممالک میں ہے؟'' گیری نے پوچھا۔

''تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں لیکن وہ ہر ملک میں مختلف نوعیت کے ہیں ہم انڈیا سے چائے گرم مصالحوں وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں' روس میں ہم مختلف مقامات پر سیاحوں کو لانے لے جانے کا کاروبار کرتے ہیں' چائنا میں ہم ان کے ساتھ مل کر کمیونیکشن سیٹلائٹس کا جال بچھا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''بہت ممکن ہے کہ تمہارے کاروباری حریف میں کوئی تمہارا دشمن ہو اور اس نے ہی سائمن کو قتل کیا ہو۔'' گیری نے کہا جس پر کرٹس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا' تمام تجارتی فرموں میں ہمارا اتنا پیسہ لگا ہوا ہے کہ وہ ہمارا نقصان برداشت نہیں کرسکتے۔ روس اور

چائنا کی سیکرٹ سروسز خود ہماری حفاظت کے لیے ایجنٹس بھیجتی ہیں وہ ہماری حفاظت کرتی ہیں' ہمیں نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''اور اپنے امیر جڑواں بھائیوں کو کسی قسم کی کوئی وارننگ نہیں ملی' نہ سائمن کی موت سے پہلے اور نہ بعد میں؟'' گیری نے پوچھا۔

''ہم قسمت پر بھروسہ رکھتے ہیں ہمیں سال بھر میں بے شمار دھمکیاں ملتی ہیں لیکن وہ اب ہمارے لیے معمول کا حصہ بن گئی ہیں اور ان دھمکیوں کے ساتھ مطالبات کی بھی لمبی فہرست ہوتی ہے جنہیں پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اگر تم چاہو تو میں اپنی فرم کے فرسٹ سیکرٹری سے کہہ کر تمہیں ایسی ساری دھمکیوں کی میل بھجوادوں گا۔''

''عام زندگی میں تم اپنے بھائی سے کتنے قریب تھے؟'' اگا تھا نے پوچھا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے کوئی قتل کی دھمکی ملی ہو جس کا ذکر اس نے تم سے نہ کیا ہو؟''

''جہاں تک ہمارے سسٹم کنٹرول ورکس کا تعلق ہے میں تمام کاروباری معاملات سنبھالتا ہوں جبکہ سائمن ٹیکنالوجیکل معاملات کو دیکھتا تھا لیکن جو کام میں کررہا ہوتا تھا اس میں بھی تقریباً =/70 اس کی دلچسپی ہوتی تھی دراصل ہم الگ الگ میدانوں میں کام کرنے کے باوجود ایک دوسرے کی مدد بھی کررہے ہوتے تھے۔''

''اور ذاتی مزاج کے بارے میں کیا کہو گے' تم دونوں کے مزاج میں کچھ فرق تھا؟'' گیری نے پوچھا۔

''میرے مقابلے میں سائمن خود کو لوگوں سے الگ تھلگ رکھتا تھا' پارٹیوں میں بہت کم شرکت کرتا تھا' فلمیں اور فنکشنز بھی اس کے لیے غیر دلچسپ ہوتی تھیں' ہم زیادہ تر اپنے اسٹاف سے کام لیتے تھے سائمن مجھ سے زیادہ وقت کام کو دیتا تھا جبکہ میں اپنا زیادہ وقت اپنی بیوی اور بچوں کو دیتا ہوں' میں اسے بھی مشورہ دیتا تھا کہ اسے اب شادی کرلینا چاہیے تاکہ اس دنیا سے نکل سکے جو اس نے اپنے گرد بنائی ہوئی ہے۔''

''کوئی ایسا شخص جسے حال میں تمہارے بھائی نے ملازمت سے نکالا ہو؟'' گیری نے پوچھا۔ ''کوئی ایسا شخص جسے معلوم ہو کہ لندن میں تمہارے اپارٹمنٹ میں سیکیورٹی سسٹم کہاں کہاں موجود ہے؟''

''ہم ملازمت دیتے وقت بہترین لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اس کے بعد انہیں بہترین ٹریننگ دیتے ہیں اور پھر ان کی چوائس پر انہیں ایسے محکمے میں ملازمت دی جاتی ہے جس میں انہیں زیادہ دلچسپی ہو چنانچہ اپنے ملازمین کو کھونا ہمارے لیے بہت مہنگا پڑتا ہے' میری کوشش ہوتی ہے کہ ہم کمپنی میں کم سے کم ملازمین بھرتی کریں چنانچہ کسی کو نکالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ہاں کچھ لوگ اپنی ہی کسی مجبوری سے ملازمت چھوڑ جائیں تو الگ بات ہے لیکن ایسا ابھی بہت کم ہوتا ہے۔''

''بہرحال سائمن کے قتل کی وجوہات کچھ بھی ہوں میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اور تمہاری فیملی کو بھی خطرہ ہے اور تمہیں اپنی حفاظت کا انتظام کرنا چاہیے۔'' اگا تھا نے کہا۔

''وہ ہم کرچکے ہیں' میں نے ایک پرائیویٹ کمپنی کی سیکیورٹی فورس کی ڈیوٹی اپنے ذاتی گھر پر لگادی ہے ویسے تو میں نے ان کی کارکردگی کے معاملے میں معلومات کروالی ہے لیکن اگر پھر بھی میں مطمئن نہ ہوا تو تمہاری گورنمنٹ کی سیکیورٹی کی خدمات حاصل کرنے کے لیے انہیں پیشگی بل بھجوادوں گا۔'' کرٹس نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے ہم براہ راست یہ سوال کرلیں کہ تمہارے خیال میں کون تمہارے بھائی کا قاتل ہوسکتا ہے؟ یا تمہیں کس پر شک ہے؟'' گیری نے پوچھا۔

''حقیقت میں پوچھو تو مجھے کسی پر بھی شک نہیں ہے' اگر یہ معاملہ کاروباری ہوتا اور کسی ترقی پذیر ملک میں ہمارا سولر سسٹم لگاتے ہوئے پیش آتا یا سائمن اغوا ہوجاتا اس کا پرس چوری ہوجاتا یا اغوا ہونے کی کوشش میں جدوجہد کرتے ہوئے اسے گولی لگ جاتی تب تو یقین کیا جاسکتا تھا لیکن ہمارے ہی ملک میں...... لندن میں...... اس کے اپارٹمنٹ میں...... اس کے اپنے آفس میں؟ میں نہیں مان سکتا اس کی موت کو میں صرف ایک حادثہ سمجھتا ہوں قتل نہیں۔'' کرٹس نے کہا۔ ''اگر ایسا نہیں ہوتا تو برطانوی انٹیلی جنس فورسز کے لوگ اس کے قاتلوں کو جنگلوں' دفتروں' سڑکوں پر ہر جگہ ڈھونڈ رہے ہوتے' ہمارا کوئی ملازم بھی تفتیش سے نہ بچتا۔''

''ٹھیک ہے......اب ہم لوگ واپس جا رہے ہیں لیکن تمہارے لیے مشورہ ہے کہ تم بلا ضرورت شہر سے نہ جانا اور اگر جانا بہت ضروری ہو تو جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرنا' تفتیش کے دوران کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' کیری نے کہا تو کرٹس نے اثبات میں سر ہلایا اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

❁......❁......❁

کیری نے آفس پہنچنے کے بعد تھریسیا اور اسپیڈ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ سائمن ورک کے لندن میں موجود ذاتی فلیٹ پر جائیں اور وہاں سے کچھ تصاویر وغیرہ جمع کریں جن سے تفتیش میں مدد مل سکے' لندن کا یہ فلیٹ ہائیڈ پارک کے قریب واقع تھا اور اس کی کھڑکیوں سے ہائیڈ پارک اور سڑک کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

''یہ فلیٹ تو قیمتی اور نادر چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔'' تھریسیا نے اندر پہنچنے کے بعد فلیٹ میں موجود چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ قیمتی نمونے مختلف الماریوں' شیلف' شیشے کے کیسوں میں سجے ہوئے تھے' جنہیں قیمتی دھاتوں سونا' چاندی' پلاٹینم وغیرہ سے بنایا گیا تھا مارکیٹ میں ان کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں تھی' فلیٹ کی ہر چیز سے امارت جھلکتی تھی۔

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں کوئی کمپیوٹر سسٹم بھی چھپا ہوا ہے میں پہلے اسے ڈھونڈنا چاہوں گا۔ شاید وہاں سے ہمیں کچھ معلومات مل سکیں۔'' اسپیڈ نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو اور میں ان نوادرات کا جائزہ لیتی ہوں۔'' تھریسیا نے کہا اس کے بعد وہ ان نوادرات کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصویریں بھی اتارتی رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے نوادرات جمع کرنے والوں کی دو اقسام ہوتی ہیں ایک تو وہ جو کسی ماہر کے ذریعے نوادرات خریدتے ہیں اور دوسرے وہ جو نوادرات خریدنے کے لیے انہیں خود پسند کرتے ہیں وہ اس کے رسالوں' اخباروں اور نوادرات بیچنے والے اداروں کی کتابیں دیکھتے ہیں اور پھر انہیں خریدتے ہیں اگر تم ذرا سا اندازہ لگاؤ تو صرف نوادرات کے سجانے کے انداز سے پتہ لگا سکتے ہو کہ اس کا مالک کس شخصیت کا حامل ہے۔''

''اگر کوئی اپنے نمائندے کو ذمہ دار بنا کر نوادرات کی خریداری کرواتا ہے تو انہیں وہ گھر میں سامنے کے حصے میں نمایاں جگہ پر سجاتا ہے تاکہ ہر کوئی دیکھے اور تعریف کرے لیکن دوسری قسم کے لوگ جو ان نوادرات کی بے حد قدر کرتے ہیں اور لاکھ مصروفیت ہونے کے باوجود بھی ان کی خریداری خود کرتے ہیں وہ ان نوادرات کو ایسی جگہ سجاتے ہیں جہاں انہیں صرف وہی دیکھ سکیں ہر کسی کی نگاہ ان پر نہ پڑے۔'' تھریسیا آپ ہی آپ بولے جا رہی تھی۔

''اچھا' سائمن کا تعلق کس قسم کے لوگوں میں کرو گی؟'' اسپیڈ نے پوچھا۔

''وہ نوادرات جمع کرنے والی دوسری قسم سے تعلق رکھتا تھا وہ خود اپنے لیے نوادرات پسند کرتا تھا اور خود ہی ان کی خریداری کرتا تھا۔'' تھریسیا باتیں کرتے ہوئے نوادرات کی تصویریں کھینچتی جا رہی تھی پھر وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور اسی وقت اسپیڈ کے فون کی بیل بجی تھی اس نے فون جیب سے نکالا تھا اس کے لیے کیری کا فون تھا جو وہ آفس سے کر رہا تھا۔

''کیا تمہیں خفیہ کمپیوٹر کے سراغ مل گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں' میں کوشش کر رہا ہوں۔'' اسپیڈ نے جواب دیا۔

''اس کمپیوٹر سے کسی قسم کی خفیہ معلومات Send ہو رہی ہیں۔'' کیری نے کہا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''اگاتھا نے......اور تم جانتے ہو کہ اگاتھا کو کون بتا سکتا ہے؟'' کیری نے کہا۔

''یقیناً......اس کی عاشق روح نیوان......'' اسپیڈ نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''ہاں......تم پتہ لگاؤ...... وہ کمپیوٹر ہمیں بہت سی معلومات دے سکتا ہے۔'' کیری نے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے......میں کوشش کر رہا ہوں۔'' اسپیڈ نے جواب دیا اور فون بند کر دیا دوسرے ہی لمحے میں تھریسیا پھر کمرے میں داخل ہوئی تھی اس بار اس کے ہاتھ میں کچھ

کتابیں تھیں جو اس نے لا کر اسپیڈ کے سامنے میز پر رکھ دی تھیں۔

''ان میں سے یہ دو کتابیں اس کے بیڈ روم سے ملی ہیں اور ان میں ''بک مارک'' بھی لگے ہوئے ہیں لگتا ہے وہ آج کل انہیں ہی پڑھ رہا تھا۔'' تھریسیا نے ان کتابوں میں سے دو کتابیں اٹھا کر اسپیڈ کی طرف بڑھا دیں۔ دونوں کتابوں کے سرورق پر مشہور رائٹر ٹام رابرٹ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

''میں نے کبھی اس رائٹر کے بارے میں نہیں سنا۔'' اسپیڈ نے کہا۔

''یہ ایک مشہور رائٹر ہے اور زیادہ تر مذہب کے موضوع پر کتابیں لکھتا ہے اس کے کئی مذہبی ٹی وی چینلز بھی چل رہے ہیں جن کا براہ راست تعلق کچھ چرچوں سے ہے اور ٹی وی چینلز کا یہ نیٹ ورک بہت زیادہ آمدنی پیدا کر رہا ہے اور یہ ساری کتابیں رابرٹ فاؤنڈیشن پریس ہی کی ہیں۔'' تھریسیا نے میز پر رکھی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ صرف پیپر بکس ہی پڑھنے میں دلچسپی رکھتا تھا؟ ای بکس نہیں؟'' اسپیڈ نے پوچھا۔

''مجھے ابھی تک کوئی ایسی نشانی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ ای بکس پڑھنے یا فکشن پڑھنے میں دلچسپی رکھتا تھا یہاں موجود سب کتابیں مذہبی نوعیت ہی کی ہیں۔'' تھریسیا نے جواب دیا۔

''ہوں......'' اسپیڈ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ان میں سے کئی کتابوں پر ٹام رابرٹ کے دستخط موجود ہیں جو اس نے اپنے ہاتھ سے کیے ہیں ممکن ہے یہ کتابیں اس نے خود سائمن کو گفٹ کی ہوں۔'' اس کی کتابوں کے تازہ ایڈیشنز ہیں۔ یہ ساری کتابیں حالیہ دنوں ہی میں شائع ہوئی ہیں یوں لگتا ہے کہ مذہب کے بارے میں پڑھنے کا رجحان سائمن میں حال ہی میں پیدا ہوا تھا۔''

''ٹھیک ہے اب ان کتابوں کو واپس رکھ دو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔'' اسپیڈ نے کہا اور تھریسیا کتابوں کو واپس لے گئی پھر وہ کتابیں رکھ کر مڑی ہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

''اوہ......کوئی آیا ہے' کہیں کوئی مجرم نہ ہو جس کی ہمیں تلاش ہے اور وہ اپنے نشانات مٹانے آیا ہو۔'' اسپیڈ نے کہا۔

''نہیں...... میرا خیال ہے کوئی ہمارے آفس سے ہو سکتا ہے۔'' تھریسیا نے اس کی مخالفت کی اور دونوں فلیٹ کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے پھر تھریسیا نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت کالی جیکٹ پہنے کھڑی تھی اس نے آنکھوں پر بڑا سا چشمہ لگایا ہوا تھا۔

''میں لینو کا ہوں......کیا مسٹر سائمن ورک آج صفائی کا کام کروائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ آج صفائی نہیں کرنا ہے۔'' اس نے ناراضگی سے کہا۔

''پلیز' اندر آ جاؤ۔'' تھریسیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم فلیٹ کو جدید انداز میں سجانے کی تیاری کر رہے ہیں تا کہ آج کل کے جدید زمانے کے تقاضے پورے ہو سکیں۔'' تھریسیا نے کہا لینو کا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور ایک دیوار کی طرف بڑھ گئی تھی پھر اس نے دیوار پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا اور دیوار میں ایک الماری کھل گئی تھی جس میں پلاسٹک کی بالٹیاں اور کچھ صفائی کا سامان موجود تھا جس میں سے کافی سامان غیر استعمال شدہ بھی نظر آ رہا تھا۔

''کیا مسٹر سائمن آفس میں موجود ہیں۔'' لینو کا نے پوچھا۔ ''اگر وہ مصروف ہوں گے تو میں آفس آخر میں صاف کر دوں گی۔''

''وہ یہاں نہیں ہیں...... وہ کچھ آرام کے موڈ میں تھے...... تمہیں تو پتہ ہے...... کچھ وقت سب جھمیلوں سے دور گزارنا چاہتے تھے۔'' تھریسیا نے کہا۔

''ہاں...... مذہبی دلچسپیاں...... اس نے کہا تھا کہ وہ کسی مذہبی میٹنگ میں جائیں گے......'' لینو کا نے کہا۔

''ہاں...... یہ میٹنگ شاید امریکہ میں ہے۔'' تھریسیا نے کہا۔ ''تم مسٹر سائمن کی دلچسپیوں کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہوگی' ہماری اب تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے' کیا تم کافی عرصے سے ان کے یہاں کام کر رہی ہو؟''

''میں یہاں چار سال سے کام کر رہی ہوں میں ایک دن چھوڑ کر ایک دن آتی ہوں۔''

''ہاں' فلیٹ بہت صاف ستھرا ہے..... لگتا ہے وہ زیادہ پارٹیاں وغیرہ نہیں کرتا تھا اور اس سے ملنے زیادہ لوگ بھی نہیں آتے تھے۔'' تھریسیا نے پوچھا۔

''ہاں پچھلے تین سال سے وہ تنہائی کی زندگی گزار رہا ہے' اور مذہب کی طرف راغب ہو گیا ہے۔'' لینوکا نے کہا۔

''اور اس سے پہلے کیا ہوتا تھا؟''

''اس سے پہلے ایک سال تک فلیٹ بہت گندہ ہوتا تھا' یہاں بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے' عورتیں بھی اور مرد بھی' شراب کا بے تحاشہ استعمال ہوتا تھا' رنگینیاں ہی رنگینیاں ہوتی تھیں رات رات بھر پارٹیاں چلتی تھیں خوب شور شرابا رہتا تھا' عجیب وغریب جملے ایک دوسرے پر کسے جاتے تھے پھر جب میں صفائی کے لیے آتی تھی تو مسٹر سائمن بڑی توجہ سے صفائی کرواتے تھے اور پورے فلیٹ میں کوئی فریش سا روم اسپرے بھی کرواتے تھے۔''

''کیا تم نے کبھی اسے عبادت کرتے دیکھا؟'' تھریسیا نے پوچھا۔

''ہاں..... ادھر آؤ۔'' لینوکا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی جس میں بڑی سی کھڑکی تھی جس کا رخ بازار کی سمت تھا' سامنے سڑک پار کر کے دکانیں نظر آ رہی تھیں' کھڑکی کے قریب ایک آرام دہ کرسی رکھی تھی۔

''وہ یہاں بیٹھ کر اکثر بائبل پڑھا کرتا ہے۔'' لینوکا نے کہا۔

''ہوں..... کبھی اس نے تمہیں کوئی نصیحت کی..... اچھی زندگی گزارنے کے لیے.....؟'' تھریسیا نے پوچھا۔

''پچھلے ایک سال سے وہ اکثر ایسی باتیں کرتا ہے جن میں مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے میں حیران ہوں اس کے سوچنے کا انداز بالکل بدل گیا ہے۔'' لینوکا نے کہا پھر گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ تھریسیا واپس اسی کمرے میں آ گئی تھی جہاں اسپیڈ سائمن کے خفیہ کمپیوٹر سے data کاپی کر رہا تھا۔

''اسپیڈ چیک کرو کہ تمہارا کام کتنا باقی رہے اور پھر فلیٹ کا آخری جائزہ لے لو کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟'' تھریسیا نے کہا۔

''سائمن اپنی زندگی بھرپور انداز میں گزار رہا تھا اس کے پاس سب کچھ تھا پھر وہ کیا چیز تھی جس نے اس کی جان لی؟'' اسپیڈ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اوہ' یہ کتنا خوبصورت ہے۔'' تھریسیا نے ایک قیمتی مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے یہ مجسمہ پچھلے سال ایک چائنیز صنعت کار نے دو ملین ڈالرز کا خریدا تھا۔'' تھریسیا نے وہ چھوٹا سا مجسمہ اٹھاتے ہوئے کہا جو ایک سگریٹ کے پیکٹ کے برابر تھا اور اسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

''کک..... کیا کر رہی ہو..... تم اسے نہیں لے سکتیں؟'' اسپیڈ نے اسے سمجھایا۔

''میں لے سکتی ہوں۔'' تھریسیا نے انگلی کے اشارے سے اسپیڈ کو خاموش رہنے کو کہا پھر وہ دوسرے مجسمے کی طرف بڑھی تھی۔

''نہیں تم یہ نہیں چرا سکتیں۔'' اسپیڈ پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''تم پکڑی جاؤ گی' یہاں خفیہ کیمرے لگے ہیں۔''

''نہیں..... میں نہیں پکڑی جاؤں گی میں نے احتیاط رکھی ہے میں کیمروں میں نظر نہیں آؤں گی میں نے پہلے ہی ان کی جگہوں کو چیک کر لیا تھا۔'' تھریسیا نے کہا اور اسے وہاں سے واپسی کا اشارہ کرتی ہوئی فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھی اسپیڈ نے بھی اپنا سامان جمع کیا تھا اور وہ بھی اس کے پیچھے فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ لینوکا ابھی تک فلیٹ کی صفائی میں مصروف تھی۔



اگاتھا اپنے گھر کے دروازے میں بنے سوراخ سے باہر جھانک رہی تھی ابھی کسی نے دراوزہ کھٹکھٹایا تھا اس سے ملنے بہت کم لوگ آتے تھے وہ جس جگہ رہتی تھی وہاں کے لوگ بھی کبھی اس سے ملنے نہیں آئے تھے وہ حیران تھی کہ یوں اچانک بغیر اطلاع دیئے کون آ سکتا ہے' اس کے پیچھے کاریڈور میں نیوان کھڑا تھا اس وقت وہ اپنی ایئر فورس کی

یونیفارم کے بجائے ایک باورچی کے لباس میں تھا اس نے ایپرن پہنی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں سبزی کاٹنے کی بڑی سی چھری تھی جس سے وہ کچھ دیر پہلے سیب کاٹ رہا تھا۔

''کیا کوئی ایسا شخص ہے جسے ہم جانتے ہیں اگاتھا؟'' نیوان نے پوچھا۔

''یوں لگتا ہے جیسے اسپیڈ ہے وہ پولیس آفس میں......''

''الیکٹرونک ڈپارٹمنٹ میں ہے۔'' نیوان نے اس کی ادھوری بات مکمل کردی۔ ''میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ کرٹس ورک سے ملنے بھی گیا تھا ماہر کمپیوٹر ہیکر ہے' آج اس کی ڈیوٹی سائمن ورک کے لندن کے فلیٹ پر تھی تھریسیا کے ساتھ جہاں سے تھریسیا نے دو قیمتی مجسمے بھی چرائے ہیں۔'' نیوان نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... تم نے تو لمبی تقریر شروع کردی...... چلو دروازہ کھولو۔'' اگاتھا نے کہا اور خود پیچھے ہٹ گئی۔ نیوان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

''او اسپیڈ...... مجھے تمہارے آنے کی امید نہیں تھی۔'' اگاتھا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''تم نے اپنے آنے کے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی؟''

''میں اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن گیری نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اب سے ماسکو کے اصول استعمال ہوں گے۔''

''ماسکو کے اصول؟'' اگاتھا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں' اس کا مطلب ہے کہ ہم لوگ ایمرجنسی کی صورت حال میں ہیں اور ہمیں اپنے فون پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے' اور بہت زیادہ ضرورت پڑنے پر مختصر بات کرنا چاہیے۔'' اسپیڈ نے جواب دیا۔

'اچھا؟'' اگاتھا نے حیرت سے کہا۔ ''میں حیران ہوں یہ خیال اس کے دماغ میں کہاں سے آ گیا؟'' اگاتھا نے کہا اور اسپیڈ کے ساتھ اپنے لونگ روم میں آ گئی' اسپیڈ کو نیوان نظر نہیں آ رہا تھا جو ان کے پیچھے ہی لونگ روم میں آ گیا تھا۔

''یہ...... میرا دوست ہے...... آج کل میرے کمرے ہی میں رہتا ہے۔'' اگاتھا نے اپنے کتے کا تعارف کروایا اور اسپیڈ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا کتا اس کے ساتھ ساتھ دم ہلاتا پھر رہا تھا۔

''دراصل یہ برسوں سے میرے ساتھ ہے' اور یوں سمجھ لو کہ ہماری آفس کی سرگرمیوں میں بھی میرا ساتھی ہے یہ سب چیزوں سے واقف ہے تم اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھو۔'' اگاتھا نے اسپیڈ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں تمہارے سوشل نیٹ ورک پر نہیں ہوں۔'' نیوان نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ میں اگاتھا کی ٹیم میں شامل ہوں...... میں تمہیں جانتا ہوں تم نے ابھی سال بھر پہلے ہی یہ آفس جوائن کیا ہے ابھی ناتجربہ کار ہو لیکن آہستہ آہستہ سیکھ جاؤ گے۔'' نیوان نے کہا اور واپس باورچی خانے کی طرف چلا گیا نیوان کی بات اسپیڈ نہیں سن سکا تھا اور نہ وہ اسے نظر آ رہا تھا۔ ''خیال مت کرنا یہ نئے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی پیش آتا ہے۔'' اگاتھا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میں نئے لوگوں سے ملنے کا زیادہ عادی نہیں ہوں۔'' اسپیڈ نے جواب دیا۔

اگاتھا کے لونگ روم میں اس کا جدید کمپیوٹر سسٹم موجود تھا' جسے دیکھ کر اسپیڈ کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور وہ تعریفی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا اگاتھا نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میرے خیال میں تم آفس سے کوئی خاص خبر لائے ہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں' کچھ کاغذات ہیں۔'' اسپیڈ نے اپنی لیپ ٹاپ کے بیگ سے کاغذات کا ایک بنڈل نکال کر اگاتھا کو تھمایا اور اگاتھا نے اپنی عینک آنکھوں پر لگا کر ان کاغذوں کی ورق گردانی شروع کردی کچھ دیر بعد اس نے کاغذات رکھ دیئے تھے اور اسپیڈ کو مخاطب کیا تھا۔

''اسپیڈ' یہ بتاؤ کہ کیا ہمیں کنٹرول ورکس کی طرف سے سائمن کے فنانشل ریکارڈ تک پہنچنے کی اجازت مل گئی ہے؟''

''وہ سوئٹزرلینڈ میں ہیں اور کمپنی کا کہنا ہے کہ وہ اس

ریاست کی ذمہ داری میں آتے ہیں چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں سائمن کے وکیل سے بات کرنا ہوگی۔'' اسپیڈ نے بتایا۔

''دراصل میں یہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہوں کہ پچھلے سال سائمن نے کسی فلاحی تنظیم میں کوئی بڑی رقم تو نہیں دی ہے؟'' اگاتھا نے کاغذات اسپیڈ کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں اسپیڈ ایک مشورہ اور بھی ہے کل جب تم آفس جاؤ تو وہ ساری فوٹو گرافس ڈیلیٹ کر دینا جو سائمن کے فلیٹ پر بنائی تھیں۔''

''کیوں؟'' اسپیڈ نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں بہت ہی قیمتی نوادرات سجے ہوئے ہیں جنہیں فوٹو لینے سے پہلے اور فوٹو لینے کے بعد بھی انشورنس سراغ رساں چیک کریں گے۔'' اگاتھا نے کہا اور اسپیڈ حیرت سے اسے دیکھنے لگا کیونکہ اگاتھا کو اس نے ان مجسموں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو تھریسیا نے وہاں سے غائب کیے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ اگاتھا یہ بات کیسے جان گئی ہے جبکہ وہ وہاں موجود بھی نہیں تھی۔

''میں آفس بعد میں جاؤں گا پہلے میں سائمن کے فلیٹ میں اپنے کل کے کام کو مکمل کروں گا جس میں' میں نے وہاں ایک خفیہ کمپیوٹر کا Data محفوظ کیا ہے۔''

''میں نے تمہیں وہ بات بتائی ہے جو تمہیں اور تھریسیا کو پریشانی سی بچاسکتی ہے تم سے زیادہ یہ تھریسیا کے حق میں ہے۔''

''میرے ساتھ ایک شخص اور تھا فرینک' وہ میرے آفس ہی کا ساتھی ہے میں اس کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔''

''یہ اچھا ہے...... ہمیں کام کرتے وقت کسی نہ کسی بااعتماد شخص کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیے جس پر تم بھروسہ کرسکو جو تمہارے پیچھے بھی تمہارا دفاع کرسکیں خاص طور سے جب تم آفس کے لیے خدمات انجام دے رہے ہو' یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔'' اگاتھا نے سمجھایا۔

''کیا یہ نصیحت ہے؟'' اسپیڈ نے پوچھا۔

''ہاں' یونہی سمجھ لو۔''

''اچھا مجھے ایک اور بات بتانا تھی گیری نے کہا ہے کہ کل آپ کو اس کے ساتھ گرین روک کیپٹل کے ہیڈ سے ملنا ہے' جس کا انتظام لندن کے کلب میں کیا جا رہا ہے اس شخص کا نام ولیم ٹی مکرلی ہے وہ اپنی دولت کے زور پر کنٹرول ورکس کو خریدنا چاہتا ہے۔'' اسپیڈ نے بتایا۔

''ہوں...... وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... مخالفین بہت تیزی سے کام کررہے ہیں تمہیں گیری کے انداز سے کچھ پتہ چلا کہ ولیم اس ملاقات کے لیے کتنا بے چین ہے؟'' اگاتھا نے پوچھا۔

''گیری مجھے کچھ خوش نظر نہیں آرہا تھا...... وہ زیادہ تر خوش رہتا بھی نہیں۔''

''لوگوں کو خوش رکھنا اس کی ڈیوٹی نہیں ہے۔'' اگاتھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔



دوسرے روز اگاتھا' گیری کے ساتھ مقررہ وقت پر ''پلوٹو کلب'' پہنچ گئی تھی گیری نے اپنی کار کلب کے باہر سڑک پر ایک درخت کے نیچے پارک کی تھی۔

''آخر تم نے ولیم ٹی سے ملنے کا فیصلہ کیوں کیا' ہم جس کیس پر کام کررہے ہیں اس میں تو اس کا نام کہیں نہیں آتا۔'' اگاتھا نے گیری سے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ نہیں کیا بلکہ ولیم اس معاملے میں خود ہی شامل ہوا ہے وہ ''سینٹرل ورکس'' کو خریدنا چاہتا ہے اور اس نے اس سلسلے میں کرٹس سے ملنے کی درخواست کی تھی جبکہ کرٹس نے مجھ سے کہا کہ میں اس سے ملوں اور معلوم کروں کہ جب ورکس برادرز نے اپنا کاروبار بیچنے کا کوئی اشتہار نہیں دیا تو کیوں اس معاملے میں پڑ رہا ہے کیا اسے معلوم ہوگیا ہے کہ سائمن اب اس دنیا میں نہیں رہا اور یا پھر وہی کسی نہ کسی طرح اس کی موت کا ذمہ دار ہے۔'' گیری نے وضاحت کی وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کلب کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اگر مسٹر ولیم کو پتہ نہیں ہے کہ سائمن اس دنیا میں نہیں رہا تو ہم اس پر شک نہیں کرسکتے ایسی صورت میں ہمیں اس سے اس خبر کو چھپانا ہوگا۔'' اگاتھا نے کہا۔

''یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ اسے پتہ نہیں ہوگا ہم سائمن کے قتل کی تحقیقات کررہے ہیں۔'' گیری نے اپنی جیب سے

سٹی آف لندن پولیس کا کارڈ نکال لیا تھا اور بیرونی دروازے پر موجود سیکیورٹی گارڈ کو کارڈ دکھاتا ہوا اندر داخل ہوا تھا آگاتھا بھی اس کے پیچھے ہی اندر استقبالیہ پر کلب کے دو ملازمین نے ان کا استقبال کیا تھا انہوں نے سیاہ یونیفارم پہنا ہوا تھا جس پر گولڈن مونوگرام بنا ہوا تھا دونوں میں سے ایک ملازم گیری کی طرف بڑھا تھا۔

''آپ مسٹر ولیم کے مہمان ہیں؟'' اس نے پوچھا تو گیری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہم ہیلوٹو کلب میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' دوسرے ملازم نے کہا۔ ''مسٹر ولیم آپ کے منتظر ہیں۔''

پھر وہ دونوں ملازم انہیں اپنے ساتھ ایک ہال میں لے گئے تھے جس سے گزر کر وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کلب کی اوپری منزل میں پہنچے تھے وہ جس کمرے میں پہنچے تھے وہاں شہر کے متمول افراد بیٹھے ناشتے میں مصروف تھے' ساتھ ہی کاروباری گفتگو بھی جاری تھی ولیم ایک میز پر تنہا بیٹھا تھا گیری اور آگاتھا کی کرسیاں وہاں موجود تھیں جن پر وہ بیٹھ گئے تھے۔

''گویا برطانیہ میری دولت میں دلچسپی رکھتا ہے؟'' ولیم نے گیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور تم...... تم یہاں کس لیے ہو؟'' گیری نے اسی کے لہجے میں پوچھا۔

''میں...... میں اپنی دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں امریکی دولت جو ایک امریکی کمپنی میں لگائی گئی تھی۔'' ولیم نے کہا۔

''ایک امریکی کمپنی جو لندن اسٹاک ایکسچینج میں لسٹ پر ہے اور امریکہ میں بھی۔'' گیری نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا تو خیال ہے کہ آج کل مارکیٹیں اور دولت گلوبل حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔'' آگاتھا نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ ورکس برادرز منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے وہ جڑواں ہیں اور اپنی ماں کے نام سے شہرت حاصل کی ہے باپ کے نام سے نہیں ان کی نانی مرتے وقت ان کے لیے ڈھیروں دولت چھوڑ گئی تھی جو انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے بڑھائی ہے اور ایک سوفٹ ویئر بزنس اسٹارٹ کیا جس نے بڑی جلد استحکام حاصل کر لیا اور مزید دولت کمانے کا ذریعہ بن گیا۔'' ولیم نے کہا۔

''اور تم......؟ میرا خیال ہے کہ تم تو ایک سیلف میڈ شخص ہو۔'' آگاتھا نے لقمہ دیا۔

''ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو...... میں نے بہت محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔'' ولیم نے کہا اسی وقت کلب کے ایک ملازم نے ان کے سامنے چائے کی ٹرے لا کر رکھ دی جس کے ساتھ کچھ سینڈوچ بھی تھے۔ گیری نے ہاتھ بڑھا کر ایک سینڈوچ اٹھا لیا تھا جبکہ آگاتھا نے کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

''تمہارا بزنس کیا ہے مسٹر ولیم......'' آگاتھا نے پوچھا۔

''میرے اپنے والد کی طرح چائے کے باغات ہیں لیکن یہ بہت محنت کی کمائی ہے ایک ایک پودے پر نظر رکھنا پڑتی ہے پودا لگانے سے چائے بننے تک بہت سے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں کبھی فصل بہت اچھی ہو جاتی ہے اور کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے لیکن میرے پاس بہت سے ماہرین موجود ہیں جو مجھ کو مفید مشورے دیتے رہتے ہیں۔''

''اگر تم کنٹرول ورکس' خرید لو گے تو دونوں جڑواں بھائیوں کی حیثیت کیا ہوگی؟'' گیری نے پوچھا۔

''یہ فیصلہ تو انہی کو کرنا ہوگا۔'' ولیم نے جواب دیا۔

''اور اگر وہ اپنا بزنس بیچنے پر تیار نہ ہوں تو؟'' آگاتھا نے پوچھا۔

''انہیں راضی کرنا ہمیں آتا ہے۔'' ولیم نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد آگاتھا اور گیری وہاں سے رخصت ہو گئے تھے اور اپنے آفس جانے کے لیے کلب سے باہر آ گئے تھے لیکن باہر آتے ہی گیری کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''اوہ خدایا'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور اس کی نظریں اس جگہ پر جمی ہوئی تھیں جہاں اس نے کچھ دیر پہلے اپنی کار پارک کی تھی کار اب وہاں نہیں تھی قریب ہی ایک ٹریفک وارڈن موجود تھا۔

''یہاں میری کار کھڑی تھی ابھی ایک گھنٹہ پہلے کی

بات ہے۔'' گیری نے ٹریفک وارڈن سے کہا۔

''وہ سرمئی رنگ کی پرانی سی کار؟'' وارڈن نے پوچھا اور گیری نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ تو چند منٹ پہلے تین نوجوان لے گئے ہیں۔'' وارڈن نے بتایا۔

''اوہ...... دیکھو......شاید یہ تمہاری کار کا ہی ایریل ہے۔'' اگاتھا نے زمین سے ٹوٹا ہوا ایریل اٹھا کر گیری کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ......ہاں...... یہ میری کار کا ہی ہے۔''

''وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو میں انہیں نہیں چھوڑوں گا......میری بیوی کیا کہے گی کہ کار کہاں گئی......میں اسے کیا جواب دوں گا؟'' گیری ایک دم پریشان ہو گیا تھا اور گیری کی بات پر اگاتھا نے وہیں کھڑے کھڑے آفس کا نمبر ملایا تھا۔

''ہیلو......میں ایک کار کی چوری کی رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں......کار کا رجسٹریشن نمبر......'' اگاتھا کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا اور مختلف کاروں کی سائرنوں کی آوازیں سنائی دینے لگی لوگوں کی چیخیں بھی نمایاں تھیں یہ آوازیں قریب ہی سے آ رہی تھیں اس کے ساتھ ہی گیری کو اپنی کار کے مانوس سائرن کی آواز بھی آ رہی تھی اور کچھ فاصلے پر مکانوں اور دکانوں کے پیچھے سے دھواں اور آگ کے شعلے نظر آ رہے تھے۔

''اوہ میری کار۔'' گیری نے افسوس سے کہا اور اسی وقت اس کی نظریں بلیوٹو کلب کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے چہروں پر پڑیں جن میں ولیم میکارلی کا چہرہ نمایاں تھا اس کے چہرے پر حیرت کے بجائے افسوس کے تاثرات تھے تب گیری کو احساس ہوا کہ وہ قتل کے کیس میں صحیح راستے پر تحقیق کر رہا ہے اور اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا اور اس نے اپنا فون اپنی جیب سے نکال لیا تھا۔

''جب کوئی تمہاری کار کو بم رکھ کر اڑا دے تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے ارادے بھانپ گیا ہے۔'' اگاتھا نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اسی وقت اسے اپنے قریب نیوان کی آواز سنائی دی۔

''جلدی کرو کرٹس کی جان کو بھی خطرہ ہے۔'' اگاتھا نے اس کی طرف دیکھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گیری سے کچھ کہتی گیری نے کرٹس ورکس مینشن کے نمبر ملائے تھے لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا صرف ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''یہ نمبر آؤٹ آف سروس ہے......یہ نمبر آؤٹ آف سروس ہے۔'' گیری نے کال کاٹ کر آفس کا نمبر ملایا تھا جو وہاں پاسپورٹ کنٹرول سوئچ بورڈ پر مسز راجر نے ریسیو کیا تھا۔

''میری بات اسپیڈ سے کراؤ۔'' گیری نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اسپیڈ فون پر تھا۔

''اسپیڈ مجھے کسی بھی طرح کرٹس ورکس تک کمیونیکیشن بائی پاس چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔'' گیری نے کہا۔ پھر بے ساختہ اس سمت کی طرف دوڑنے لگا تھا جہاں سے اس کو دھماکے کی آواز آئی تھی۔ اگاتھا بھی اس کی تقلید میں اس کے پیچھے دوڑی تھی گیری کے ہاتھ میں موبائل تھا جو اس نے کان سے لگایا ہوا تھا۔

''انجینئرز لاگ سے پتہ لگ رہا ہے کہ لوکل ٹیلی فون ایکسچینج فائبر آپٹک میں خرابی کے باعث کام نہیں کر رہا ہے اور ہماری رینج میں آنے والے چار سیل ٹاورز بھی فیل ہو چکے ہیں میں تمہارا رابطہ اس صورت حال میں نہیں کروا سکتا۔''

''وہاں گھر کے باہر موجود سیکیورٹی کا عملہ تھا اس کی کیا خبر ہے؟'' گیری نے پوچھا۔ وہ دوڑتا ہوا سڑک کا کونا مڑا تھا اور اس کے سامنے اس کی سرمئی رنگ کی کار چند قدم کے فاصلے پر الٹی پڑی تھی اس کے پرخچے اڑ گئے تھے اور اس سے دھواں اٹھ رہا تھا' اس میں موجود لڑکوں کا بھی کچھ اتہ پتہ نہیں تھا کچھ دکان دار اور راہ گیر زخمی پڑے تھے' دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور وہاں افراتفری کا عالم تھا کار میں اور اس کے اطراف بہت سے بال بیئرنگ پڑے تھے سڑک میں اس مقام پر گڑھا پڑ گیا تھا۔

''ہم اس وقت صرف شارٹ رینج ریڈیو سے کام چلا سکتے ہیں۔'' اسپیڈ نے کہا۔

"ہمیں ہر حال میں فوراً کرٹس ورک تک پہنچنا ہے وہ خطرے میں ہے۔" گیری نے کہا۔ "کہیں اسے بھی اس کے بھائی کی طرح نہ مار دیا جائے امدادی ٹیموں کو وہاں بھی بھیجو۔" گیری نے کہا اور فون بند کر دیا سڑک پر بہت سی ایمبولینسز آ گئی تھیں جن کے سائرنوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی وہ زخمیوں کو اٹھا کر اسپتال لے جا رہی تھیں کچھ ہی دیر میں ایئر ایمبولینس کے طور پر ایک ہیلی کاپٹر فضا میں نظر آیا تھا اور اسے سڑک پر اتارنے کی جگہ فراہم کی گئی تھی وہ بھی طبی امدادی ٹیم کے ساتھ آیا تھا۔

"اگر کرٹس کی جان کو خطرہ ہے تو اس کی سیکیورٹی ٹیم کیا کر رہی ہے؟" اگاتھا نے گیری سے کہا۔

"وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا...... یوں لگتا ہے وہاں کوئی فون ریسیو کرنے والا بھی نہیں ہے۔"

"گیری...... چلو ہم دونوں تو چلتے ہیں۔" اگاتھا نے کہا۔

"ہم دونوں؟" گیری نے حیرت سے کہا انداز ایسا ہی تھا جیسے اگاتھا سے اسے کوئی امید نہ ہو بہر حال وہ کافی عمر رسیدہ تھی اور اسے ریٹائر ہوئے بھی عرصہ ہو چکا تھا۔

"کوئی شک؟" اگاتھا نے اس کا ذہن پڑھتے ہوئے کہا تو گیری مسکرا دیا لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

"تم جانتے ہو میں اکیلی نہیں...... میں کبھی اکیلی نہیں ہوتی۔" اگاتھا نے پریقین لہجے میں کہا۔

"نیوان......؟" گیری نے پوچھا اور اگاتھا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس لیے ہی تو تم لوگوں نے میری خدمات لیں اس کی خاطر ہی مجھے نفسیاتی سینٹر سے رہائی دلائی تو اب تو یہ نیوان کا بھی فرض بنتا ہے کہ تمہارا ساتھ دے۔" اگاتھا نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... چلو جلدی کرو۔" گیری نے کہا اور ایک ٹیکسی میں اگاتھا کے ساتھ بیٹھ کر کرٹس کی رہائش کی طرف روانہ ہو گیا۔



تھریسیا کو اسپیڈ نے آفس ہی میں صورت حال سمجھا کر کچھ فائٹرز کے ساتھ کرٹس کی رہائش گاہ پر بھیج دیا تھا وہاں پہنچنے کے بعد تھریسیا نے اطراف کا جائزہ لیا تھا ماحول بالکل مختلف تھا جب وہ پہلے گیری کے ساتھ وہاں آئی تھی تو رہائش گاہ کے باہر چپے چپے پر سیکیورٹی گارڈ موجود تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا تھریسیا کے ساتھ جو فائٹرز تھے انہوں نے سیاہ وردیاں پہنی ہوئی تھیں اور تھریسیا نے انہیں رہائش گاہ کے احاطے کے اندر جانے کے بعد مختلف سمتوں میں بکھر جانے کے لیے کہا تھا اور خود بیرونی صدر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ پھر جب اس نے اندر داخل ہونا چاہا تھا تو اسے احساس ہوا تھا کہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ تھریسیا نے اپنے بیگ سے اسپیشل کی پنچ نکالا تھا اور کسی ماہر کی طرح دروازے کا لاک کھول لیا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے اندر داخل ہوئی تھی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا پھر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہال سے گزرتی لائبریری کی طرف بڑھی تھی کیونکہ اسے وہاں کچھ روشنی نظر آ رہی تھی اس نے لائبریری کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا تھا۔ وہاں کم پاور کے بلب کی روشنی تھی لیکن کمرے میں کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے وہ آہستہ سے اندر داخل ہوئی تھی اور پھر اچانک اس کی نظر کمرے کے درمیانی دیوار میں بنی بڑی سی کھڑکی کے قریب رکھی آرام دہ کرسی پر پڑی تھی جو خالی تھی اور جہاں اکثر کرٹس بیٹھا کرتا تھا اس وقت کرسی خالی تھی لیکن اس کے قریب فرش پر اس بوڑھے ملازم کی لاش پڑی تھی جس سے تھریسیا اور گیری کی ملاقات پہلے روز یہاں آنے پر ہوئی تھی۔

"اوہ...... بے ساختہ تھریسیا کے منہ سے نکلا...... یہ تو کرٹس کا خاص ملازم ہے...... خدا جانے یہاں کیا ہوا ہے؟" تھریسیا نے زیر لب کہا پھر اس نے اس ملازم کی نبض محسوس کرنے کی کوشش کی تھی جو چل رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہوا تھا لیکن اس کے سر

سے اچھی خاصی تعداد میں خون بہہ چکا تھا تھریسیا نے قریب رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈھیلا اور ملازم کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی اچانک ہی اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں کھول دی تھیں اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔

''کیا ہوا ہے...... میں کہاں ہوں؟'' اس نے غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

''ہیلو...... ادھر دیکھو...... میری طرف...... تمہارا نام کیا ہے؟'' تھریسیا نے پوچھا۔

''مم...... میں...... جیری...... لیکن آپ کون ہیں؟'' جیری نے پوچھا۔

''میں اسپیشل برانچ سے آئی ہوں...... یہ بتاؤ یہاں کیا ہوا ہے؟''

''کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... ایک کار میں چار پانچ افراد آئے تھے ان کے آتے ہی رہائش گاہ کے اطراف میں کئی دھماکے ہوئے ہم نے مدد کے لیے فون کرنا چاہے تو فون ڈیڈ تھے، ہماری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔''

''کرٹس مارک کہاں ہے؟''

''وہ...... وہ میرے ساتھ لائبریری میں ہی تھے پھر دو سیاہ پوش یہاں آئے تھے اور انہوں نے مالک کی کنپٹی پر گن رکھ دی تھی۔ میں نے مداخلت کرنا چاہی تو کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری تھی اور میں اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔''

''اوہ......'' تھریسیا کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا پھر اس نے جیری کو زمین سے اٹھنے میں مدد دی تھی اور اسی وقت گیری اگاتھا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''کیا ہوا...... صورت حال کچھ سمجھ میں آئی؟'' اس نے تھریسیا سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کرٹس کو اغوا کیا گیا ہے...... میں ابھی یہاں پہنچی ہوں تو مجھے جیری زخمی اور بے ہوش ملا تھا اس نے بتایا ہے کہ سیاہ وردی میں ملبوس پانچ افراد ایک کار میں آئے تھے اور کرٹس کو شاید اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''شاید؟'' گیری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''دراصل اس نے صرف اتنا ہی دیکھا تھا کہ دو افراد کمرے میں آئے تھے ان میں سے ایک نے کرٹس کی کنپٹی پر گن رکھی تھی اور دوسرے نے کوئی بھاری چیز مار کر جیری کو بے ہوش کر دیا تھا اب اس عمارت میں کوئی نہیں ہے سیکیورٹی گارڈ بھی نہیں۔'' تھریسیا نے بتایا۔

''اسے کس نے اغوا کیا ہوگا؟'' تھریسیا نے حیرت سے پوچھا۔

''جو اس کا بزنس خریدنا چاہتا ہے اور جس نے اس کے جڑواں بھائی کو قتل کیا ہے۔'' گیری نے کہا۔

''ولیم ٹی مکرلی۔'' اگاتھا نے زیر لب کہا۔ ''وہ اس وقت کلب میں نہیں ہے جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تب ایک ہیلی کاپٹر میں کرٹس کو ہیلو کلب کی چھت پر لایا گیا تھا چند لمحوں کے لیے اس کے اغوا کرنے والے اس کے ساتھ موجود تھے پھر ولیم بھی اس ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا اور اس وقت وہ ہیلی کاپٹر فضاؤں میں ہے اور امریکہ کی طرف سفر کر رہا ہے۔'' اگاتھا یوں بول رہی تھی جیسے ٹرانس میں ہو، نیوان اس کے کان میں اسے معلومات دے رہا تھا اور وہ بتا رہی تھی لیکن نیوان سب کی نظروں سے اوجھل تھا اور وہاں اس کی موجودگی کو کوئی بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا نیوان نے اپنی بات ختم کر کے آہستہ سے اگاتھا کے گال کو سہلایا تھا اور جیسے وہ ہوش میں آ گئی تھی۔

''انہیں سفر کرتے ہوئے صرف آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔'' اگاتھا نے کہا اور اسی وقت گیری نے اہم اطلاع اپنے فون پر پولیس ہیڈ کوارٹر کی اسپیشل برانچ کو دے دی، موقع واردات سے انہیں کوئی خاص ثبوت نہیں ملا تھا۔

''اتنی سیکیورٹی کو کیا ہوا؟ میں حیران ہوں۔'' گیری نے کہا۔

''انہیں خرید لیا گیا...... ولیم نے کرٹس سے زیادہ بھاری رقم دے کر سیکیورٹی گارڈز کے ہیڈ کو خرید لیا اور انہوں نے موقع پر کرٹس کا ساتھ دینے کے بجائے ولیم کا ساتھ دیا۔'' اگاتھا نے کہا۔

''لیکن اس نے تو ہمیں یلوٹو کلب بلایا تھا کرٹس کے کاروبار کا سودا کرنے کے لیے۔'' گیری نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ضرور بلوایا تھا لیکن اس کے سامنے دو آپشن تھے ایک تو یہ کہ سودا ہو جائے گا اس صورت میں اسے مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن سودا نہ ہونے کی صورت میں اس نے جو پلان بنایا تھا وہ اس پر عمل کر رہا ہے اب وہ کرٹس کو اغوا کر کے اس کی فیملی پر زور ڈالے گا کہ اسے تاوان میں بھاری رقم دی جائے' کاروبار کا سودا کیا جائے۔'' اگاتھا نے کہا۔ نیوان برابر اس کے کان میں معلومات دے رہا تھا۔

''تم بڑے کام کی چیز ہو اگاتھا۔ تمہاری مدد کرنے والی روح تمہاری بڑی وفادار ہے وہ ہمیشہ تمہاری مدد کرتی ہے اسی لیے تو محکمے نے دوبارہ تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔'' تھریسا نے مسکرا کر کہا جس پر نیوان نے برا سا منہ بنایا لیکن کوئی اس کی یہ حرکت نہیں دیکھ سکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ آفس کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اسپیشل برانچ کی انویسٹی گیشن ٹیم وہاں پہنچ گئی تھی جو وہاں سے کمپیوٹر سسٹم اور نیٹ ورک سسٹم سے معلومات اکٹھی کر رہی تھی راستے میں گیری کو اطلاع ملی تھی کہ ولیم کے ہیلی کاپٹر کو برطانیہ کی حدود ہی میں اتار لیا گیا تھا اور کرٹس بخیریت تھا اب انہیں سرکاری ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسپیشل برانچ آفس لایا جا رہا تھا۔ گیری نے یہ خوش خبری سب کو سنائی تھی۔

''مجھے میرے گھر پر ڈراپ کردو میں کل وقت پر آفس پہنچ جاؤں گی۔'' اگاتھا نے گیری سے کہا جو تھریسا کی کار ڈرائیو کر رہا تھا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا تھا اور اگاتھا کو ڈراپ کرنے کے بعد آفس کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

اگاتھا اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو نیوان اس کے ساتھ تھا جس نے بڑی محبت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔

''تھک گئی ہو...... کچھ پیو گی؟'' نیوان نے محبت سے بھرے لہجے میں پوچھا اور اگاتھا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اسے چھوڑ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اگاتھا کپڑے تبدیل کر کے نائٹ گاؤن پہن چکی تھی رات خاصی بیت گئی تھی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

''تم آج بھی بہت خوبصورت ہو اگاتھا۔'' نیوان نے جوس کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ تمہارا خیال ہے نیوان......اب مجھ میں خوبصورتی نام کی کوئی چیز کہاں میں تقریباً ادھیڑ عمر کی ہو چکی ہوں نہ وہ خوبصورتی ہے اور نہ وہ طاقت......صرف تمہاری مدد کی وجہ سے مجھے میرے آفس کے لوگوں نے بھی یاد رکھا ہوا ہے۔'' اگاتھا نے دکھ سے کہا۔

''اور میرا وعدہ ہے کہ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں انہیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑتی رہے گی اور وہ تمہیں یاد رکھنے پر مجبور ہوں گے۔'' نیوان نے جوس کا خالی گلاس اگاتھا کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا اور اگاتھا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا پھر اس کے ایک اشارے پر کمرے میں موجود ٹیپ ریکارڈ پر ایک رقص کی دھن بجنے لگی تھی اور اس نے اگاتھا کے ساتھ رقص شروع کر دیا تھا وہ اس کے ساتھ گھوم رہی تھی' جھوم رہی تھی' بل کھاتی' مسکراتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی' ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی اور یہ صرف اور صرف نیوان جیسے ان دیکھے ساتھی کا کمال تھا جو موجود بھی تھا اور نہیں بھی' جو سکون بھی بخشتا تھا اس کا خیال بھی کرتا تھا' اور اس کی کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں تھی جو اگاتھا کا اس بڑھاپے اور تنہائی میں واحد سہارا تھا جو غائب بھی تھا اور حاضر بھی۔



گرداب

عرفان رامے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں بازی گر دھوکا یہ کھلا
اپنی محبوب بیوی کی محبت میں قتل پر قتل کرنے والے ایک شخص کی روداد، جب حقیقت اس پر کھلی تو......

جرم وسزا پر مبنی ایک خوب صورت کہانی

شکیل احمد نے ائرپورٹ کی عالیشان عمارت سے باہر قدم رکھا تو سوائے بارش کے کوئی اس کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھا.... چنانچہ ایک طائرانہ نظر آسمان پر ڈالنے کے بعد اس نے ٹیکسی لی اور گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

وہ ایک معروف کمپنی میں مارکیٹنگ منیجر تھا اور اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں دوسرے شہروں کا دورہ کرنا اس کے فرائض کا حصہ تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے کلائی گھما کر گھڑی پر نظر دوڑائی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ائرپورٹ سے گھر تک کا سفر ایک گھنٹے پر محیط تھا چنانچہ فی الحال اس نے اپنی بیوی تانیہ کو آمد کی اطلاع دے کر ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور چند لمحے شیشے کے پار پرنم تاریکی میں جھانکنے کے بعد آنکھیں موندلیں۔

تانیہ اس کی بیوی ہی نہیں دوست بھی تھی.... دونوں یونیورسٹی دور کے کلاس فیلو تھے۔ انہوں نے لومیرج کی تھی اور تین سال گزر جانے کے باوجود ایک دوسرے کو نو بیاہتا جوڑے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد تانیہ نے شکیل احمد کی اجازت سے ایک پرائیوٹ اسپتال میں ایڈمنسٹریٹر کی ملازمت اختیار کر لی تھی لیکن وہ کسی انتہائی ایمرجنسی کی صورت میں ہی رات کو اسپتال جاتی تھی کیوں کہ شکیل احمد کو اس کا نائٹ ڈیوٹی کرنا پسند نہیں تھا۔

گھر کے سامنے پہنچ کر شکیل احمد نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے رخصت کیا اور پھر ہاتھ میں دم توڑتے سگریٹ کا آخری طویل کش لینے کے بعد فلٹر کو گیلی سڑک پر اچھال دیا۔ اب وہ گہرے سانس لے کر ماحول کی تازگی کو اپنے وجود میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ تانیہ کو سگریٹ کی بو سخت ناپسند تھی.... خصوصاً اس وقت جب وہ چند روز گھر سے باہر گزار کر واپس لوٹتا تھا۔

تیز بارش تھم چکی تھی لیکن خنکی کے باوجود ہلکی پھوار بہت فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحے اس خوشگوار ٹھنڈک کو محسوس کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھا اور جیب سے چابی نکال کر گیٹ کا لاک کھولنے کے بعد اندر داخل ہوگیا۔

اب وہ چھوٹے سے پورچ میں کھڑی اپنی کار کے قریب سے گزر کر اندرونی عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا....اور ایک بار پھر چابی لاک میں گھما کر عمارت کے اندر داخل ہوگیا۔ وہ اکثر وقت بے وقت گھر لوٹتا تھا اس لیے تانیہ کو بے آرام کرنے کے بجائے ڈپلیکیٹ چابی جیب میں رکھنا اس کی عادت بن چکی تھی۔

ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر شکیل احمد ٹی وی لاؤنج میں پہنچا تو چند قدم کے فاصلے پر خواب گاہ کے نیم وا دروازے سے نیلی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ سکون سے چلتا ہوا کمرے کی جانب بڑھا تو سامنے بیڈ پر اپنے مخصوص سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تانیہ دکھائی دی۔ اس



کے پیروں کی حرکت سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک جاگ رہی ہے.... اسے دیکھ کر شکیل احمد کے ہونٹوں پر بے اختیار محبت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی .... لیکن تھوڑا اور آگے بڑھنے پر جیسے ہی شکیل احمد کی نظر تانیہ کے ساتھ بیڈ پر لیٹے ہوئے مرد پر پڑی اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

مرد کی پشت شکیل احمد کی جانب تھی اور وہ دھیمی روشنی میں کسی عفریت کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ تانیہ نے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ جب کہ مرد کے بازوؤں کا حصار اس کی کمر کے گرد تھا۔ دونوں اس قیامت خیز لمحے سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مگن تھے۔ کمرے میں ان کی دھیمی سرگوشیاں بازگشت بن کر گونج رہی تھیں.... ان آوازوں نے شکیل احمد کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ تانیہ اس کے اعتماد کا یوں بے دردی سے خون کر سکتی ہے۔ مگر سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

یہ کریہہ منظر دیکھنے کے بعد وہ غصے سے کانپتا ہوا واپس پلٹا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا دوسرے کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے الماری سے اپنا ریوالور نکالا اور ساتھ پڑے میگزین کیس کو ریوالور کے چیمبر میں فٹ کر کے تیزی سے بیڈ روم کی جانب لوٹ آیا۔

بیڈ روم کا ماحول ابھی تک جوں کا توں تھا.... وہ دونوں اتنے مدہوش تھے کہ انہیں شکیل احمد کے لوٹ آنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شکیل احمد آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

مدھم روشنی میں اسے بیڈ پر لیٹے اجنبی مرد کا سر صاف دکھائی دے رہا تھا جب کہ تانیہ بدستور اس کے سینے میں سر

چھپائے دنیا جہان سے بے نیاز تھی.... قریب پہنچ کر شکیل احمد نے لمحہ بھر کے لیے لذت گناہ میں غرق اس جوڑے کو حقارت اور نفرت بھری نظروں سے گھورا اور پھر مرد کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

سائیلنسر لگے ریوالور نے ٹریگر دبتے ہی بلا تاخیر ایک دہکتا ہوا انگارہ اُگلا اور مرد چیخ مار کر سر تھامتے ہی بیڈ پر ساکت ہو گیا.... گولی سیدھی اس کے دماغ میں جا گھسی تھی اور اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہ مل سکی تھی....

پھر اسی لمحے شکیل احمد پر حیرت کا نیا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کیوں کہ کمرے میں گونجنے والی دوسری نسوانی چیخ تانیہ کی نہیں بلکہ کسی اجنبی لڑکی کی تھی.... گھٹی گھٹی اجنبی آواز سنتے ہی شکیل احمد تیزی سے لڑکی کی جانب پلٹا مگر اس اچانک نازل ہونے والی آفت سے گھبرا کر وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا چکی تھی۔

''کون ہو تم....؟'' شکیل احمد نے دھڑکتے دل کے ساتھ دھیمے مگر کرخت لہجے میں پوچھا۔

''عینی....'' لڑکی نے دھیرے دھیرے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو شکیل احمد نے آگے بڑھ کر بلب روشن کرنے کے لیے بٹن دبایا... مگر بلب شاید فیوز ہو چکا تھا۔

''کون عینی....'' وہ بلب کو کوستا ہوا واپس پلٹا۔ مگر مدھم روشنی میں لڑکی کا مرمریں بدن اس کے دل کی دھڑکن کو مزید بڑھا گیا۔ کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔

''تانیہ کی سہیلی ....اس کے اسپتال میں کام کرتی ہوں۔''

''اوہ نو....میں اس غلط فہمی میں تھا کہ شاید تم میری بیوی ہو، مگر....''

وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ عینی چہرے پر بکھرے بال سمیٹ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ وہ اپنے لباس سے ابھی تک بے پروا تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے مرد کی لاش کو پہلو میں چھوڑا اور بیڈ سے اُترتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولی:

''تم یقیناً شکیل احمد ہو....''

''ہاں۔'' شکیل احمد نے مختصر جواب دیا۔ اپنے ہاتھوں قتل کرنے کے بعد وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''تانیہ تمہارا بہت ذکر کرتی ہے۔ دیوانی ہے وہ تمہاری.... لیکن آج احساس ہوا ہے کہ اس کا پاگل پن کچھ غلط بھی نہیں ہے.... تم واقعی بہت ہینڈسم ہو۔'' وہ یوں مطمئن دکھائی دے رہی تھی جیسے کمرے میں کچھ ہوا ہی نہیں۔

شکیل احمد خود بھی اسے پہچان چکا تھا۔ تانیہ اکثر عینی کا ذکر کرتی رہتی تھی مگر ملاقات کا اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو.... مطلب یہ آدمی کون ہے؟''

''میرا دوست ہے.... بلکہ یوں سمجھو میرے دوستوں میں سے تھا۔ فیصل نام تھا مرحوم کا۔'' وہ ڈھٹائی سے آگے بڑھ کر شکیل احمد کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں خوف یا شرم کا شائبہ تک نہیں تھا: ''دراصل مجھے دوست بنانے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کا بہت شوق ہے.... کیا تم میرے ساتھ دوستی کرنا پسند کرو گے....؟''

''میں کہتا ہوں بکواس بند کرو اپنی.... سیدھی طرح بتاؤ کہ اس وقت تم یہاں کیا کر رہی ہو اور میری بیوی کہاں ہے....؟'' شکیل احمد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا تو عینی سہم سی گئی:

''بہت ظالم ہو تم۔ جوان لڑکیوں سے تنہائی میں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تمہیں تو..... زندہ ہے تمہاری بیوی۔ میرے عاشق کی طرح مر نہیں گئی۔ وہ ایمرجنسی ڈیوٹی پر ہے..... آج فیصل اچانک ملنے آ گیا تو میں نے تانیہ سے درخواست کر کے کچھ وقت یہاں گزارنے کی اجازت حاصل کر لی..... اس سارے معاملے میں وہ بے قصور ہے..... اسے کنفرم نہیں تھا کہ تم یوں اچانک ٹپکنے والے ہو، ورنہ بھی ہمیں گھر کی چابی نہ دیتی.... یہ سچ ہے کہ تانیہ بہت ذہین ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ شادی اس کی ذہانت سے نہیں بلکہ خوب صورتی سے مرعوب ہو کر کی ہے۔ سچ کہوں! تم تو دیکھنے میں ہی حسن پرست لگتے ہو.... کیوں ٹھیک کہا ناں میں نے؟'' تانیہ موقع کی نزاکت کو فراموش کر کے اس کے گرد اپنی اداؤں سے جال بُن رہی تھی۔

شکیل احمد کو اس کے وجود سے گھن محسوس ہونے لگی تھی۔ جب کہ تمام تر بے توجہی کے باوجود عینی اس کے

قریب ہونے کی کوشش میں تھی۔ یہاں تک کہ شکیل احمد اب اس کے جسم سے اٹھنے والی مسحور کن خوشبو کو بھی محسوس کرنے لگا تھا..... پھر جیسے ہی عینی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالنے کی کوشش کی شکیل احمد نے دھکا دے کر اسے واپس بیڈ پر پٹخ دیا۔ اس کی بے اعتنائی دیکھ کر عینی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر بچوں کی طرح پاؤں ہلانے لگی:

''مسٹر اینگری ینگ مین! مت بھولو کہ تم نے ایک جیتے جاگتے انسان کو قتل کیا ہے..... اور وہ بھی اپنے بیڈ روم میں۔'' عینی طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میں کہتا ہوں فوراً دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ ایک کے بجائے دو لاشیں پڑی دکھائی دیں گی یہاں پر۔'' وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

اس کی بڑھک سن کر عینی نے مترنم آواز میں قہقہہ لگایا ..... پھر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور بیڈ سے اتر کر کیٹ واک کرتی شکیل احمد کے قریب آ گئی:

''ضرور مار دینا..... مگر ایک آخری خواہش ہے کہ مجھے براہ راست گولی مت مارنا..... میں بہت اذیت پسند ہوں۔ مجھے قطرہ قطرہ، سسک سسک کر مرنا بہت اچھا لگے گا.....اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں اس کار خیر کو انجام دینا ہی ہوگا کیوں کہ تم نے فیصل کو قتل کیا ہے.....اور اس واردات کی عینی شاہد، صرف عینی ہے..... کیسا فلمی سین ہوگا وہ جب پولیس تمہیں قتل کے جرم میں گھر سے گرفتار کرے گی اور ثانیہ تمہارے جیتے جی بیوہ ہو جائے گی۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' وہ چونکا۔

''یہی کہ میں ناتواں سی لڑکی اس بھاری بھرکم لاش کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہوں..... اور یقین دلاتی ہوں کہ کبھی کسی کو اس بارے کچھ نہیں بتاؤں گی مگر.....'' عینی نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

''اب یقیناً تم بلیک میلنگ پر اتر آؤ گی.....''

''مجھے تمہاری ذہانت پر قطعاً شک نہیں ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی بیوی کے آنے سے قبل ہی معاملہ طے کر لو۔ ورنہ میں فون کر کے اسے سب کچھ بتانے والی ہوں۔'' عینی خباثت سے اپنی بائیں آنکھ کا کونا دبا کر بولی۔

''کیا چاہتی ہو.....؟'' شکیل احمد نے گہری سانس

لی۔

''پہلے تم سکون سے بیٹھ جاؤ.....لگتا ہے تانیہ خیال نہیں رکھتی تمہارا۔ چہرہ کیسے سرخ ہو رہا ہے۔ بچوں کی طرح غصہ آتا ہے تمہیں.....''عینی زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''گھبراؤ مت، مجھے بہت کم رقم چاہیے..... تمہیں فیصل کے بارے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اس کا بندوبست میں خود کرلوں گی۔''

''کتنی رقم چاہیے؟'' شکیل احمد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''صرف ایک لاکھ۔۔۔ وہ بھی نقد۔ ویسے جان بچانے کے لیے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

''اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارہ پاؤ گی.....؟'' شکیل احمد نے لاش کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

عینی نے کورے لہجے میں جواب دیا.....اور کلاک کی جانب دیکھ کر بولی:

''وقت تیزی سے گزر رہا ہے.....تم جلدی سے رقم نکال لاؤ۔ مجھے معلوم ہے نئے گھر کے ایڈوانس کے لیے تم نے رقم اپنی تجوری میں محفوظ کر رکھی ہے.....لہٰذا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' یہ کہہ کر عینی اپنی جگہ سے اٹھی اور خون آلود بیڈ شیٹ اکٹھی کر کے لاش کے سر اور جسم کے گرد لپیٹنے لگی۔

''کتنی مکاری اور کمینہ پن ہے تمہاری ذات میں.....'' شکیل احمد اس کی جرأت دیکھ کر بڑبڑایا تو عینی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

بیڈ روم سے نکل کر شکیل احمد اسٹڈی کی جانب بڑھا اور تجوری سے ایک لاکھ روپے نکال لایا۔ اس اثنا میں عینی لاش کا سر بیڈ شیٹ میں اچھی طرح لپیٹ چکی تھی۔

''اٹھاؤ پیسے اور فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ''.'' شکیل احمد نے ایک لاکھ روپے اس کے سامنے بیڈ پر پھینکے۔

''کیا تم محبت سے رخصت بھی نہیں کرو گے.....؟'' عینی نے رقم سمیٹ کر ادا سے کہا۔

''بکواس بند کرو.....اور نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ تمہیں بھی یہیں ڈھیر کردوں گا۔'' وہ غرایا۔

''تمہاری یہ عادت مجھے بہت پسند آئی ہے کہ شیر کی طرح غراتے رہتے ہو.....کاش تم سرکس کے شیر ہوتے اور بلی کی طرح میرے تلوے چاٹتے .....'' عادت کے ہاتھوں مجبور عینی نے جملہ چست کیا اور پرس سے برش نکال کر بال سنوارنے لگی:

''باہر سڑک کے کنارے میری گاڑی کھڑی ہے۔ اسے ریورس کر کے گیٹ کے پاس لے آؤ۔ تاکہ لاش ٹھونسنے میں آسانی رہے.....تب تک میں اپنا میک اپ ٹھیک کرلوں۔ ممکن ہے راستے میں کسی پولیس انسپکٹر کو پٹانا پڑ جائے۔''

عینی نے پرس سے کار کی چابی نکال کر اس کی طرف اچھالی اور گاڑی کا نمبر بتا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شکیل احمد کا خون اس کی حرکت دیکھ کر کھول گیا تھا.....مگر مرتا کیا نہ کرتا، چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

کچھ دیر میں تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے اور شکیل احمد نے عینی کی مدد سے لاش کو کار کے پچھلی سیٹوں کے درمیان ٹھونس کر اوپر سے چادر دے دی۔

اگلے ہی لمحے عینی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شیشہ نیچے کر کے اسے قریب بلایا:

''تانیہ آئے تو اسے کہنا کہ ہم تمہارے آتے ہی نکل گئے تھے.....اور ہاں پریشان مت ہونا۔ سب ٹھیک ہے.....اب تم سکون سے واپس جاؤ.....میرا لس ابھی تک خواب گاہ کے بستر میں تمہارا منتظر ہے۔'' عینی نے ایک ہوائی بوسہ اس کی طرف اچھالا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

.....☆.....☆.....

عینی کو رخصت کر کے شکیل احمد کمرے میں آیا اور بے دلی سے کپڑے تبدیل کر کے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ فی الحال وہ تانیہ کو فون کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ تانیہ کی آمد سے قبل ہی اپنی بدحواسیوں پر قابو پا کر پھر سے ہشاش بشاش دکھائی دینے لگے۔

عینی کی باتوں سے اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ تانیہ بے قصور ہے اور محض مروت میں اجازت دے کر پھنس گئی۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک بیڈ روم کا دروازہ کھلا

اور تانیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ شکیل احمد نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تو وہ اپنا پرس صوفے پر پھینک کر شوہر کی بانہوں میں سمٹ گئی۔

''تم نے بتایا ہی نہیں کہ آج واپس آنے والے ہو.....؟'' لہجے میں محبت بھرا شکوہ تھا۔

''بس اچانک واپسی کا پروگرام بن گیا۔ سوچا تمہیں سرپرائز دوں گا مگر.....''

''مگر مجھے گھر میں نہ پاکر پریشان ہوگئے.....اور موڈ آف ہوگیا۔'' تانیہ نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں بہت.....ایک اداسی برس رہی تھی در و دیوار سے تمہارے بنا۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''سوری ڈیر.....ایک ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اس لیے جانا پڑا۔''

''اٹس اوکے.....'' وہ مسکرا کر تانیہ کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں تانیہ کے بالوں کی رنگت بالکل عینی کے بالوں کی سی تھی۔ وہ تانیہ کو قتل کے بارے بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''چائے پیو گے.....لمبے سفر سے آئے ہو.....'' وہ اس کی بانہوں میں آتے ہی مدہوش سی ہوگئی۔

''دھکن ہی تو اتار رہا ہوں.....تم سا حسین و جمیل ہمسفر میسر آجائے تو زندگی میں تھکن کی گنجائش نہیں رہتی۔'' شکیل احمد نے ماحول کو خوشگوار بنانا چاہا۔

''ایک بات بتاؤ.....کیا میں ہمیشہ تمہاری نظروں میں پرکشش رہوں گی؟'' تانیہ نے پوچھا۔

''تمہارا حسن بے مثال ہے جانِ من ـــ۔ تم کبھی نہیں بدلو گی۔ خدا نے تمہیں خاص میرے لیے بنایا ہے.....اور میں تمہیں کبھی ماند نہیں پڑنے دوں گا۔'' شکیل احمد بھی اس کی قربت میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

''اور تمہیں میرے لیے.....لیکن جانے کیوں بعض اوقات میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔'' تانیہ نے اس کے کاندھے سے سر اٹھایا۔

''وہ کیوں.....؟'' شکیل احمد چونکا۔

''اس لیے کہ تم کام کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہتے ہو۔ اگر تمہارا دل کسی اور نے چرا لیا تو.....میں جیتے جی مر جاؤں گی شکیل۔'' تانیہ کے لہجے میں خوف سا تھا۔

''فضول باتیں مت سوچا کرو.....اب جاؤ اور اچھی سی چائے بنا لاؤ۔'' شکیل احمد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ دلاسہ سن کر تانیہ کچن کی جانب بڑھی اور پھر کچھ یاد آنے پر پلٹتے ہوئے بولی:

''تمہاری ملاقات عینی اور فیصل سے ہوئی تھی؟''

''ہاں.....میرے آتے ہی وہ لوگ یہاں سے رفو چکر ہوگئے تھے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ظاہر ہے تم نے رنگ میں بھنگ جو ڈال دیا ہوگا.....'' وہ کھلکھلا کر ہنسی اور قریب پہنچ کر بولی: ''تمہیں یاد ہے نا شادی سے پہلے ہم بھی کئی مرتبہ اپنے ایک دوست کے گھر ملے تھے۔''

''ہاں یاد ہے.....مگر جانے کیوں ان کا یہاں رکنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔''

''یوں نہیں سوچتے.....وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔ فیصل ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ وہ تمہاری جاب سے بہت متاثر ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو اور مجھ پر اعتماد ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ شکیل میرے بارے میں اتنا جذباتی ہے کہ جو شخص میرے قریب آنا چاہے گا جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔'' وہ فخر سے بولی۔

''اچھا.....اور کیا بتایا؟'' شکیل احمد نے اسے اکسایا۔

''یہ بھی کہ ہم نئے گھر کا ایڈوانس بھی دینے والے ہیں.....جو ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوگا۔''

''تمہیں یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' شکیل احمد نے برا منایا۔

''مگر کیوں.....وہ دونوں کوئی غیر تو نہیں۔''

''تم لوگوں کی نفسیات نہیں سمجھتیں.....لوگ اسی طرح دوسروں کو کرید کر ان کی مالی حیثیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں جس سے جرائم میں مدد ملتی ہے.....احتیاط کیا کرو میری معصوم بیوی۔''

شکیل احمد سمجھ گیا تھا کہ عینی نے تانیہ کی مہیا کردہ معلومات سے فائدہ اٹھا کر ایک لاکھ روپے ہتھیائے تھے۔ یہ رقم انہوں نے گھر میں رکھ کر غلطی کی تھی۔

......☆......☆......

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔

شکیل احمد اور تانیہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ تانیہ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا.....اور پھر پلٹ کر شکیل احمد کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے بولی:

''کوئی لڑکی ہے.....تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

شکیل احمد اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گیا اور ریسیور تھامتے ہوئے بولا:

''یس شکیل احمد سپیکنگ!''

''کیسے ہو شکیل احمد.....'' دوسری جانب سے عینی کی آواز سنائی دیتے ہی اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ''جی فرمائیے مس طاہرہ خیریت! آپ نے اس وقت فون کیوں کیا.....؟''

عینی نے شکیل احمد کی بدحواسی سے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا: ''تم اچھے شوہر ہی نہیں، بہترین اداکار بھی ہو..... مجھے یقین ہے تانیہ تمہارے پاس ہی کھڑی ہوگی۔''

''ہاں یقیناً.....''

''یعنی اب مجھے فون پر بھی آواز دھیمی رکھنا پڑے گی.....یہ تو بہت ناانصافی ہے ڈارلنگ۔'' وہ اپنی حرکتوں پر اتر آئی تھی۔

''مس طاہرہ! جب تک آپ کام کی نوعیت نہیں بتائیں گی میں مدد نہیں کر سکوں گا۔'' وہ دل میں اسے کوستا ہوا بولا۔

''تم پچاس ہزار روپے لے کر سیدھے میرے فلیٹ میں آجاؤ۔ میں وہیں تمہاری منتظر ہوں..... یاد رہے اگر تم ایک گھنٹہ کے اندر نہ پہنچے تو اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' عینی نے غراتے ہوئے دھمکی دی اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

''او کے.....'' شکیل احمد نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''خیریت تو ہے؟'' تانیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''مجھے فوری دفتر جانا ہوگا.....'' باوجود کوشش کے وہ اپنی آواز میں لرزش نہیں چھپا سکا تھا۔

''مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے

ہو؟'' تانیہ عقب سے نکل کر اس کے روبرو آ گئی..... پھر اچانک کوئی نیا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی:

''سچ بتانا..... کسی دوسری عورت کا معاملہ تو نہیں ہے؟''

''اپنے ذہن میں وہم مت پالو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ جھنجلایا۔

''پھر تم الجھے الجھے کیوں ہو؟''

''یقین کرو مجھے دفتر والوں نے بلایا ہے۔ میں بھلا تم سے کیوں جھوٹ بولوں گا۔'' شکیل احمد نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''پھر وہ کون تھی جس نے تمہیں فون کیا..... مجھے یقین ہے وہ طاہرہ نہیں تھی۔ تم نے اس کا غلط نام لیا ہے۔ طاہرہ کی آواز میں اچھی طرح پہچانتی ہوں اور وہ بھی مجھے جانتی ہے۔ یہ کوئی اور لڑکی تھی جو آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اپنی شناخت مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو..... بولو کون تھی وہ؟'' تانیہ باقاعدہ تفتیش پر اتر آئی۔

شکیل احمد کافی دیر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب تانیہ کسی بات پر مطمئن نہ ہوئی تو وہ سب کچھ سچ سچ بتانے پر مجبور ہو گیا..... وہ مزید جھوٹ بول کر گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تانیہ بدگمان ہو، یہ کسی طور اسے منظور نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے تانیہ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

''تم رقم دے کر اس کا منہ بند کر دو.....'' تانیہ ساری کہانی سن کر بے اختیار رو دی ''تم فوراً رقم لے جاؤ اس کے پاس۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی..... میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی۔''

''مگر وہ رقم ہم نے گھر خریدنے کے لیے بہت محنت سے جمع کی ہے..... اور میں پراپرٹی ڈیلر سے بات بھی کر چکا ہوں۔'' شکیل نے اسے سمجھانا چاہا۔

''میرے ہر خواب کی تعبیر صرف تم ہو شکیل۔ مجھے اس نیند سے زبردستی جگانے کی کوشش مت کرو جو مجھے جاگتی آنکھوں سے اپنے گھر کی تباہی دیکھنے پر مجبور کر دے..... پلیز تم رقم اسے دے آؤ۔ ہم یہ شہر چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جا بسیں گے جہاں کوئی ہمیں نہ جانتا ہو۔''

تانیہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ

میرا جیسا

جو میرے جیسا ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو فرشتہ نہ فرشتوں جیسا ہو
نہ دور دیس کا شہزادہ ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو وقت کا امام
نہ پرستان کا راجہ ہو
میں انسان ہوں جیسی
وہ میرے جیسا ہو
میرے دکھ کو جانتا، میرے خلوص کو پہچانتا ہو
وہ میری ذات کی سب گہرائیوں سے واقف ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
منافقتوں کے پردے میں وہ نہ لپٹا ہو
وہ میری حساسیت سے آشنا ہو
وہ دلداریوں کے سب ہنر سے واقف ہو
وہ میرا ہم سفر وہ میرا ساتھی وہ میرا رہبر ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

اثبات میں سر ہلاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رقم تجوری سے نکالتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ عینی یقیناً تانیہ کو ورغلا کر پوچھ چکی ہوگی کہ ہمارے پاس کل کتنی رقم موجود ہے..... اور وہ اسی رقم کو ذہن میں رکھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی۔

عینی ایک ناگن صفت عورت تھی۔ مگر شکیل احمد بھی اتنا کمزور نہیں تھا کہ ہر بار اس کے ڈنک کا نشانہ بنے۔ چنانچہ اس مرتبہ رقم لے جانے کے بجائے اس نے معاملے کو جڑ سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ریوالور لوڈ کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......

عینی کا فلیٹ وہاں سے پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ وہ ذہنی طور پر ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ منزل پر پہنچ کر کار پارک کرنے کے بعد شکیل احمد لفٹ کے ذریعے تیسرے فلور پر جا پہنچا..... جلد ہی وہ عینی کے فلیٹ کے سامنے موجود تھا۔

''دروازہ کھلا ہے.....''

کال بیل کا بٹن دباتے ہی انٹر کام بیل سے عینی کی مدھر آواز سنائی دی تو وہ دروازہ کھول کر بلا جھجک اندر چلا گیا۔ فلیٹ میں مدھم روشنی تھی اور دھیما میوزک بج رہا تھا۔ لیکن عینی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ میوزک کی آواز کے تعاقب میں آگے بڑھا اور ایک کمرے میں داخل ہو گیا جسے خواب گاہ کے طور پر ترتیب دیا گیا تھا..... کمرے میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اور سامنے بیڈ پر عینی شب خوابی کا لباس پہنے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''ویلکم..... '' وہ شکیل احمد کو دیکھ کر خوشدلی سے مسکرائی۔ ''جانے کیوں مجھے وہم سا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔ لیکن اچھا لگا تمہیں سامنے دیکھ کر.....''

شکیل احمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''اب آگئے ہو تو دور کیوں کھڑے ہو..... آؤ میرے پاس بیٹھو۔ آج بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں تم سے۔'' عینی اسے دیکھ کر کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

مگر شکیل احمد باتوں میں وقت برباد کرنے کے بجائے کام نمٹانے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عینی کو سامنے دیکھتے ہی اس نے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

عینی کی آنکھیں اب ریوالور کی نال پر مرکوز تھیں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ سنبھل کر اٹھ بیٹھی اور پھر خوفزدہ ہو کر چلائی۔

''گولی مت چلانا شکیل..... دیکھو پلیز! ایسا مت کرنا۔'' عینی کی آواز کانپ رہی تھی۔

''مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے..... تم جیسی جھوٹی، مکار اور حرافہ یہ سمجھتی ہے کہ میں بے وقوف ہوں اور جب بھی رقم مانگو گی میں آسانی سے تمہارے ہاتھ میں تھما کر گڑگڑاؤں گا کہ پولیس کو میرے راز سے آگاہ مت کرنا..... تم مجھے ساری زندگی بلیک میل کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہو شاید۔ تمہارے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے عینی..... آج میں ہر صورت تمہارا بندوبست کر کے جاؤں گا۔''

جیسے ہی عینی دوڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچی شکیل احمد نے ایک زوردار گھونسا اس کے پیٹ میں رسید کیا اور وہ اچھل کر کئی فٹ دور جا گری۔

''تم پاگل ہوئے چلے جا رہے ہو..... دیکھو تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جس سے مجھے نقصان پہنچے۔'' عینی درد کی شدت سے دوہری ہو رہی تھی مگر نظریں بدستور شکیل احمد کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور پر مرکوز تھیں۔

''شکیل احمد پلیز..... گولی مت چلانا..... میری بات سنو پلیز۔''

عینی شدید تکلیف کے باعث یہی کہہ پائی تھی کہ شکیل احمد کو اپنے عقب میں کسی آہٹ کا احساس ہوا۔ خطرے کی بو پاتے ہی اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا..... مگر اسی لمحے ایک شدید ضرب لگتے ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور گرفت سے آزاد ہو کر فرش پر جا گرا۔ ساتھ ہی دوسرا گھونسا شکیل احمد کے جبڑے پر پڑا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے..... وہ منہ میں اپنے ہی گرم گرم خون کا نمکین ذائقہ محسوس کرنے لگا تھا۔

لیکن اس موقع پر شکیل احمد نے وقت ضائع کرنے یا حواس کھونے کے بجائے۔ تیزی سے ہوا میں غوطہ لگایا اور کچھ فاصلے پر پڑے ریوالور کو دوبارہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا..... ریوالور اٹھا کر اس نے پراعتماد نظروں سے حملہ آور نوجوان کی طرف دیکھا اور بلا تاخیر نشانہ باندھ کر ٹریگر دبا

دیا۔
فائر ہوتے ہی کمرے میں ایک بھیانک چیخ گونجی اور وہ آدمی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہوگیا۔ اسے گرتا دیکھ کر شکیل احمد نے گہری سانس لی اور بغور مرنے والے کا چہرہ دیکھنے لگا۔
ادھر عینی بھی تیزی سے نوجوان کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے لب تھرتھرا رہے تھے، جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور ہونٹوں سے سسکیاں اُبل رہی تھیں۔
''فیصل.....فیصل.....''
وہ بے سدھ نوجوان کو جھنجوڑ رہی تھی جو اس فانی دنیا سے بہت دور جاچکا تھا۔
''فیصل.....کون فیصل.....؟'' شکیل بری طرح چونکا۔
''میں نے یہی سب بتانے کے لیے تمہیں یہاں بلایا تھا کہ فیصل مرا نہیں تھا..... یہ سب تمہیں پھنسانے کے لیے ایک چال تھی۔'' عینی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''لیکن میں نے تو اسے قتل کر دیا تھا.....'' وہ حیرت سے بولا۔
''نہیں.....تم نے اسے نہیں مارا تھا..... اس رات تمہارے ریوالور میں موجود گولیاں نقلی تھیں۔ فیصل کو یقین تھا کہ تم ہمیں بستر پر دیکھتے ہی گولی چلا دو گے لہٰذا اس نے گولیاں تبدیل کر دی تھیں۔ میں نے جان بوجھ کر تانیہ کا سلیپنگ گاؤن پہنا تھا تاکہ تمہارا ذہن ماؤف ہوجائے اور تم یہی سمجھو کہ میں تانیہ ہوں..... نتیجہ ہماری توقع کے عین مطابق رہا اور تم نے ہمیں دیکھتے ہی فائر کر دیا..... قتل کے بعد میں نے تمہیں لاش سے دور ہی رکھا تم خون اور رنگ کا فرق محسوس نہ کرسکو۔ اس مقصد کے حصول میں تمہارے بیڈ روم کی ہلکی نیلی روشنی نے ہماری بہت مدد کی.....'' عینی مسلسل روئے چلی جارہی تھی۔
''کیوں کیا تم نے یہ سب.....'' شکیل احمد سر تھام کر اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔
''تمہاری بیوی تانیہ کے کہنے پر.....''
''کک.....کیا..... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' اسے زمین گھومتی محسوس ہوئی۔
''سچ کہہ رہی ہوں.....اور میں نے بھی بنا عقل استعمال کیے اس احمقانہ سازش میں ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا.....کیوں آگئی میں اس کی باتوں میں.....'' وہ فیصل کا سر گود میں رکھ کر بین کرنے لگی۔
''تانیہ.....نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کرسکتی.....تم ایک بار پھر جھوٹ بول کر الجھانا چاہتی ہو مجھے۔'' تانیہ کا نام سن کر شکیل احمد نے کہا۔
''فیصل کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں.....یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ وہ فیصل کو پسند کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ میں دھیرے دھیرے تمہاری جیب سے اس کے لیے رقم نکلواؤں۔ تاکہ معقول رقم جمع ہوتے ہی وہ تم پر کوئی بڑا الزام لگا کر علیحدگی حاصل کرلے اور فیصل سے شادی کرنے کے بعد یہ ملک چھوڑ جائے.....اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ بنا کسی جواز کے خلع مانگے گی تو تم اسے پھوٹی کوڑی نہیں دو گے۔ اسی لیے تانیہ نے یہ چال چلی اور مجھے بھی معقول رقم کا لالچ دیا..... مگر اسی دوران مجھے فیصل سے محبت ہوگئی۔ وہ بھی مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے یہی فیصلہ کیا کہ تمہیں یہاں بلا کر حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔ کیوں کہ آج رات ہم دونوں یہ شہر چھوڑ کر بہت دور جانے والے تھے۔ مگر تمہاری جلد بازی نے ہمیں برباد کر دیا شکیل احمد.....''
عینی ایک مرتبہ پھر فیصل کے سینے پر سر رکھے بین کر رہی تھی..... شکیل احمد دیر تک بت بنا ان دونوں کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس نے فیصل کی نیم وا بے نور آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کیں اور اٹھ کر ٹیلی فون کی جانب بڑھا تاکہ پولیس اسٹیشن میں قتل کی اس واردات کی اطلاع دے سکے اعتراف جرم کرلے۔

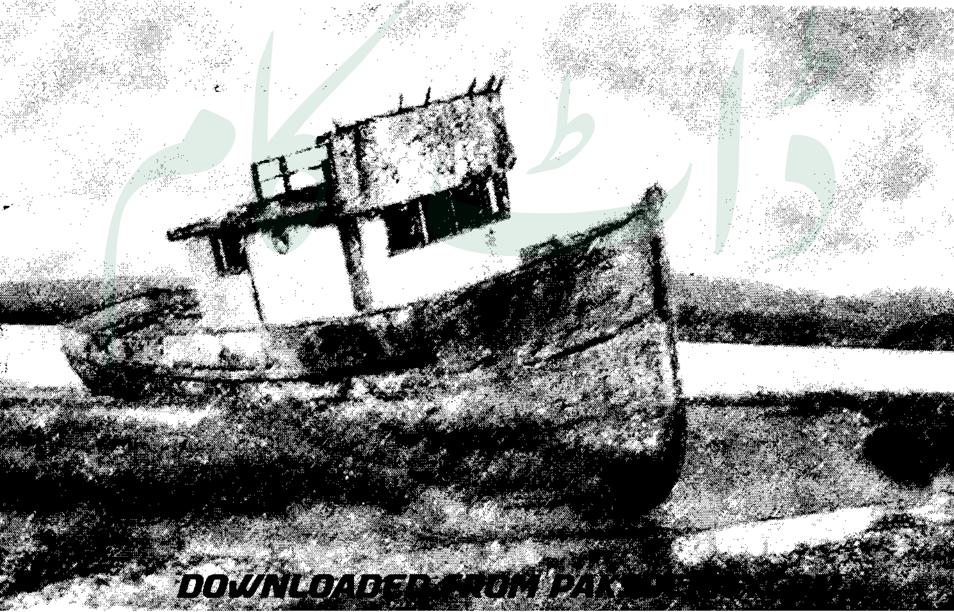


ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 11

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزر رہے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔





تیمور نے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں تیمور نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں یا ان کا اگلا اقدام کیا ہوگا مگر وہ بغور ان کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش میں ہوں، مگر نواب زادی کچھ نہیں بولی اور وہ نرمی سے بولے تھے۔

''آپ کا کوئی بھی اقدام بہت سی زندگیوں کو متاثر کرسکتا ہے نواب زادی' آپ کو کوئی بھی فیصلہ بہت محتاط ہوکر لینا پڑے گا اجازت دیجیے۔'' اس نے اجازت چاہی تھی اور پھر مڑ کر چلتا ہوا دور نکلنے لگا تھا۔

عین النور نے جیسے دانستہ ان کی طرف سے رخ پھیر لیا تھا حتیٰ کہ تیمور بہادر یار جنگ چلتے ہوئے احاطے سے نکل گئے تھے اور تب ہی وہ اسی طور کھڑی رہی تھیں۔



''اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں ہم۔'' حکمت صاحب نے شطرنج کی چال چلتے ہوئے کہا تھا اور نواب سیف الدین نے سر ہلایا تھا گویا وہ ان کو اجازت دے رہے تھے' حکمت صاحب نے ان کی طرف چند لمحوں تک خاموشی سے دیکھا اور پھر نرمی سے بولے تھے۔

''ہمیں بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کرنا بھی ہے مگر ہم تذبذب سے نکل نہیں پا رہے تھے کہ آیا ہمیں وہ بات کہنا چاہیے بھی کہ نہیں۔''

''کہیے حکمت صاحب...... آپ کو اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی' آپ نواب فیملی کا حصہ ہیں آپ کو ہمیشہ بھائی سمجھا ہے برسوں کے مراسم ہیں۔ اب بھی آپ ایسی بات کہیں گے تو باخدا ہمیں بہت ناگوار گزرے گا۔'' نواب صاحب نے متانت سے کہا تھا۔

حکمت صاحب مسکرا دیے تھے پھر قہوے کے سپ لگاتے ہوئے بولے۔

''ہمیں ڈر تھا نواب صاحب کہیں ہماری بات کو مداخلت نہ سمجھا جائے آپ عزت دیتے ہیں بہت بات ہے آپ کی دوستی گراں قدر ہے' نواب صاحب آپ انتہائی نفیس طبیعت کے حامل انسان ہیں میں آپ کے فیصلوں پر تنقید نہیں کرنا چاہتا نا میرا ارادہ ان فیصلوں کو پرکھنا اور آپ کو غلط ثابت کرنا ہے۔ مگر حیدر میاں کے بارے میں جو فیصلہ آپ نے برسوں پہلے لیا تھا وہ ہمیں نامناسب لگتا ہے حیدر میاں کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے' عین بٹیا ہمیں بھی اس طور عزیز ہیں مگر مرزا سراج الدولہ یا ان کے سپوت خاص غیر متوازن شخصیات کے حامل ہیں ان میں وہ متانت اور بردباری ناپید ہے جو نواب خاندان کا حصہ ہے۔'' حکمت صاحب نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کو نواب صاحب تک پہنچایا تھا نواب صاحب سر ہلانے لگے تھے۔

''ہم آپ کی بات کو سمجھ رہے ہیں محترم حکمت صاحب یہ تمام چیدہ چیدہ باتیں ہیں جو ہمارے علم میں بھی ہیں مگر بات یہ ہے کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو بات بات دور تک جائے گی ہم نواب خاندان کی عزت اور توقیر کو ملیا میٹ ہوتے نہیں دیکھ پائیں گے۔'' نواب صاحب نے نرمی سے کہا تھا حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

''کیا بات کرتے ہیں نواب صاحب ایک رکھ رکھاؤ کے لیے اپنی پھول سی بچی کی قسمت ایسے نکمے انسان سے جوڑ دیں گے جو اچھا انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں' آپ کو علم ہے مرزا صاحب کیسے انسان ہیں؟ ان کے بارے میں ایک بات سننے میں آئی ہے کہتے ہیں ان کی کوئی دختر ہیں جو بازار کی زینت ہیں مگر مرزا صاحب اس بات سے آنکھیں میچے رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ان دختر کو دنیا کے سامنے قبول نہیں کرتے۔ حکمت صاحب نے ان کو جتایا تھا نواب صاحب چونکتے ہوئے ان کی سمت دیکھنے لگے تھے پھر متانت بھرے لہجے میں بولے۔

''آپ جانتے ہیں حکمت صاحب امرا کی زندگیوں میں مخفی گوشے ہوتے ہیں اگر مرزا صاحب ان کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تو ہم ان کو تو کرید نا ضروری خیال نہیں کرتے یہ بات مناسب نہیں ہوگی برسوں کے مراسم مٹی میں مل جائیں گے پھر آپ مرزا صاحب کے مزاج سے واقف ہیں وہ بات کو بہت انتہائی سطح پر لیتے ہیں اور ان کا مسئلہ بنالیتے ہیں' ہم ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بات نہیں کرسکتے ان کی نجی زندگی پر انگلی اٹھانا ان کو آئینہ

دکھانا ہے اور آپ جانتے ہیں آئینہ چاہے درست شبیہہ دکھاتا ہو مگر یہ ناقابل قبول لگتا ہے میں ان معاملات سے لاعلم نہیں ہیں ہوں، ہم بھی سوچتے رہے ہیں عین ہمیں بہت عزیز ہیں مگر فی الحال تقسیم کی بات زوروں پر ہے اور ہم اس رشتے کے معاملات کو زیادہ ہوا دینا نہیں چاہتے مرزا صاحب کو ایک بات باور کرادی تھی کہ اگر پاکستان بنتا ہے تو ہم پہلے انسان ہوں گے جو اس منزل کی سمت گامزن ہوں گے ایک بار ہم پاکستان پہنچ گئے تو پھر رشتے کی بات بھی ماضی کا حصہ بن جائے گی......اس سے قبل ہم اس معاملے کو اٹھانا نہیں چاہتے۔'' نواب صاحب بولے اور حکمت صاحب نے قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

''ہم آپ کی بات سمجھ رہے ہیں نواب صاحب مگر ہمیں لگا تھا کہ کہیں مرزا صاحب آپ کو کس چال کا حصہ نہ بنالیں ان کا دماغ کانگریس والا ہے نا الٹی چالیں چلتے ہیں۔'' حکمت صاحب مسکراتے ہوئے بولے اور نواب سیف الدین پٹوڈی مسکرادیے تھے۔

''ہم مرزا صاحب کے دماغ سے بخوبی واقف ہیں حکمت صاحب درحقیقت ان کے کانگریس والے دماغ میں خناس بھرا ہے فی الحال ان کو چھیڑنا مناسب نہیں وقت آنے دیجیے ہم تمام معاملات کو بہت سلیقے سے نمٹا لیں گے۔'' نواب صاحب بولے اور حکمت صاحب نے دیکھا تھا۔

''ہمیں امید ہے ایسا ہی ہوگا۔''

''ان شاء اللہ۔'' نواب صاحب بولے تھے۔



''نواب زادی عین النور، فتح النساء کے سامنے جارکی تھیں اور فتح النساء ان کو سر اٹھا کر حیرت سے دیکھنے لگی تھیں۔

''نواب زادی آپ یہاں؟'' فتح النساء احتراماً ان کے احترام میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، عین النور نے ان کی سمت دیکھا تھا۔

ان کی نگاہیں بے تاثر تھیں اور چہرہ سپاٹ وہ جیسے ان کسی بھی قسم کے احساسات سے اس لمحے عاری دکھائی دی تھیں، عین نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا جیسے وہ کچھ شرمندہ دکھائی دی تھیں انہوں نے فتح النساء کا ہاتھ تھاما اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم اپنے کیے پر شرمندہ ہیں فتح النساء ہمیں آپ پر اس طور شک کرنا نہیں چاہیے تھا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم نے کچھ غلط کیا یا آپ نے ایسا کہہ کر غلط کیا مگر بات کبھی کبھی یہ ہوئی ہے کہ معاملات اس طور الجھے دکھائی دیتے ہیں کہ بات سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔'' وہ جیسے معذرت کے باوجود اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں اور فتح النساء نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا تھا، بس کچھ جتائے بنا خاموشی سے دیکھا تھا عین النور نگاہ پھیر گئی تھیں اور نرمی سے بولی تھیں۔

''آپ جانتی ہیں ہم کسی رشتے کو لے کر کس درجہ حساس ہیں، ہم حیدر میاں کے بارے میں کوئی بات غلط سوچنا نہیں چاہتے جو بھی ہے ایک رشتے کا حوالہ درمیان موجود ہے اور وہ رشتہ چاہے جیسا بھی ہو ہم اس کو معتبر دیکھنا چاہتے ہیں یہ ہماری توقعات ہیں یا جو بھی ہے مگر ہم حیدر میاں کے متعلق کچھ ایسا ویسا نہیں سننا چاہتے، ہمیں آپ سے کوئی اختلاف نہیں، ہم آپ سے کسی طرح کی کوئی مخالفت نہیں رکھتے، آپ ہماری بچپن کی سہیلی ہیں ہم آپ کے جذبات کو مجروح کرنے پر اور دل دکھانے پر معذرت خواہ ہیں ہمیں آپ کے کہنے پر کوئی شک وشبہ نہیں ایسا یقیناً ہوا ہوگا ہم جانتے ہیں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتیں۔ ایسا کچھ سلسلہ رہا ضرور ہوگا مگر ہم ان معاملات کی چھان بین کر کے ایک رشتے کی توقیر کرنا نہیں چاہتے، پرکھنے سے رشتہ باقی نہیں رہتا، کسوٹی بہت سے رشتوں سے ان کا فطری حسن اور حرمت چھین لیتی ہے ہم اس ایک رشتے کو معتبر سمجھتے آئے ہیں، ہمیں سمجھ نہیں آرہا کہ آپ سے کیا کہیں یا کون سے الفاظ تلاش کر کے وضاحت دیں مگر ہمارا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔'' عین النور کا لہجہ بہت دھیما اور جذبات سے بوجھل تھا ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور فتح النساء نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کی نمی صاف کی تھی اور مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''ہمیں اندازہ ہے نواب زادی ہم آپ سے بدگمان نہیں ہیں، ہمیں آپ سے کوئی عداوت نہیں، ہم آپ کے لیے دل میں کوئی میل نہیں رکھ سکتے، ہم آپ کے خلاف

نہیں سوچ سکتے ہیں' آپ کے مخالف نہیں جاسکتے' ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے' آپ کی دوستی اور آپ ہمارے لیے اللہ کا بہترین انعام ہیں' ہمیں جتنی محبت اس گھر سے اور اس گھر کے افراد سے ملی ہے۔ ہم اس کے لیے اپنے رب کا جتنا شکر ادا کریں وہ کم ہے۔'' فتح النساء نے ان کو جھکنے سے قبل اٹھا دیا تھا اور اس عمل پر عین نے ان کو تھام کر گلے سے لگالیا تھا فضا صاف ہوگئی دلوں کے میل آنسو کے بہاؤ میں بہہ کر اپنا وجود کھونے لگے تھے۔



جلال خاموش سا بیٹھا تھا جب نواب صاحب نے آ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا جلال نے چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ مگر جلال فوری طور پر کچھ بولے نہیں تھے اور نواب صاحب جیسے خاموشی میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''آپ سوئے نہیں ابا جان؟'' جلال نے قصداً اس خاموشی کو توڑا تھا اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''ہم اپنے کمرے کی سمت جا رہے تھے مگر نگاہ آپ پر پڑی تو ہم اس طرف آ گئے آپ کا چہرہ بہت متفکر لگ رہا ہے ایسے کیا معاملات میں کہ آپ ہم سے ڈسکس نہیں کر رہے؟'' جلال نے چونک کر ان کو دیکھا تھا۔

کیا وہ جانتے تھے کہ گھر میں ان کی شخصیت کو لے کر کیا موضوع زیر بحث تھا' کیا جلال کو ان سے رجوع کرنا چاہیے تھا؟

''نہیں ابا جان ایسی کوئی بات نہیں' ہم سونے کی کوشش کر رہے تھے نیند نہیں آئی تو ہم اٹھ کر باہر آ گئے شاید موسم بدل رہا ہے اور اندر ایک گھٹن اسی باعث تھی۔'' جلال نے بات بنادی تھی نواب صاحب جہاندیدہ نگاہوں سے ان کو دیکھ رہے تھے اتنا تو وہ جان گئے تھے کہ معاملات یہ نہیں تھے بات کوئی اور تھی اور جلال دانستہ بات کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''آپ کو لگتا ہے آپ اتنے بڑے ہوگئے ہیں کہ اپنے والد صاحب سے حقائق کو چھپا سکتے ہیں؟'' نواب صاحب نے کہا تھا اور جلال چونک گئے تھے۔

''ایسی بات نہیں ہے ابا جان، ہم اپنے دل کی بات آپ سے کہنے کے عادی پہلے ہیں ہم کچھ چھپا نہیں سکتے اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم آپ سے براہ راست کہہ دیتے۔'' جلال نے کہا تھا اور نواب صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے ان کی نظریں جیسے الزام دیتے ہوئی تھیں اور جلال کو اس لمحے اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔ نواب صاحب نے جانے کیا سوچ کر اپنا دست شفقت جلال کے کندھے پر رکھا تھا۔

''ابا جان ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں' آپ سے جو انسیت ہے وہ فطری ہے' آپ کی پدرانہ شفقت کا کچھ نعم البدل نہیں' آپ کا دست شفقت سر پر ہے تو زندگی میں کچھ بھی کمی نہیں لگتی ہم خود کو اس دنیا کا طاقتور ترین انسان سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے ساتھ آپ ہیں ابا جان اور ہم چاہتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ آپ کا یہ سایہ ہمارے سر پر اس طور سلامت رہے اور آپ کا دست شفقت اسی طور ہمارے کاندھے پر قائم رہے اور ہم دنیا کے طاقت ور ترین انسان رہیں۔ ہم دنیا پر حکمران کے خواہاں نہیں نا اس طاقت کے بل بوتے پر کوئی ناروا سلوک کسی کے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں مگر یہ طاقت ور ہونا ایک اعزاز ہے اور یہ اعزاز آپ کے باعث ہے اور ہم یہ اعزاز ہمیشہ اپنے ہمراہ رکھنا چاہتے ہیں۔'' جلال بولا تھا تو نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا تھا پھر ان کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے بولے تھے۔

''ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے سپوت دنیا کے طاقت ور ترین انسان ہیں اور ہمارے وجود کے باعث ہیں ہم آپ کو اس طور مضبوط اور طاقت ور دیکھنے کے خواہاں ہیں' ہمیشہ...... چاہے ہم آپ کے ساتھ رہیں یا نہ رہیں۔'' نواب صاحب بولے تھے اور جلال کے دل پر جیسے کسی نے انی سے وار کیا تھا وہ فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

''آپ ہمارے ساتھ رہیں گے ابا جان آپ کا دست شفقت کسی طور پر ہمارے سر پر سلامت رہے گا، ہم ہر دعا میں اللہ سبحان و تعالیٰ سے آپ کی درازعمر کی دعا مانگیں گے ابا جان' ہم آپ سے بہت محبت کرتے ہیں ابا جان' ہم آپ کو ہمیشہ اپنے ہمراہ کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں' آپ کا وجود

ہمارے لیے اس طور قیمتی ہے ہم آج بھی خود کو ویسا ہی ناتواں اور کمزور پاتے ہیں جیسا تب محسوس کرتے تھے جب ایک قدم بھی چل نہیں پاتے تھے' آپ نے ہمارا ہاتھ تھام کر ہمیں چلنا سکھایا قدم قدم ہمیں حوصلہ دیا، اس لمحے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے ابا جان ہم ان لمحوں کا قرض اتارنے لائق نہیں ہیں۔'' جلال نے کہا تھا ان کا لہجہ جذباتی تھا نواب صاحب نے شفقت سے ان کو دیکھا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

''بیٹا والدین کبھی اپنے بچوں پر کوئی احساس نہیں کرتے ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو پرورش کریں' ان کو پروان چڑھائیں' ان کو پھلتا پھولتا دیکھیں' والدین تو مالی کی مانند ہوتے ہیں ایک چھوٹا سا پودا لگاتے ہیں اور پھر اس ننھے سے پودے کی نشوونما میں اپنی تمام توجہ صرف کردیتے ہیں' ہم اتنی سی بھی غرض نہیں رکھتے کہ ہم اس ننھے پودے کی چھاؤں میں بیٹھ کر ستا سکیں میں فقط اس ننھے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر ہی خوش ہوں اس کو نشوونما پاتا دیکھ کر خوش ہوں ہم اور سدا اس ننھے پودے کو ایک تناور درخت کی مانند مضبوطی سے تنا کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔'' نواب صاحب نے جلال کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اور جلال نمی سے بڑی آنکھوں سے ان کے ہاتھ کو تھام کر لبوں سے لگاتا ہوا ان کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

''ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں ابا جان۔'' ان کا لہجہ لغزش سے پُر تھا۔

''یہ معذرت کس باعث ہے نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی۔''

''ہم نے ایک کوتاہی کی ہے ہم آپ سے کہہ نہیں سکتے مگر ہم نے جو بھی اپنے ذہن میں سوچا ہے وہ ہمیں اس لمحہ بہت شرمندہ کررہا ہے ہم اپنی نظروں میں خود چھوٹا محسوس کررہے ہیں۔ اس عمل کو دیکھتے ہوئے ہم کہنا چاہتے ہیں کہ وہ عمل فقط سوچنے میں ہی ہمارے لیے باعث شرم ہے ہم اپنی سوچ میں ہی گرا ہوا محسوس کررہے ہیں' ہمیں معاف کردیں؟'' جلال نے شرمندہ ہوکر ان کی سمت دیکھا تھا انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

''اب اگر آپ کے دل سے وہ بوجھ سرک گیا ہے تو آپ جا کر منہ دھویے اور سو جایئے ہم آپ کو مزید پریشانی نہیں دیکھ سکتے' آپ ہمارے لخت جگر ہیں آپ ذرا سی بھی تکلیف میں ہوتے ہیں تو ہم اس سے زیادہ تکلیف اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔'' ابا جان نے کہا تھا اور جلال شرمندہ ہوکر رہ گئے تھے۔

اسے نہیں لگا تھا ایسے بردبار انسان کبھی ایسے کسی گناہ کے مرتکب رہے ہوں گے وہ ایک خاص چارم اپنی شخصیت میں رکھتے تھے۔ جلال اٹھا تھا اور جانے لگا تھا جب نواب صاحب نے پیچھے سے پکارا تھا۔

''نواب زادہ جلال الدین۔'' اور وہ رک کر پلٹ کر ان کو دیکھنے لگا تھا نواب سیف الدین نے ان کو دیکھا تھا پھر نرمی سے گویا ہوئے تھے۔

''جس گناہ کے مرتکب آپ ہمیں سمجھ رہے ہیں وہ ہم سے کبھی سرزد نہیں ہوا' ہم آپ کی اماں جان سے ہمیشہ وفادار رہے ہیں' ہم نے مکمل دل اور دماغ کے ساتھ اپنی زوجہ کو اس کے حق زوجیت دیا ہے' ہم نے اس میں کبھی کسی کو شریک نہیں کیا' ہمیں ان خاتون سے محبت ضرور تھی مگر ہم اس محبت کو اس دن فراموش کر بیٹھے تھے جس دن ہم نے آپ کی اماں جان سے نکاح کیا تھا ہم نے فتح النساء کو بیٹی سمجھا ہے' اسے بیٹی کی طرح شفقت اور محبت دی ہے' وہ ہمارے لیے عین جیسی ہیں' ہم ان کے والد کا احسان نہیں بھول سکتے ایک بار ہم پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور اس حملے میں ہمیں محفوظ رکھنے والی اللہ کی ذات کے علاوہ ایک ذات جو شامل تھی وہ فتح النساء کے والد صاحب کی تھی ان کے والد صاحب نے ہمیں اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ وہ ہمارے قریبی دوست تھے ہمیں عزیز تو پہلے بھی تھے مگر اس عمل کے بعد ہمارے دل کے اور بھی قریب ہوگئے ہم نے ان کو بھائی کا درجہ دیا اور ان کی عزت کی ان کی حادثے میں موت کے بعد جیسے ان کی ذمہ داری ہمارا فرض ہوگئی' ہم نے فتح النساء کو اپنی اولاد کی طرح سمجھا ان کو شفقت پدرانہ شفقت اور محبت سے نوازا کیونکہ ہمیں یہ ضروری لگا ہم نے یہ کوئی احساس سمجھ کر نہیں اپنا قرض جان کر کیا دنیا اس کہانی کو کسی بھی سمت لے یا کوئی بھی رنگ دے ہمارا دل صاف ہے اور ہم اپنے رب کے سامنے اپنے کسی عمل کے لیے شرمندہ

نہیں' بے شک اللہ سبحان وتعالیٰ دلوں کے حال جاننے والا ہے۔'' نواب صاحب بولے تھے اور ان کے لہجے کی متانت اور بردباری سے جیسے جلال پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا ان کا دل چاہا تھا وہ ایک لمحے میں جائیں اور نواب صاحب کے قدموں میں بیٹھ جائیں۔

ان نے دل سے معافی مانگیں انہوں نے اپنے والد محترم سے متعلق کیا کچھ سوچ لیا تھا کیا بھیانک اقدام ان سے سرزد ہوا تھا وہ اپنی نظروں میں گر گئے تھے۔ وہ شرمندہ سے نواب صاحب کی سمت دیکھنے لگے تھے۔

''ہم آپ سے مافی مانگنے کے لائق بھی نہیں رہے ابا جان، ہم اپنی غلطی اور کوتاہی سے واقف ہیں' ہم نے یقیناً ایسا سوچ کر بھی آپ کا دل دکھایا ہے اور آپ کی عزت پر انگلی اٹھانا بذات خود ایک مکروہ عمل ٹھہرتا ہے' ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ ہم آپ کے متعلق ایسا کچھ قیاس بھی کرسکتے ہم نے آپ پر انگلی اٹھا کر یقیناً غلط کیا ہے۔'' جلال شرمندگی سے گویا ہوا تھا۔

نواب صاحب اس وقار سے کھڑے تھے ان کے چہرے پر وہی بردباری تھی وہ متانت سے مسکرائے اور پُرسکون لہجے میں بولے تھے۔

''کوتاہیاں انسانوں سے ہی سرزد ہوتی ہے برخوردار آپ غلط فہمی کا شکار ہوئے اگر آپ ہمارے ساتھ بات چیت کرتے تو اتنی پیچیدگیاں نہ رہتیں بہرحال ہمیں جو کہنا تھا ہم نے کہہ دیا، ہمارے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے' ہم اپنی نظروں میں سر اٹھا کر کھڑے ہیں ابا جان مرحوم کی نصیحت تھی کچھ بھی ہو اپنے آباؤ اجداد کا نام نہ ڈوبنے دینا اور بزرگوں کے رتبوں اور عزتوں کو قائم رکھنا ہم نے اپنے آباؤ اجداد کا سر اسی طور بلند رکھا ہے' حرمت وعزت صرف عورت کی نہیں ہوتی مردوں کی بھی ہوتی ہے' ہم اپنی نگاہوں میں آج سرخرو کھڑے ہیں یہ بلندی ہمیں مضبوطی سے کھڑا کیے ہوئے ہے ہم نادم نہیں ہیں۔'' نواب صاحب مضبوط لہجے میں گویا ہوئے تھے اور جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر فوراً آگے بڑھے اور نواب صاحب سے جاکر گلے ملے تھے۔

''ہم معذرت خواہاں ہیں ہمیں معاف کردیجیے ابا جان۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے بولے تھے نواب صاحب ان کا سر شفقت سے تھپکنے لگے تھے۔



''یہ معاملات کس نے اٹھائے؟'' حکمت صاحب ششدر سے بولے تھے تیمور نے شانے اچکاتے ہوئے حکمت صاحب کو دیکھا تھا۔

''یہ بات محل میں عام ہے ایسی قیاس آرائیاں ہورہی ہیں۔''

بات خاصی حد سے گزر گئی ہے نواب صاحب اور جلال کو بہت بری صورت حال سے گزرنا پڑسکتا ہے اگر ایسا ثابت ہوجاتا ہے کہ فتح النساء نواب صاحب کی اولاد ہیں آپ معاملے کی پیچیدگیوں کو سمجھتے ہیں نا، فتح النساء کو نواب صاحب کی بیٹی قیاس کیا جارہا ہے اور جلال فتح النساء سے نکاح کرچکے ہیں، ہم نہیں جانتے اگر درست ہے کہ نہیں مگر جلال بہت خطرہ میں ہیں۔'' تیمور نے کہا اور حکمت صاحب سر نفی میں ہلانے لگے تھے۔

''ایسا نہیں ہوسکتا یہ فقط کوئی سازش معلوم ہوتی ہے ایسا کچھ بھی ہوا ہی نہیں اس کے گواہ ہم ہیں ہم نواب صاحب کی زندگی کے تمام مخفی گوشوں سے واقفیت رکھتے ہیں' اللہ گواہ ہے ہم کوئی فیور نواب صاحب کو نہیں دے رہے نواب صاحب کی نیک نامی سے ہر کوئی واقف ہے وہ پُر وقار شخصیت کے مالک ہیں' نوابی کے باوجود انہوں نے ایک باوقار طرز زندگی جیا ہے وہ عام نوابوں کی طرح عیاش پرستی کے قائل نہیں رہے ہم ان کو برسوں سے جانتے ہیں بچپن ساتھ کھیلا ہے ہم نے اور نوجوانوں سے بڑھاپے تک کا ساتھ ہے ان کے بارے میں ایسی بات سننا ہمارے لیے باعث حیرت ہے اگر ان کے کردار پر شک کیا جارہا ہے تو یہ کوئی گہری سازش ہوسکتی ہے کیونکہ جو بھی نواب صاحب کے قریب دوست احباب ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا کردار بے داغ رہا ہے وہ جناح صاحب کے فلوور ہیں ان کے اچھے دوستوں میں ہیں ایسے میں ان کی کردار کشی کرنا چہ معنی دارد؟'' حکمت صاحب نے کہا اور تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''آپ کیا سوچنے لگے؟ یہ نقطہ اٹھایا کسی نے' کیا

نواب زادہ جلال نے؟'' حکمت صاحب نے پوچھا تیمور نے سرانکار میں ہلایا تھا۔

''نہیں نواب زادہ جلال اس معاملے کو لے کر انتہائی پریشان ہیں انہوں نے یہ نقطہ نہیں اٹھایا انہوں نے فتح النساء سے نکاح کیا تھا کیونکہ نواب صاحب اس نکاح کے لیے عندیہ نہیں دے رہے تھے اور......!''

''آپ اور نواب صاحب کا اجازت نہ دینا اس قیاس آرائی کو جنم دیتا ہے کہ فتح النساء نواب صاحب کی صاحب زادی ہیں یہ بات مذاق لگتی ہے۔'' حکمت صاحب مسکرائے' تیمور نے ان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

''کیا مطلب ڈیڈ...... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھ کر بولے تھے حکمت صاحب مسکرادیے۔

''نواب زادہ جلال الدین پٹودی آپ کے احباب کی فہرست میں آتے ہیں آپ کیا ان کے کردار سے واقف نہیں۔'' حکمت صاحب بولے تھے اور تیمور نے چونک کر ان کو دیکھا تھا حکمت صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''معاملہ یہ ہے کہ نواب صاحب فتح النساء کو اپنی صاحبزادی مانتے ہیں اور عین کی طرح ہی انہیں عزیز رکھتے ہیں ان کو نہیں لگا ہوا کہ جلال ان کے لیے مناسب ہے کچھ بگاڑ تو جلال کی شخصیت میں ہے یہ بات اگرچہ ڈھکی چھپی ہے مگر اتنی بھی نہیں کوئی سمجھ نہ سکے چھوٹے نواب کو کوٹھوں پر جاتے دیکھا گیا ہے اگرچہ وہ نیک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر کچھ عیاش پرستی ان کی طبیعت کا خاصا رہی ہے نواب صاحب یقیناً فتح کے لیے ایسا بر منتخب کرنا نہیں چاہتے ہوں گے تبھی انہوں نے ان کے اس اقدام کی مخالفت کی۔'' حکمت صاحب نے کہا اور تیمور نے سمجھتے ہوئے پُر سوچ انداز میں سر ہلایا اور مدہم آواز میں گویا ہوا تھا۔

''کیا اس سازش کے پیچھے مرزا سراج الدولہ کا چہرہ ہوسکتا ہے؟'' تیمور نے قیاس کیا تھا حکمت صاحب چونکے تھے اور بیٹے کو دیکھا تھا۔

''بخدا ہمارا دھیان اس طرح نہیں گیا ایسا ممکن ہے کیونکہ مرزا صاحب دوست نما دشمن ہیں ان کی مخالفت عین ممکن ہے ہوسکتا ہو وہ سیاسی طور پر اس کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یا ان کو کوئی مالی فائدہ بھی مل رہا ہے کیونکہ ایک بات تو طے ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جاتا یا بات بھی اگر عام ہو جاتی کہ فتح النساء نواب صاحب کی صاحب زادی ہیں اور نواب زادہ نے ان سے نکاح کیا ہے تو یہ نواب خاندان کا سارا وقار تہس نہس ہو جانا ایک فتویٰ بہت سی زندگی کو مشکلات میں ڈال سکتا تھا نواب صاحب کی بنی بنائی عزت کا جنازہ نکل سکتا تھا ان کے اکلوتے وارث کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا سو یہ کھیل شطرنج کی کسی چال کا سا شاطر ہے اور کھیل کھیلنے والا جانتا ہے کہ مقابل کو نا قابل تلافی تلافی کا احتمال ہوگا اللہ غارت کرے مرزا صاحب کو اور ان کے ایسے عزائم کو ہم نے کئی بار نواب صاحب کو جتایا ہے کہ یہ مرزا صاحب مناسب انسان نہیں ہیں ان سے رشتہ رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا مگر وہ سننے کو تیار نہیں۔'' حکمت صاحب بہت ششدر سے بیٹھے تھے تیمور نے سر ہلایا تھا۔

''ہم نے معاملے کی چھان بین محل کے ملازمین سے کی ہے گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے ایک پرانے ملازم ہیں افضل صاحب وہ باہر سے سودا سلف لانے کا کام محل میں انجام دیتے ہیں۔ مرزا صاحب نے ان کو مہرہ بنایا ہے محل میں یہ بات ان ہی کی زبانی پھیلی ہے۔'' تیمور نے کہا تھا اور حکمت صاحب چونکے تھے۔

''افضل کرم دین اس کا باعث بنے ہیں تو ان پر افسوس ہے کیونکہ نواب صاحب اپنے ملازمین سے بہت خندہ پیشانی سے پیش آتے رہے ہیں انہوں نے گھر کے ملازمین کو کبھی ملازموں کی طرح کوئی تفریق اور تمیز روا نہیں رکھی ہمیں افسوس ہے گھر کے ایک ملازم نے چند پیسوں کے لیے یہ کام کیا اگر یہ معاملہ محل کی دیواروں سے باہر آجاتا تو نواب خاندان صفحہ ہستی سے مٹ جاتا تھا یہ معاملہ بہت پیچیدہ تھا مگر کیا افضل کرم دین نے اس بات کو قبول کرلیا ہے کہ وہ اس سازش میں شامل رہا ہے اور کیا وہ مرزا صاحب کے خلاف منہ کھول سکنے کی ہمت رکھتا ہے؟'' حکمت صاحب نے معاملہ اٹھایا تھا تیمور نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''نہیں، افضل کرم دین اپنے پکڑے جانے پر حیران ہے شاید اسے خبر نہیں تھی کہ کوئی اسے شناخت کرلے گا یا اس

سازش کو بے نقاب کرلے گا جب ہمیں اس معاملے کی خبر ہوئی تو جانے کیوں ہمارا پہلا شک مرزا صاحب کی طرف گیا اور اس کے بعد ہمیں گھر کے ملازمین سے پوچھ گچھ کا خیال آیا چچا سیف آپ کے پرانے دوستوں میں سے ہیں سو ہمیں یہ بات تو کنفرم تھی کہ وہ ایسا اقدام نہیں کرسکتے اگر ان کی زندگی میں ایسا کوئی گوشہ رہا ہوتا تو یقیناً آپ اس سے واقف ہوتے ہمیں اس سازش کا یقینی اسی ایک نقطے کے باعث ہوگیا تھا مگر ہمیں اس سازش کو بے نقاب کرنا تھا ہم نے جلال سے اجازت لے کر گھر کے ملازمین سے بات چیت کا آغاز کیا اور معاملے کا سرا افضل کرم دین سے جاملا اور ان سے بات ہوئی تو وہ ہکا بکا رہ گئے گویا ان کے گمان میں بھی نہیں تھی کہ ایسا کوئی معاملہ اٹھے گا اور اس کی تحقیق ان سے ہوگی اور وہ پکڑے جائیں گے ہمارے ایک دو سوالوں پر ہی انہوں نے گڑگڑاتے ہوئے معافی تلافی کی درخواست کردی گویا ان کو خبر ہوگئی تھی کہ وہ صاف پکڑے گئے ہیں اور اب ان کے بچ نکلنے کی امید نہیں ہے انہوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے وعدہ چاہا کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی اور مرزا صاحب تک اس بات کی بھنک نہیں جائے گی تبھی وہ اس سازش کو بے نقاب کرنے کا موجب بنیں گے ہم نے ان کو یقین دلا دیا اور انہوں نے تمام معاملہ کہہ سنایا مرزا صاحب نے سیاسی اور کئی معاملات میں نواب صاحب کو نیچا دکھانا چاہا تھا وہ چاہتے تھے ان کی عزت مٹی میں مل جائے اور یہ خاندان صفحہ ہستی سے مٹ جائے اس کے لیے اس سے بہتر سازش نہیں رچی جاسکتی تھی غالباً وہ کہیں اس بات کی خبر رکھتے تھے کہ نواب زادہ فتح النساء سے نکاح کرنا چاہتے ہیں گھر کے ملازمین کو گھر کے معاملات کی خبر سب سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ گھر کے افراد معاملات کو زیر بحث لاتے ہوئے دھیان نہیں رکھتے کہ ارد گرد کون ہے شاید وہ گھر کے ملازمین پر ضرورت سے زیادہ اعتبار کرنے لگے ہیں اور افضل کا خاندان تو چھ نسلوں سے اس گھر کے اندر متحرک رہا تھا سو کسی کا شک افضل پر نہیں جانا تھا سو افضل کے لیے یہ معاملات جاننا ان باتوں تک رسائی رکھنا آسان تھا جب بھی اس نکاح کے منعقد ہونے کے معاملات گھر میں زیر بحث آئے ہوں گے ان کی بھنک افضل یا کسی دوسرے ملازمین کو ہوئی ہوگی اور جب مرزا صاحب نے گھر کے بھیدی کو خریدا ہوگا تو تمام معاملات تک رسائی رکھتے ہوں گے سو اس سازش کو سوچ سمجھ کر آغاز کیا گیا مگر اب یہ بات کھل چکی ہے اور ہم نے تمام جانچ پڑتال کرلی ہے ہم جلال سے بات کرنے والے تھے مگر اس سے قبل آپ سے بات کرنا ضروری خیال کیا۔''

تیمور نے تمام حقیقت کہہ سنائی تھی حکمت صاحب کو اپنے سپوت پر فخر ہوا تھا انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شاباشی دی تھی۔

''تیمور بہادر یار جنگ، آپ نے آج اپنے والد کا سر فخر سے مزید بلند کردیا نیک اور صالح اولاد اللہ کا ایک بہترین تحفہ ہے اور آپ نے اس بات کا ثبوت دے دیا ہے آپ نے جلال سے دوستی نبھا کر ثابت کردیا کہ بہادر یار خاندان اپنے احباب سے وفادار ہے اور نیک نیت ہے ہمیں آپ پر فخر ہے...... اللہ تعالیٰ ایسی نیک اولاد سب کو عطا فرمائے آمین۔'' وہ فخر سے مسکراتے ہوئے بولے تھے اور تیمور مسکرا دیا تھا۔

''تشکرات میرے سپوت، آپ نے ہماری نواب صاحب سے دوستی کو مزید پکا کردیا۔'' حکمت صاحب بولے تھے تیمور دھیمے سے مسکرایا تھا۔

''ڈیڈ ہم وہی کررہے ہیں جو ہمیں مناسب لگا جلال اور عین سے مخلصی واجب ہے وہ ہمارے احباب میں شمار ہوتے ہیں اور دوست ہی دوست کی مدد کرتا ہے۔''

تیمور نے کہا تھا اور حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''ہم نواب صاحب سے بات کرتے ہیں یہ معاملات ان کی معلومات میں آنا ضروری ہیں تاکہ وہ محتاط رہیں ہم نواب صاحب کی طرف جارہے ہیں آپ بھی جلال کو اعتماد میں لے کر تمام معاملات کہہ سنایئے۔ صد شکر کہ یہ بات محل سے نکل کر باہر نہیں پہنچی ورنہ بہت بڑی قیامت آجانا تھی۔''

حکمت صاحب تیمور کو سمجھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تیمور نے ان کو جاتا ہوا دیکھا اور پھر فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا تھا۔



فون کی بجتی ہوئی گھنٹی پر مرزا صاحب نے فون اٹھایا

تھا۔

''ہیلو.....!'' وہ بردباری سے بولے تھے مگر ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''یہ کیا ہے، تم ایک معاملہ نہیں سنبھال سکے اتنے نالائق ہو، قبول کرنے کی ضرورت کیا تھی ہم نے کہا تھا نا کہ اتنا مال دیں گے کہ تمہاری سات نسلیں راج کریں گی تمہیں منہ کھولنا ہی نہیں چاہیے تھا اب اگر ہمارا نام آیا تو ہمارے خاندان کی خیر نہیں افضل، ہم خود پر بات نہیں آنے دیں گے معاملہ ہماری عزت اور نیک نامی کا ہے اگر ہمارا نام آیا تو ہم آپ کی سات نسلوں کو نہیں بخشیں گے اپنی زبان بند رکھو مگر جاؤ یا کچھ بھی کہو ہم اپنا نام ان معاملات میں درج نہیں چاہتے نواب صاحب کو ہمارے نام کی بھنک لگی تو تمہاری خیر نہیں، مرزا سراج الدولہ اپنا دفاع کرنا جانتا ہے کچھ بھی کر کے معاملات کو سنبھال لو ورنہ تمہاری اور تمہاری سات پشتوں کی خیر نہیں مرزا کے کرم دیکھے ہیں ابھی تم نے ان کرم نوازیوں کی جگہ جب قہر دیکھو گے تو روح بھی کانپ جائے گی تمہاری۔'' مرزا سراج الدولہ نے غصے سے فون کا سلسلہ منقطع کیا تھا فون کا ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے ٹیبل کی سطح سے جگ اٹھا کر پانی گلاس میں انڈیلا تھا اور تمام پانی غٹاغٹ پی گئے تھے حیدر جو وہاں وارد ہوا تھا والد محترم کا یہ حال دیکھ کر رک گیا تھا۔

''کیا ہوا ابا جان، خیریت ہے آپ اس قدر غصے میں کیوں ہیں، ماجرا کیا ہے؟'' حیدر نے پوچھا تھا اور مرزا صاحب اپنے سپوت کو دیکھنے لگے تھے۔

''آپ جیسی نالائق اولاد پیدا کرنے سے بہتر تھا ہم کوئی اور کار خیر کرتے افسوس ہے ہم آپ کو دنیا میں لانے کا موجب بنے۔'' انہوں نے غصے سے بیٹے کو ڈپٹا تھا حیدر جان نہیں پایا تھا معاملہ کیا ہے تبھی گویا ہوا تھا۔

''ابا جان ہوا کیا ہے ہم نے کیا کیا؟ ہم تو وہی کرتے ہیں جو آپ کہتے ہیں آپ کے فیصلوں پر ہی تو چل رہے ہیں اس سے زیادہ نیک اولاد کہاں ملے گی۔'' حیدر نے احتجاج کیا تھا مگر مرزا صاحب ان کو نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے حیدر اپنا سا منہ لے کر ان کو جاتا دیکھتا رہا تھا معاملات ان کی سمجھ میں قطعی نہیں آئے تھے۔



''ہمیں گمان نہیں تھا مرزا صاحب ایسی گہری چال چلیں گے ہم تو انگشت بدنداں رہ گئے ہم مرزا صاحب کی طبیعت سے کچھ کچھ واقف تو رہے ہیں مگر ایسی چال؟'' نواب صاحب بہت ششدر دکھائی دیے تھے حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''ایسے انسان کو دوست کہنا دوستی کی توہین ہے نواب صاحب تیمور نے تمام تحقیق سے افضل سے جانچ پڑتال کر کے ثبوت اکٹھا کر لیے ہیں گویا مرزا صاحب نے دوستی کے در پردہ جو گھٹیا چال چلی تھی ان کی وہ چال خود ان پر بھاری پڑ گئی کہیں بیٹھے ان معاملات کی گھتیاں سلجھانے کی تدبیریں سوچ رہیں ہوں گے۔'' حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

''گویا خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا، اللہ کی ذات بے نیاز ہے، وہ دنیا میں ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے دیکھیے کیسے عزائم رکھتے تھے مرزا صاحب اور آپ ان کو دوست کہتے ہیں، وہ تو آپ کی عزت کی دھجیاں بکھیرنے چلے تھے ان سے محتاط رہیے وہ ٹھیک انسان نہیں ہیں۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''ہمیں حیرت نہیں ہے اگر مرزا سراج الدولہ نے ایسا اقدام کیا وہ اس سے پہلے بھی اس سازشوں میں در پردہ ملوث رہے ہیں مگر یہ بہت زیادہ گھناؤنی سازش تھی اللہ کا شکر ہے اس نے سب درستگی کی سمت موڑ دیا ورنہ بہت قہر نازل ہوتا ہماری تو خیر تھی مگر ہمارا خاندان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا اس کے متعلق سوچ کر ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔'' نواب صاحب نرم لہجے میں گویا تھے۔

''آپ کو مرزا صاحب کے خلاف کارروائی کرنا ہوگی نواب صاحب ورنہ ان کے عزائم متواتر بڑھتے رہیں گے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا مگر نواب صاحب نے بہت پُرسکون انداز میں سر نفی میں ہلایا تھا۔

''نہیں، ہم مرزا کے خلاف کوئی قانونی اقدام کرنا نہیں چاہتے، ان سے خاندانی مراسم رہے ہیں ہمارے آباؤ

اجداد کے ہم اپنے باپ دادا کی روحوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے مرزا صاحب کے اقدام کا بدلہ ان سے لینا مناسب نہیں ہم تمام معاملات کو اللہ پر ڈالتے ہیں اللہ کی اس شیطان کے لیے لمبی ہوتی ہے مگر ایک دن وہ شکنجے میں ضرور آتا ہے ہم ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہاتھ میلے کرنا نہیں چاہتے مرزا صاحب نے جو کیا وہ ان کا فعل ہے ہم ان کو دل سے معاف کرتے ہیں ہمیں ان سے کوئی شکایت کبھی نہ رہی نا ہوگی، اتنے پرانے مراسم کو ہم اس طرح بے عزت نہیں کرسکتے آپ تیمور بیٹا سے کہہ دیجیے وہ افضل کے معاملے کے ثبوت اپنے طاس محفوظ رکھیں مگر ان کے متعلق کوئی قانونی اقدام کرنے سے گریز کریں۔'' نواب صاحب نے پُرسکون لہجے میں کہا تھا حکمت صاحب نے ان کو حیرت سے دیکھا تھا پھر بولے تھے۔

''نواب صاحب آپ کا دل بہت بڑا ہے مگر مرزا صاحب کو اس بار معاف کرنا مناسب نہیں ہوگا اگر آپ اسی طرح خاموش رہیں گے تو اگلی بار وہ اس سے بڑی سازش کا موجب بنیں گے برائی کا سر بروقت کچلنا ضروری ہوتا ہے۔'' حکمت صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی تھی نواب صاحب مسکرادیے تھے۔

''بچکانہ شرارتوں کو کھیل نہیں کہتے حکمت صاحب یہ چٹکلے ہیں ان کو ایک کان سے سنیے اور دوسرے سے رفع کردیجیے ہمارے نزدیک ان باتوں کی اہمیت ثانوی ہے ہم نے جو عزت کمائی ہے اس کے متعلق تمام لوگ واقف ہیں لیکن پھر بھی اگر ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہو بھی جاتے تو ہم اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کردیتے وہ سب سے بڑا منصف ہے۔'' وہ پُرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے بولے تھے حکمت صاحب نے سرہلا دیا تھا۔

''بے شک۔ نواب صاحب آپ بے مثال شخصیت ہیں آپ کا ثانی نہیں ہمیں فخر ہے آپ ہمارے قریبی دوست ہیں۔'' حکمت صاحب کے کہنے پر نواب صاحب مسکرادیے تھے۔

''فخر تو ہمیں آپ پر اور اس دوستی پر ہے حکمت صاحب جس طرح آپ ہمارا ساتھ دیتے ہیں کوئی بھائی کسی بھائی کا بھی نہیں دیتا، آپ سے ایک درخواست کرنا چاہیں گے اگر ہمیں کوئی ناگہانی آفت آن گھیرے تو ہمارے سپوت کا ساتھ دیجیے گا انہیں خبر نہیں ہو کہ ان کے والد محترم ان کے ساتھ نہیں۔'' نواب صاحب نے کہا اور حکمت صاحب نے فوراً ان کی بات کاٹی تھی۔

''گستاخی معاف نواب صاحب آپ کی بات منقطع کررہا ہوں مگر اللہ آپ کو محفوظ رکھے اور درازی عمر دے آپ اپنے سپوت کی رہنمائی کرنے کے لیے قدم قدم اس کے ہمراہ رہیں، آمین۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب مسکرادیے تھے۔

''سیاست کی زندگی میں مخلص دوست نہیں ملتے ہم خوش نصیب ہیں کہ آپ ہماری زندگی کا حصہ ہیں ہم آپ پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا حکمت صاحب نے سرہلایا تھا۔

''ہم اس اعتبار اور اعتماد کو ہمیشہ قائم رکھیں گے نواب صاحب ہمیں بھی فخر ہے کہ آپ جیسا عظیم دوست ہم پر اس درجہ اعتبار کرتا ہے سلامت رہیے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا نواب صاحب بہت مطمئن سے قہوے کی چسکیاں لینے لگے تھے۔



''ہمیں یقین نہیں ہوتا تیمور گھر کے ملازمین اس سازش سے واقف تھے اور اس کا حصہ رہے ہیں افضل کرم دین کی چھ نسلیں اس گھر کی وفادار رہیں ہیں ابا جان تو ان سے بہت نرمی سے اور حلاوت سے پیش آتے رہیں ہیں ان سے ہی کیا...... ابا جان محل کے تمام ملازمین کا خیال اپنے بچوں جیسا رکھتے ہیں۔'' جلال نے کہا تھا۔ تیمور خاموش رہا تھا پھر بردباری سے گویا ہوا تھا۔

''ہم حیران نہیں ہیں جلال ملازمین اکثر ایسی محلاتی سازشوں کا حصہ بنتے ہیں کیونکہ ان کے پاس گھر کے اہم راز ہوتے ہیں بہرحال افضل کے متعلق جو بھی کرنا ہے اس کے متعلق آپ یا نواب چاچا کوئی فیصلہ لے گی ہم نے معاملات کی تہہ تک پہنچ کر ہر چہرہ بے نقاب کردیا ہے۔ یقیناً مرزا انکل بھی پیچ تاب کھا رہے ہوں گے کہ ان کی گہری چال کا سرا ہاتھ کیسے لگا۔'' تیمور مسکرایا تھا جلال نے ان کو سوچتی نظروں سے دیکھا تھا پھر بولے تھے۔

"ہم ابا جان سے اس متعلق کہتے آئے ہیں کہ مرزا چاچا ٹھیک انسان نہیں ہیں، ہم نے حیدر کی مخالفت بھی کی ہے مگر ابا جان جانے کیوں مرزا صاحب سے خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے۔" جلال کے کہنے پر تیمور نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"ایسا نہیں ہے جلال، نواب چچا خوفزدہ نہیں ہے، وہ کھلے دل اور نیک نیت رکھنے والے انسان ہیں وہ خود فرشتہ صفت ہیں سو وہ کسی اور کے متعلق کوئی غلط رائے نہیں رکھتے، وہ رواداری نبھانے والوں میں ہیں۔" تیمور نے حتمی رائے دی تھی، جلال نے سر ہلایا تھا۔

"ایسا ہے مگر کسی غلط انسان کی غلط روش کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں غلط انسان کبھی کچھ اچھا نہیں کر سکتا ہمیں حیدر میاں کو لے کر بھی کئی خدشے رہے ہیں عین کا رشتہ ایسے شخص سے قائم رکھنا مناسب نہیں ہوگا ہم اپنی ہمشیرہ کو کسی مشکل میں دیکھنا نہیں چاہیں گے، ابا کی متانت اور میانہ روی عین کے حق میں غلط ثابت ہوگئی تو ہمیں اس کا افسوس رہے گا۔" جلال نے خدشہ بیان کیا تھا تیمور نے فوری طور پر کوئی رائے دینا مناسب خیال نہیں کیا تھا وہ عین کی زندگی کو حیدر سے جڑتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ کھل کر اس بات کا اظہار کرنے سے گریز کر رہے تھے وہ اپنے اندرونی معاملات کی خبر دانستہ عام ہونے سے خوفزدہ تھے جیسے عین کے لیے ان کی محسوسات اور جذبات اگر منظر عام پر آ جاتے تو یقیناً عین کی عزت پر حرف آتا اور وہ ایسا کچھ نہیں چاہتے تھے سو انہوں نے اس معاملے میں کسی بھی طرح کی رائے زنی سے گریز کیا تھا۔

"حیدر میاں انتہائی نامعقول انسان ہیں ہمیں خبر نہیں ابا جان کو ان کی کوئی برائی دکھائی کیوں نہیں دیتیں کئی بار ابا جان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے مگر وہ کوئی اقدام کرنے سے گریز پائی برت رہے ہیں ان کو نام نہاد خاندان مراسم کا خیال ہے اب اگر مرزا چاچا کی ایسی سازش بے نقاب ہونے کے بعد بھی خاموش رہیں گے تو یہ کسی بہت بڑے خطرے کو دعوت دینا ہوگی ایسی سازشیں کرنے والے باز نہیں آتے ابا جان ایسے لوگوں کو مروت دکھا رہے ہیں جو اس قابل نہیں۔" جلال نے برہم لہجے میں کہا تھا

ماں

میرے سب کام میری ماں کی دعاؤں سے ہوئے
ورنہ دوزخ نہ کبھی سرد، ہواؤں سے ہوئے

ماں! تُو میرا دل ہے، میری روح ہے...... تُو سرچشمۂ رحمت ہے...... تُو ایک آفاقی علامت ہے جس میں الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے...... تُو وہ ہستی ہے جس کے خلاف کچھ کہنا گناہ ہے...... کوئی بھی انسانی رشتہ، تیرے رشتے کی ہمسری نہیں کر سکتا، میں تیری محبت و شفقت اور ماتا کو کسی بھی تشبیہ، استعارے یا تمثیل سے واضح نہیں کر سکتا، لفظ و بیاں کی تمام رمزیں، لطافتیں اور بلاغتیں، تیری شفقت کی رفعت و وسعت پر قرباں۔

ماں! تُو نے میرا مستقبل سنوارنے میں ہمیشہ میری مدد کی ہے، تُو نے مجھے ہمت اور حوصلے سے زندگی گزارنے کی جراٴت دی ہے...... مجھے زندگی کا شعور دیا ہے...... میرے وجود کو ظہور دیا ہے۔ تُو نے اپنے آنچل سے میرے اشک پونچھ کر، مجھے مسکرانا سکھایا اگر کبھی میں گر پڑتا تو تُو بے تحاشا دوڑ کر مجھے اٹھاتی، میری چوٹ کو چومتی...... تو پل بھر میں میرے وجود کے سارے دُکھ چن لیتی تھی، مجھے یاد ہے میں جب بھی بیمار پڑتا تو تیری ممتا بے چین و بے قرار ہو جاتی اور اگر کبھی میری حالت زیادہ خراب ہو جاتی تو تُو رونے لگتی۔ تیری آنکھوں سے تھرتھراتے ہوئے آنسو اور دعا کے لیے لرزتے ہوئے ہونٹ آج بھی میرے سامنے ہیں وہ آنسوؤں کا قافلہ اشکوں میں بھیگی ممتا، اب بھی مجھے یاد ہے......!

ماں! میرے خون کے ہر قطرے پر تیرا نام ہے جو اسے منجمد نہیں ہونے دیتا کہ تیری دعائیں آج بھی میرے سر پر سایہ فگن ہیں۔ میرے ذہن کی تختی پر تیرا نام کندہ ہے۔

ماں! میرے دل کے فرش پر تیری یادیں اب بھی ٹہلتی رہتی ہیں اور میں جب بھی اپنے دل کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتا ہوں اور دیکھتا ہوں تو اُس میں جو تصویر سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ تیری ہی ہے......!

ماں کے قدموں میں سکوں آج بھی ملتا ہے مجھے
ماں کی تربت سے دعاؤں کی صدا آتی ہے

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

مرسلہ: ارشد علی...... اکاڑہ

تیمور نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''نواب چاچا جان دل کشادہ رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کا ساتھ اللہ دیتا ہے جو کسی کے ساتھ غلط نہیں ہونے دیتا، ان کے ساتھ کبھی غلط نہیں ہوتا خاطر جمع رکھیے سب ٹھیک ہوگا۔'' تیمور نے ان کو سمجھایا تھا جلال اس کے متفق دکھائی دیے تھے۔

''ایسا یقیناً ہے مگر ابا جان کو ایسے رشتوں کی کانٹ چھانٹ کرنا ضروری ہے کم از کم مرزا صاحب کو خبر ہونا ضروری ہے کہ کوئی ان کی ایسی گھٹیا چالوں کی خبر رکھتا ہے مگر مروت اور لحاظ برت رہا ہے۔'' تیمور کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''جلال ایسے لوگ بے نقاب ہونے پر اور بھی کھل جاتے ہیں جیسے ان کو خبر ہوجائے کہ اب ان کو خبر تو ہو ہی گئی ہے سو کیا فرق پڑتا ہے اگر کھل کا خباثت کی جائے۔'' تیمور کے کہنے پر جلال نے سر ہلایا تھا اور پھر تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا تھا۔

''تیمور آپ کی معاونت کے لیے ہم مشکور ہیں آپ نے اس سازش کو بے نقاب کرنے میں بہت مدد دی۔'' وہ بہت مشکور دکھائی دیے تھے تیمور نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''جلال کوئی بڑی بات نہیں ہے ہم نے وہی کیا جو ہمیں ضرور لگا یہ کوئی احسان نہیں اچھا یہ بتایئے کوئی اقدام کرنا ہے یا افضل کو معاف کر کے چلتا کرنا ہے ہم نے ان کو محل کے ایک کمرے میں رکھوایا ہے ہمیں گمان تھا وہ معاملات کھلنے پر یہاں سے فرار ہونا چاہیں گے ان کا فرار ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔'' تیمور نے کہا تھا تبھی جلال بولے تھے۔

''ہم افضل کرم دین سے ملنا چاہیں گے ان کو کچھ دن تک اس کمرے میں رکھنا ضروری ہے ہم جانتے ہیں وہ ضرور اب ابھی مرزا صاحب سے رابطہ میں ہوں گے محل کے اندر کالے بھیڑوں کی کمی نہیں ابھی صرف ایک کالی بھیڑ بے نقاب ہوئی ہے۔'' جلال نے خدشہ بیان کیا تھا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں جلال یقیناً کوئی ایک کالی بھیڑ نہیں ہے مگر تمام ملازمین کو چلتا کر دینا بھی مناسب نہیں، پانچوں انگلیاں یقیناً برابر نہیں ہوتیں اگر کچھ ملازمین وفادار ہیں تو کچھ ایسے مخالفین کی فہرست میں بھی ضرور آئیں گے بہرحال آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا جلال متفق دکھائی دیے تھے۔



''نواب صاحب مزاج گرامی کیسے ہیں آپ تو عید کا چاند ہوجاتے ہیں اماں کبھی دوستوں کی خبر بھی لے لیا کریں پہلے ہی دوستی میں شر پھیلانے والوں کی کمی نہیں ہے۔'' مرزا نے مصافحہ کرتے ہوئے شکوہ کیا تھا اندر کا زہر ان کو چھپانا خوب آتا تھا نواب صاحب مسکرائے تھے۔

''مرزا صاحب ہم ایسے احباب کی فکر نہیں کرتے شر پھیلانے والوں پر اعتبار نہ کیا جائے تو ان کے ادارے ملیا میٹ ہوجاتے ہیں آپ ایسے لوگوں کی فکر نہ کیا کریں خاطر جمع رکھیے اور دل کشادہ رکھیں۔'' نواب صاحب نے متانت سے کہا تھا مرزا صاحب کمال مہارت سے مسکرائے تھے۔

''ہم آپ کی دوستی کی قدر کرتے ہیں نواب صاحب آپ باکمال انسان ہیں ایسے دوستوں کا فہرست میں شامل ہونا بھی جزا ہے اللہ ایسے دوست تبھی نوازتا ہے جب گناہ معاف کرنے کا قصد کرتا ہے آپ کا ہمارے ہمراہ ہونا ہمارا حوصلے بڑھاتا ہے باقی جن سازشوں کی خبر عام ہے وہ ہم سے منسلک کرنا مناسب نہیں ہمارے آباؤ اجداد کے روابط آپ کے خاندان سے وابستہ رہے ہیں ابا جان مرحوم فرماتے تھے خاندان مراسم ایک خاص توجہ کے مرہون منت ہوتے ہیں کیونکہ ان کی قدر نہ کرنے والے ناقدرے لوگوں کو معافی بھی نہیں ملتی، ہم نے زندگی میں نیکیاں پہلے ہی بہت کم کمائی ہیں سیاست کی زندگی میں قدم رکھ کر گویا ہم نے جھوٹ کی زندگی کا لباس پہننا ہے اس جھوٹے کی دنیا میں ہر لمحہ جھوٹ کا سہارا لینا پڑا ہے، ہم مزید خطاوار ہوسکتے آپ سے خاندان مراسم کی قدر کرتے ہیں نواب صاحب نیک نیتی سے اس دوستی کی قدر کرتے ہیں بخدا آپ کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے کوئی دشمن ہے جو شر پھیلانے کے درپے ہے کوئی مخالفت ہے جو سازشوں پر مائل ہے اور ان برسوں کے مراسم کو ختم کرنا چاہتا ہے ہم کو مل کر ان سازشوں کو منہ توڑ جواب دینا ہوگا

نواب صاحب برائے کرم ہماری طرف سے دل صاف کریں ہم یہ معاملہ سن کرہی شرم سے پانی پانی۔ جب تک زندگی ہے ہم آپ سے وفادار ہیں نواب صاحب ہم آپ سے مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے ہمارا یقین کیجیے۔'' مرزا صاحب نے نواب صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور نواب صاحب پُرسکون انداز میں ان کی سمت دیکھتے ہوئے مسکراتے تھے۔

''جانے دیجیے مرزا صاحب ان باتوں کو بھول جایئے کوئی فرق نہیں پڑتا ہمیں آپ کی وفاداری پر کوئی شک نہیں دنیا کی جانے دیجیے ہم کسی کا یقین نہیں کررہے بے فکر رہیے۔'' نواب صاحب کے پُرسکون انداز پر مرزا صاحب ان کو دیکھ کررہ گئے تھے۔

''آپ کو واقعی لگتا ہے کہ ہم آپ کے خلاف سازش پر مائل ہیں۔'' مرزا صاحب نے پوچھا تھا نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے سر انکار میں ہلا دیا تھا اور ان کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

''اللہ بہتر جانتا ہے اور تمام معاملات اس کے سامنے ہیں ہم آپ پر شک نہیں کرسکتے آپ اچھے دوستوں میں سے ہیں دنیا کی جانے دیجیے دنیا تو درانتی سے زیادہ بری ہے...... درانتی ایک طرف سے کاٹتی ہے اور دنیا دونوں سمت سے تیز دھار رکھتی ہے۔'' نواب صاحب نے دانستہ بات کو مزاح کا رنگ دیا تھا اور بولے تھے۔

''آیئے بیٹھیے بہت دن ہوئے ساتھ مل کر نہیں بیٹھے آیئے چائے کی چسکیوں کے ساتھ ایک بازی شطرنج کی لگاتے ہیں لوگوں کی بات کرنا بے معنی ہے لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہے ان کی باتوں میں نہ آیئے باتوں باتوں میں یاد آیا دہلی کی پرانی حویلی کو بیچنے کا ارادہ بن رہا تھا آپ کا اس کا کیا بنا؟'' وہ ان کو لے کر بیٹھک میں آن بیٹھے تھے مرزا صاحب کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا مگر وہ متمول کے مطابق گفتگو کررہے تھے مگر ان کا لہجہ صاف لغزش سے بھرا تھا۔

''نواب صاحب آپ یقین کیجیے ہمیں آپ سے کوئی پُرخاش نہیں ہم آپ کے مرید ہیں آپ جیسا نام اور عزت کمانا چاہتے ہیں ہم کہاں آپ کی مخالفت کرسکتے ہیں جو شہرت عزت اور نیک نامی اللہ نے آپ کو بخشی ہے وہ کسی کسی کے نصیب میں ہی آتی ہے۔'' وہ مسکرارہے تھے ان کا لہجہ دوستانہ تھا مگر آواز پر لغزش تھی نواب صاحب مُسکرا دیے تھے۔

''جانے بھی دیجیے میاں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے آپ۔'' انہوں نے گویا معاملہ سمیت کر ملازم کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسے کھڑے ہمارا منہ کیا دیکھ رہے ہیں میاں، جایئے چائے کے ساتھ لوازمات لایئے دیکھ نہیں رہے آپ ہمارے بہترین رفیق تشریف لائے ہیں۔'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو مرزا صاحب ان کو دیکھ کررہ گئے تھے وہ اپنے کیے پر شاید شرمندہ اب بھی نہیں تھے مگر نواب صاحب کے ظرف نے ان کو انگشت بدنداں ضرور کردیا تھا۔

❁......✿......❁

''یہ کہانی کس نے پھیلائی ہے اب؟'' عین تمام بات سن کر حیران ہوئی تھی جلال نے ان کو شانوں سے تھام کر بیٹھایا تھا اور ان کو پانی کا گلاس پیش کیا تھا اور تسلی سے بولے تھے۔

''یہ کس کی پھیلائی ہوئی کہانی نہیں ہے عین یہ سچ ہے ابا جان کے خلاف سازش ہوئی ہے اور اس سازش کا محرک اسی گھر میں موجود ہمارا ایک ملازم افضل کرم دین ہے۔'' جلال نے بہن کو سمجھانا چاہا تھا۔

''مگر بھائی اس سازش کا سبب کیا تھا اور اس کا سلسلہ مرزا چاچا سے جوڑنا کیا مناسب ہے ہوسکتا ہے وہ ملازم خود کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہو ہمیں اس طرح ابا جان کے ان دوست پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔'' وہ روانی سے بولی تھیں جب جلال نے ان کو مزید بات کرنے سے روک دیا تھا۔

''ہم مرزا سراج الدولہ پر اس لیے الزام نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ حیدر میاں کے والد محترم ہیں عین النور آپ جانتی ہیں آپ کس کی حمایت کرسکتی ہیں وہ شخص آپ کے ابا جان کے خلاف سازش کرتا ہے اور اس سازش کا محرک اسی گھر میں موجود ہمارا ایک ملازم افضل کرم دین ہے۔'' جلال نے

بہن کو سمجھانا چاہا تھا۔

''مگر بھائی اس سازش کا سبب کیا تھا اور اس کا سلسلہ مرزا چاچا سے جوڑنا کیا مناسب ہے ہوسکتا ہے وہ ملازم خود کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہو ہمیں اس طرح ابا جان کے ان دوست پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔'' وہ روانی سے بولی تھیں جب جلال نے ان کو مزید بات کرنے سے روک دیا تھا۔

''ہم مرزا سراج الدولہ پر اس لیے الزام نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ حیدر میاں کے والد محترم ہیں عین النور آپ جانتی ہیں آپ کس کی حماقت کرسکتی ہیں؟ وہ شخص آپ کے ابا جان کے خلاف گھناؤنی سازش رچا رہا ہے اور آپ اس کی طرف داری کررہی ہیں کیا یہ مناسب ہے۔'' جلال نے ان کو ڈپٹا تھا وہ خاموشی ہوکر ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں پھر گردن موڑ کر بولی تھیں۔

''ہم ابا سے بہت پیار کرتے ہیں ابا کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے وہ بہترین والد ہیں مگر ہم......!'' وہ جیسے سوچ کو مختلف سمتوں میں جا نکلنے سے نہیں روک پائی تھیں جلال نے ان کو بغور دیکھا تھا۔

''معاملہ اپنے گھر کا ہو تو کسی کی بے جا حمایت کرنا حمایت ہوتی ہے نواب زادی آپ کسی کو ہمیشہ اتنی چھوٹ نہیں دے سکتیں، ہماری اپنی بقا کسی کی بقا سے ضروری ہو تو طرف داری صرف اپنی کرنی پڑتی ہے سوچیے اگر جال بنا گیا تھا وہ واقعی بھی ہوجاتا تو ابا اور ہم کہیں کے نہیں رہتے فتویٰ جاری ہونا تھا ہمارے خلاف۔ بہن سے نکاح کے جرم میں ہم نے سزا کا مرتکب ٹھہرنا تھا یہ بات معمولی نہیں ہے ابا جان کی تمام عزت مٹی میں مل جانا تھی۔ چلو مان بھی لیا کہ اس سازش کے پیچھے آپ کے ہونے والے سسر محترم کا ہاتھ نہیں تو جس کسی نے بھی یہ کیا کیا یہ عمل قابل ستائش ہے؟'' جلال نے جتایا تھا عین النور اپنی جگہ شرمندہ ہوکر رہ گئی تھیں۔

''ہم ایسا نہیں کہہ رہے تھے جلال بھائی ہمارا مقصد یہ نہیں تھا۔ ہم نے مرزا چاچا کی طرف داری نہیں کی۔'' وہ مدہم آواز میں جھکا کر پلٹی تھیں اور جلال اٹھ کر چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے تھے عین کو شدید افسوس اور شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔



''جب معاملہ اپنے گھر کا ہو تو کسی اور کے گھر کی سمت دھیان کرنا اپنے گھر کو نظر انداز کرنا کہلاتا ہے محترم نواب زادی عین النور ہم نے جلال کی مدد کرکے کچھ غلط نہیں کیا آپ کو احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم نے ایک بڑی قیامت کو آنے سے روک دیا ہے آپ الٹا ہمیں الزام دے رہی ہیں۔'' تیمور کو افسوس ہوا تھا عین شرمندہ ہوکر رہ گئی تھی پھر مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''آپ سب ہمیں ہی غلط کیوں سمجھ رہے ہیں ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا نہ ہم کسی کی بے جا حمایت کررہے ہیں ہم اپنے گھر والوں کے ساتھ کھڑے ہیں آپ باتوں کو الگ رنگ کیوں دے رہے ہیں، اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایسا کوئی کارنامہ کرکے نواب خاندان پر احسان کردیا ہے تو ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔'' وہ جلے لہجے میں بولی تھیں تیمور بہت ضبط سے ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''آپ کو شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے نواب زادی ہم نے جو کیا وہ نواب چاچا کے لیے اور جلال کے لیے کیا آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔'' تیمور نے جتایا تھا عین ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی وہ رخ موڑ کر جاچکے تھے یقیناً وہ ان کی بات پر برہم ہوئے تھے اور ان کا غصہ واضح ان کے چہرے پر دکھائی دیا تھا ان کے چہرے اور پیشانی کی تنی ہوئی رگیں اس بات کا واضح ثبوت تھیں وہ بہت سلجھے ہوئے مزاج کے نوجوان تھے ان کو اپنے احساسات اور جذبات پر یقین بہت اچھا کنٹرول تھا مگر اس لمحے وہ کسی قدر اچھے دکھائی دیے تھے عین کو اپنی غلطی کا اندازہ ہوا تھا تبھی اس لمحے چوڑے شخص کی سمت دیکھتے ہوئے مدہم انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم معذرت خواہ ہیں تیمور بہادر یار جنگ ہمیں آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی مگر ہمارا مقصد آپ پر شک کرنا یا آپ کی نیک نیتی کو چیلنج کرنا نہیں تھا ہم جانتے ہیں آپ اس خاندان سے کس درجہ مخلص ہیں اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے۔'' عین نے نرمی سے کہا تھا تیمور ان کو دیکھتا رہ گئے تھے۔

''عین کسی ایک انسان کو اتنی رعایت دینا کبھی کبھی بہت بڑے خطرات کو خود آپ اٹھالانا ہوتا ہے اگر آپ ہم سے کہیں یا پوچھیں تو ہم آپ کو آگاہ کریں گے کہ آپ کس درجہ غلط انسان کا ساتھ دے کر کس درجہ حمایت کررہی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں کہ درحقیقت آپ کو ان سے محبت بھی نہیں بلکہ آپ محض Pretend کررہی ہیں کہ آپ کو ان سے محبت ہے۔'' یہ صرف آپ محض خود کو باور کرا رہی ہیں۔'' تیمور نے جیسے غصے میں ایک بڑے راز سے پردہ اٹھایا تھا اور عین حیرت زدہ سی ان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

''یہ کیا مذاق ہے تیمور آپ سے ایسا کس نے کہا کہ ہمیں محبت نہیں۔'' وہ احتجاجاً بولی تھی اور تب تیمور ان کی سمت مضبوطی سے قدم اٹھاتا ہوا قریب آن رکا تھا اور ان کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''کیا یہ محبت ہے؟'' ان کے لہجے کا یقین عین کو اپنی جگہ ساکت کر گیا تھا وہ جیسے سراسیمگی سے ان کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھیں اور تیمور اس سکون سے ان کی سمت دیکھنے لگے تھے۔

''آپ جانتی ہیں نواب زادی آپ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ آپ کو مرزا حیدر سراج الدولہ سے محبت نہیں ہے آپ کے اندر اس سچائی کی گونج اکثر ابھرتی ہے تو آواز پرسمت دور تک جاتی ہے اور آپ ہراساں سی ہو کر اس کی نفی کرنے لگتی ہیں۔'' وہ اس درجہ یقین سے کہہ رہا تھا کہ وہ ششدر سی ان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

''ایسا..... ایسا نہیں ہے۔'' انہوں نے مدھم لہجے میں جیسے ایک کمزور سی وضاحت دینا چاہی تھی۔

''ہم حیدر میاں سے وفادار ہیں ہماری مخلصی پر شک کرنے والے کون ہوتے ہیں، اس وفاداری پر سوال اٹھانا ہی آپ کی حماقت ہے۔'' وہ کمزور سے لہجے میں کہتی ہوئی نگاہ پھیر گئی تھی اور تیمور اس چہرے کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

''آپ کی ان پلکوں کا جھکنا ان کی لرزش اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ خود سے بھی اس گھڑی سچ نہیں بول رہیں، کم ازکم آپ کو خود سے سچ کہنے کی ہمت تو کرنا چاہیے نواب زادی۔'' وہ جیسے پُرسکون لہجے میں اسے للکار رہا تھا عین اسے گھورنے لگی تھی۔

''اچھا اگر ہمیں حیدر سے محبت نہیں ہے تو پھر کس سے ہے۔'' انہوں نے جذباتیت سے روانی میں پوچھ ڈالا تھا اور تیمور ان کی سمت جس طور دیکھنے لگے تھے وہ عین کا تمام اعماد بہالے گیا تھا۔

''یہ بات آپ کو معلوم ہو نواب زادی کے آپ کے دل میں کون ہے جو ہے اس کی پردہ داری آپ تمام دنیا سے کرنا چاہتی ہیں مگر خود سے بھی اسے چھپا کر رکھنا چاہتی ہیں آپ کی یہ محبت آپ کو ہی بزدل بنا رہی ہے دیکھیے آپ کی نظر میں کیسی چور ہو رہی ہیں آپ ہم سے نگاہ نہیں ملا پا رہیں اور شاید خود سے بھی نگاہ ملانے کی ہمت ناپید ہے آپ میں۔'' تیمور نے کہا تھا اور ان کو اس حیرت میں مبتلا چھوڑ کر وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے عین نیم جان سی وہیں بیٹھ گئی تھیں۔

انہوں نے ایک لمحے کو سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھا تھا ان کو اپنے چہرے اور آنکھوں پر کسی اجنبی کا گمان ہوا تھا جیسے ان کا چہرہ ان کا نہ ہو، یا وہ آنکھیں کسی اور کی ہوں جو کوئی ان کے چہرے پر چھوڑ گیا ہو۔

''یہ کیا ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ الجھ کر اپنے چہرے اور آنکھوں کو چھوتے ہوئے دیکھنے لگی تھیں جیسے وہ پریقین نہ ہوں کہ یہ خدوخال ان کے ہیں کہ کسی اور کے عین نے بغور دیکھا تھا انہیں آئینے میں تیمور دکھائی دیے تھے۔

''تیمور۔'' انہوں نے بے ساختہ پکارا تھا اور خود حیرت زدہ سی رہ گئی تھیں۔



''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ آپ نواب زادی سے محبت کرتے ہیں نا؟ پھر خوش بخت سے اچانک رشتہ جوڑنے کے بارے میں سوچنا تیمور اس کے لیے آپ پر دباؤ کس نے ڈالا، ہم آپ کی والدہ ہیں جب ہم نے اس معاملے میں آپ کی خواہش کا احترام کر کے آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تو اب پھر؟'' بیگم حکمت بیٹے کی بدلی روش دیکھ کر حیران ہوئی تھیں تیمور بہت الجھے ہوئے دکھائی دیے تھے۔

''اس قدر غصہ کس بات پر ہے اس سے قبل تم نے اتنا غصہ کبھی نہیں کیا تیمور یہ تمہارا مزاج نہیں ہے اپنی ماں کو نہیں بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟'' بیگم حکمت نے بیٹے کو بغور جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولے تھے۔

''آپ کی کس بات سے مخالفت کرنا کیا ثابت کرتا ہے تیمور کس کے کہنے کے باعث اپنا ضبط کھونا کیا روا ہے میں نے آپ کو ایسا نہیں سکھایا یہ پانی کا گلاس لو اور پی کر تمام سوالوں کا جواب دو۔ جب تک تم ان سوالوں کے جواب نہیں دو گے میں تم سے بات نہیں کروں گی۔'' بیگم حکمت نے کہا تھا اور تیمور ماں کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''تم اچانک سے یہ سب کیوں چاہ رہے ہو کیا اس کی وجہ عین النور ہیں؟'' بیگم حکمت نے کہا تھا مگر وہ قطعی لہجے میں بولے تھے۔

''ہم آپ کے ان سوالات کے جوابات نہیں دے سکتے، معذرت چاہتے ہیں پلیز اس معاملہ میں باز پرس رکھیے میں خوش بخت سے نکاح کرنے کو تیار ہوں اور رشتے میں پیش رفت چاہتا ہوں۔'' تیمور نے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور بیگم حکمت بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں پھر مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''آپ ہمارے بیٹے ہو اور ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ آپ اپنے اندرونی خلفشار کے لیے کسی اور کی زندگی کو تختہ مشق بنا ڈالو ہمیں یہ قبول نہیں ہوگا نہ یہ آپ کو زیب دیتا ہے آپ تیمور بہادر یار جنگ ہیں اور یہ آپ کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔'' بیگم حکمت نے انہیں باور کر دیا تھا۔

''ہم ایسا نہیں کریں گے ہم کسی کی زندگی کو تختہ مشق نہیں بنائیں گے آپ اس طرف سے بے فکر رہیں۔'' تیمور نے جتایا تھا اور پھر معذرت چاہتے ہوئے چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے۔ بیگم حکمت بیٹے کے بدلے ہوئے مزاج پر حیران رہ گئی تھیں۔ وہ تادیر اس متعلق سوچتی رہی تھیں مگر کوئی سرا ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا مگر اس صورت حال نے ان کو بہت پریشان کر دیا تھا۔



''ہم یہ سوچ کر ہی شرمندہ ہیں کہ نواب زادہ نے ہم سے اپنا رشتہ جانے بنا ہم سے نکاح کیا شاید وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر ہم جانتے تھے ہمیں اس راز سے

آ گاہ کرنے والے حیدر میاں تھے ہم نہیں جانتے کہ یہ سچ تھا یا کوئی چال مگر انہوں نے ہمارے دل و دماغ میں یہ بیج بو دیا تھا کہ ہم نواب صاحب سے کوئی رشتے تو ضرور رکھتے ہیں اور وقت کے ساتھ ہمارا یہ شک مزید پختہ ہوتا گیا ہم نہیں جانتے ہم نے محض ایسا سوچ کر اس شک کو اپنے اندر تقویت دی مگر ہم یہ بات بہت بار آپ سے بھی پوچھنا چاہتے تھے مگر ہم نہیں پوچھ سکے۔'' فتح النساء الجھ کر بولی تھیں اور بوا ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں، پھر مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''اگر آپ شک کے بیج اندر بو کر ان کی آبیاری میں لگی رہیں گی تو وہ بیج ایک دن تناور درخت ضرور بن جائے گا فتح النساء۔'' بوا نے جتایا تھا۔ فتح النساء نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ تو نواب چاچا کے بارے میں بہت جانتی ہیں بوا ان کی پرانی ملازمہ ہیں آپ تو اس حقیقت کے بارے میں ضرور کچھ جانتی ہوں گی نا؟'' فتح النساء نے پہلی بار کھل کر بات کرنا ضرور خیال کیا تھا بوا نے ان کو تحمل سے سن کر سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا نواب سیف صاحب ایک نیک انسان ہیں ان کے بارے میں آپ کسی سے بھی پوچھیں گی تو آپ کو یہی جواب ملے گا ان کے بارے میں ایسی باتیں پھیلانے والوں کون ہے اور اس کے شر سے اسے کیا فائدہ ملتا ہے یہ تو وہی شخص بتا سکتا ہے مگر جہاں تک میں جانتی ہوں نواب صاحب ایسے کسی معاملے میں ملوث نہیں پائے گئے وہ نیک فطرت انسان ہیں انہوں نے آپ پر ہی نہیں کئی بچوں پر احسانات کیے ہیں مگر وہ نیکی کا عمل اس درجہ خاموشی سے کرنے کے قائل ہیں کہ کسی اور کو اس کی قطعاً خبر نہ ہو وہ کئی بچوں کی کفالت اور تعلیم کے اخراجات اٹھاتے رہیں ہیں۔ کئی بچے تو بیرون ملک بھی تعلیم کی غرض سے گئے ہیں نواب صاحب کئی بچوں کو ان کی سمت دکھانے میں معاون رہے ہیں نواب صاحب کی شخصیت پر شک کرنا مناسب نہیں۔'' بوا نے سمجھایا تھا فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''نواب صاحب ایمان داری اور وفاداری سے رشتے نبھانے کے قائل رہے ہیں اگر آپ سے ان کا کوئی خون کا رشتہ ہوتا تو وہ آپ کو ڈنکے کی چوٹ پر دنیا کے سامنے قبول کرتے بیٹی کو قبول کرنا کوئی گناہ نہیں ہے آپ نواب صاحب کی صاحب زادی نہیں ہیں مگر انہوں نے آپ کو اپنی صاحب زادی سمجھا ہے اور ہمیشہ نواب زادی کے برابر کی اہمیت دیتے ہیں محل میں آپ کی اہمیت اس طور ہے میں نہیں جانتی کون سی بات ایسے خیالات کا موجب بنا مگر یہ درست نہیں ہے۔'' بوا نے کہا نہیں پھر اٹھ کر چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھیں فتح النساء خیالوں میں کھوئی وہیں بیٹھی رہی تھی۔



تیمور خاموشی سے بالکونی میں کھڑا تھا جب قدموں کی آہٹ پر انہوں نے چونک کر دیکھا تھا وہاں ہلکا گلابی آنچل لہرایا تھا تیمور جاننے کو متجسس نہیں تھا مگر جانے کیوں نگاہ وہاں بندھ گئی تھی اور حیرت تب اور بھی بڑھ گئی تھی جب وہ گلابی ملبوس وجود سامنے آ گیا تھا وہ چونکے تھے نواب زادی عین النور ان کے سامنے تھی مگر انہوں نے حیرت کے باوجود زبان سے کچھ نہیں کہا تھا اور پلٹ کر دوبارہ بالکونی میں جا رکے تھے اور نگاہ تاریکی میں مرکوز کرتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگے تھے۔ مگر یک دم ایک نازک سا ہاتھ ان کی سمت بڑھا تھا اور ان کے لبوں میں دبا سگریٹ نکال لیا تھا تیمور چونکے تھے ایسا کرنے والی کوئی اور نہیں تھی عین النور تھیں لمحہ بھر کو ان کو گمان ہوا تھا۔ جیسے یہ کوئی خواب یا خیال تھا شاید یہی سوچ کر انہوں نے عین کی طرف دیکھا تھا مگر عین النور ان کی طرف سے نگاہ پھیر کر دیکھنے لگی تھی اور پھر اس نے وہ سگریٹ دیکھتے ہی دیکھتے بالکونی کی ریلنگ سے نیچے اچھال دیا تھا تیمور نے حیرت سے رخ کی سمت دیکھا تھا۔

''ایسا غصہ آپ کو کب سے آنے لگا؟ آپ کو غصہ کرنے کے عادی نہیں ہیں تیمور۔'' نواب زادی نے ان کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

تیمور سمجھ نہیں پائے تھے کہ گویا حقیقت تھی یا گمان مگر وہ اپنی سگریٹ ریلنگ سے اچھالے جانے پر گویا ہوئے تھے۔

''آپ نے سگریٹ ریلنگ سے دوسری سمت کیوں

اچھا دی؟'' ان کا لہجہ برہمی اور خفگی لیے ہوئے تھے اور عین خاموشی سے ان کی سمت دیکھنے لگی تھی پھر بہت پر اعتمادی سے شانے اچکا کر بولی تھی۔

''سگریٹ صحت کے لیے مناسب نہیں آپ کو احتیاط برتنا چاہیے یوں بھی آپ کے مزاج کو یہ سگریٹ سگار سوٹ نہیں کرتے انگلستان سے اعلیٰ تعلیم لے کر لوٹے ہیں آپ مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہیں آپ ایسی ذمہ دار شخصیت کیا ایسی بے پروائی کرتی اچھی لگتی ہے؟ کئی ذمہ داریاں میں آپ کے کاندھوں پر سنا نہیں آپ نے سگریٹ نوشی کرنے سے سینے کے امراض لاحق ہوجاتے ہیں۔ اور بڑھاپا کھانستے گزرنا ہے اگر آپ کی زوجہ محترمہ کو آپ کا کھانسنا قبول نہ ہوا تو آپ سے قطع تعلق کر کے گھر سے باہر کر دیں گی نا، ایسا کیا قابل قبول ہوگا آپ کو؟'' نواب زادی عین النور بولی تھیں ان کی روشن چمکتی آنکھوں میں ایک خاص روشنی پھوٹتی محسوس ہوئی تھی غالباً یہ ان کے مسکرانے کا باعث تھی تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے اور نگاہ بدلتے ہوئے مدہم لہجے میں بولے تھے۔

''یہاں آنے کا سبب کیا ہے اگر آپ خواب و خیال ہیں تو لوٹ جایئے ہمیں آپ کی سمت نگاہ نہیں کرنی کوئی بات نہیں کرنی۔'' تیمور برہمی سے بولے تھے نواب زادی اطمینان اور مکمل پرسکون انداز میں ان کی سمت تکتے ہوئے مسکرا دی تھیں۔

''اگر آپ جتانا چاہتے ہیں کہ آپ کسی بات سے خفا ہیں تو یہ کوئی بڑا جواز نہیں ہے۔'' عین نے شانے اچکا کر بے تاثر انداز سے کہا تھا۔

''آپ نے ہماری سگریٹ کیوں پھینک دی۔''

''تاکہ آپ کو زندگی کی خوب صورتی کا احساس اس غصے کی کیفیت میں بھی ہوسکے۔''

''ہمیں کوئی احساس نہیں کرنا۔'' وہ اسی برہمی سے بولے تھے۔

''اگر زندگی میں موجود وجود ان کی اہمیت کا اندازہ ہے تو آپ سگریٹ کو ہاتھ لگانا ضرور خیال نہیں کریں گے۔'' عین النور نے جتایا تھا۔

''ہم چیزوں کا موازنہ نہیں کرتے یہ واجب نہیں ہے۔'' تیمور نے بے تاثر انداز میں کہا تھا۔

''موازنہ کرنے سے ہی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تیمور۔''

''اور آپ یہاں کیوں آئیں۔''

''کیونکہ آپ ہمارے دوست ہیں اور ہم آپ کے خیر خواہ ہیں۔''

''ہمیں آپ کی خیر خواہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''واسطہ تو ہونا چاہیے تیمور، دوستوں کی ناقدری نہیں کرتے۔'' عین مسکرائی تھی وہ غالباً ان کی خفگی اور برہمی کم کرنا چاہ رہی تھی مگر تیمور نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

''آپ ہمیں ایسی الزام دیتی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں، ایک سگریٹ ہی تو ریلنگ سے باہر اچھالی ہے نا۔ آپ کی کائنات تو نہیں۔ آپ تو ایسے برہمی دکھا رہے ہیں جیسے ہم نے آپ کی دنیا کی ہر شے تہس نہس کر ڈالی ہو۔'' عین النور نے اکتا کر ان کی طرف دیکھا تھا تیمور ان کو خاموشی سے دیکھنے لگے تھے ان کو اب تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ درحقیقت اس جگہ ان کے گھر تشریف لائی تھیں یا یہ محض ان کا وہم تھا۔

''آپ ہمیں اجنبی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں تیمور ہم آپ کی دوست ہیں برسوں کا تعلق یک دم فراموش کر دیا آپ نے۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

تیمور نے سر انکار میں ہلایا تھا اور پھر نگاہ پھیر کر بالکونی سے اس طرف چھائی تاریکی کو گھورتے ہوئے جیسے خود کلامی میں بولا تھا۔

''دور کھڑا آپ کو خاموشی سے دیکھتا رہوں گا مگر آپ کی سمت تب تک قدم نہیں بڑھاؤں گا جب تک آپ میری طرف نگاہ نہیں کرتیں اور وہ نگاہ اشاروں کنائیوں میں یہ نہیں کہتی کہ انہیں میری اسی طور ضرورت ہے جس طور مجھے میں تب تک آپ کی سمت قدم نہیں بڑھاؤں گا جب تک کہ آپ جتا نہ دیتیں کہ محبت ہم دونوں کے لیے ضروری ہے اور ہم

ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ میں یہ بات آپ کی بولتی آنکھوں سے سننا چاہتا ہوں اور اس قدر خاموشی اور راز داری سے کہ جہاں کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔'' تیمور کا لہجہ بہت مدہم تھا عجیب خود کلامی جیسا عین کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھن سے پر نظروں سے ان کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

''معذرت خواں ہیں آپ کی آواز مدہم تھی ہم سمجھ نہیں سکے کہ آپ کے تخاطب ہم ہیں یا کوئی اور؟'' وہ الجھ کر بولی تھیں۔

تیمور نے ان کی سمت دیکھے بنا سر نفی میں ہلا دیا تھا گویا وہ دانستہ ان کی سمت دیکھنے سے گریزاں تھے۔

تیمور کو لگا تھا وہ خیال میں اور ابھی تحلیل ہو جائیں گی مگر یک دم سماعتوں سے بیگم حکمت کی آواز ٹکرائی تھی اور وہ اس جانب متوجہ ہوئے تھے تب بھی نواب زادی عین اسی طور وہاں کھڑی دکھائی دی تھیں۔

''نواب زادی آپ یہاں ہیں آپ کی والدہ محترم بیگم آپ کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔'' بیگم حکمت بولی تھیں مگر نواب زادی کی توجہ ہر بات سے ہٹ کر خوش بخت پر مرکوز ہوئی تھی جو اس لمحے ان کے ہمراہ کھڑی تھیں اور بیگم حکمت اپنے ہونہار سپوت کی سمت دیکھتیں ہوئی کہہ رہی تھیں۔

''تیمور خوش بخت کو آپ سے ملنا تھا غالباً کوئی ضروری بات کرنا تھی۔'' تیمور مڑا تھا اور اس حکم کی پابندی کرتے ہوئے خوش بخت کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا تھا دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے حد نگاہ تک عین کی توجہ کا مرکز رہے تھے بیگم حکمت نے ان کی جانب توجہ کر کے ان کو چونکایا تھا۔

نواب زادی آپ فہرست طعام میں کسی خاص شے کا اندراج چاہتی ہیں تو آگاہ کر دیجیے ہم ملازم سے کہہ کر شامل کرا دیتے ہیں۔'' بیگم حکمت نے خاص مروت سے مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر عین کی نگاہ متواتر وہیں تھیں یہاں تیمور اور خوش بخت گئے تھے۔

''یہ...... یہ کون ہیں چچی جان ہم نے پہلے کبھی ان محترمہ کو اس گھر میں نہیں دیکھا۔'' نواب زادی نے دریافت کیا تھا اور بیگم حکمت پُرسکون انداز میں مسکرا دی تھیں۔

''یہ خوش بخت ہیں ہم ان کو تیمور کے لیے منتخب کر رہے ہیں۔'' انہوں نے آگاہ کیا تھا۔

''کیا...... کیا مطلب؟'' نواب زادی نے چونک کر پوچھا تھا مگر احساس ہونے پر لب بھینچ کر کچھ لمحوں تک خاموش رہی تھیں پھر گویا ہوئی تھیں۔

''ہم سمجھے نہیں۔'' اگرچہ بات تو کسی قدر واضح تھی مگر نواب زادی نے پوچھا تھا اور بیگم حکمت نرمی سے مسکرا دی تھیں۔

''خوش بخت کو تیمور نے اپنے لیے چنا ہے۔'' ان کی وضاحت سے ہم غلط فہمی جاتی رہی تھی عین ششدر میں ان کی سمت دیکھ رہی تھی پھر سنبھل کر مروت سے مسکرائی تھیں اور خشک لبوں کو تر کرتی ہوئیں گویا ہوئی تھیں۔

''یہ کب ہوا ہمارا مطلب ہے تیمور نے اس کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی اگرچہ ہم اچھے دوست ہیں۔'' نواب زادی نے بات بنائی تھی بیگم حکمت مروت سے مسکرائی تھیں۔

''ہم اس متعلق واقف نہیں بیٹا مگر ہم نے خوش بخت کو کچھ عرصہ قبل تیمور کے لیے چنا تھا مگر تب تیمور ایسی کوئی دلچسپی ظاہر کرنے میں پیش رفت نہیں دکھا رہے تھے مگر کل اچانک انہوں نے مطلع کیا کہ ان کو خوش بخت بطور شریک حیات قبول ہیں اور یہ کہ ہم معاملات کو مثبت طریقے سے آگے بڑھائیں۔'' بیگم حکمت نے آگاہ کیا تھا نواب زادی ان کی سمت خاموشی سے دیکھتی رہی تھیں بیگم حکمت ان کی کسی کیفیت سے قطعی بے خبر گویا ہوئی تھیں۔

''خوش بخت ایک ذہین دوشیزہ ہیں زمانے کے اطوار سمجھتی ہیں پڑھی لکھی ہیں اور ہر لحاظ سے تیمور کے لیے ایک اچھا انتخاب ہیں مگر تیمور نے اس سے قبل اس رشتے کی مخالفت کی تھی مگر کل اچانک کہا آپ بات آگے بڑھائیں۔'' بیگم حکمت نے کہہ کر شانے اچکائے تھے پھر نرمی سے پوچھنے لگی تھیں۔

''آپ سے فہرست طعام کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''نہیں...... ہم گھر جانا چاہیں گے اماں جان کو کسی

ضروری کام سے خالہ سے ملنے بھی جانا ہے۔'' عین نے بروقت ایک معقول جواز ڈھونڈا تھا اور پھر یک دم چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھیں۔ بیگم حکمت ان کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔



''بال بال بچ گئے اگر چہ ہم نے بات سنبھالنے کی کوشش تو کی تھی مگر ہم نہیں جانتے نواب صاحب مطمئن ہوئے کہ نہیں مگر ایک پل کو تو عالم وہ تھا کہ لگا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں ہم پر اتنا گھڑوں پانی کبھی نہیں پڑا جتنا آج محسوس ہوا گویا ہم ان کی نگاہ میں صاف مجرم تھے اور ان کی نگاہ ہمیں بغور جائزہ لیتے ہوئے بھی جیسے رعایت دے رہی تھی نواب صاحب کی یہ مروت ہمیں ایک آنکھ نہیں بھائی ان کی اس بات سے ہمیں چڑ ہوتی ہے خود کو ایسے پیش کرتے ہیں جیسے انتہائی فرشتہ صفت ہوں، ماں ان کا کردار بے داغ رہا ہے مگر ایسی بھی کیا دنیاداری کے اچھائی کا پرچار کرنے کو محترم خود کو انسانیت کی عظموں کے اعلیٰ مقام پر فائز کرنے کا سوچنے لگیں مانا انسانیت ہیں ان میں مگر ان کا طریقہ عجب نیچا دکھاتا ہوا سا لگتا ہے۔'' مرزا سراج الدولہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولے تھے ان کی بیگم نے ان کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کی تھی اور نرمی سے گویا ہوئی تھیں۔

''آپ نے مناسب نہیں کیا مرزا صاحب وہ آپ کے سمدھی ہیں ان کی عزت ملیامیٹ کرنے کے بارے میں سوچنا بھی ایک برا حوالہ رکھتا تھا آپ کو ایسا اقدام کرنے سے قبل سوچنا چاہیے تھا سوچیے اگر اس کوئی نئی سازش انہوں نے آپ کے خلاف رچائی ہوتی تو آپ کیا کرتے، ان سے ہماری رشتے داری ہے اور رشتے داری میں کسی کو محض نیچا دکھانے کے لیے ایسے ہتھکنڈے اپنانے کے لیے ہم آپ کو قطعاً نہیں سراہیں گے۔'' بیگم کا لہجہ کس قدر تلخ ہوا تھا مرزا نے زوجہ محترمہ کو گھورا تھا۔

''آپ کو ان معاملات کی کیا خبر ہر بات میں آپ کا بولنا ضروری ہے بیگم آپ خاموش سادھ کر باورچی خانے کا رخ کریں اور ہمارے لیے قہوہ بنوایئے دماغ دکھ رہا ہے۔'' انہوں نے بیگم کو ڈپٹ کر رخصت کرنا چاہا تھا وہ خاموشی سے انہیں دیکھ کر باہر نکل گئی تھیں اور مرزا صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے تھے۔

''کبھی کبھی کسی کی کامیابی برداشت نہیں ہوتی انسانی فطرت ہے یہ ہم کوئی فرشتہ نہیں ہیں بندہ بشر ہیں ہم ایسے اعلیٰ انسان نہیں یا انسانیت کا تاج پہننا چاہتے ہیں ہم نے جو کیا ہم اس پر قطعاً شرمندہ نہیں، نواب صاحب کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے تھے کیونکہ ہمیں ان کی کامیابی اور مقبولیت ایک آنکھ نہیں بھائی، ایسے فرشتہ ہیں تو رہیں فرشتہ ہمیں کیا، مگر دوسروں کو احساس کمتری دنیا محض اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے کیا یہ عمل مناسب ہے؟ کتنا اچھا ہو جاتا جو اگر یہ سب ثابت ہو جاتا آہ ایسی جگ ہنسائی ہوتی محترم کی کہ انگشت بدنداں رہ جاتے اب سازش کامیاب ہونے سے قبل سب ثبوت اکٹھا کر کے ہمیں شرمندہ کرنے کے درپے ہیں پھر وہی ان کا اعلیٰ افضل ہونا اور ہمارا پست قامت، نواب صاحب کو بھی جیسے کو عارضہ لاحق ہے۔'' وہ چڑ کر بولے تھے اور پھر سگریٹ سلگا کر اس نے کش لینے لگے تھے۔



نواب صاحب چلتے ہوئے آئے تھے عین بہت کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھیں وہ ان کی کیفیت کو اس موجودہ صورت حال سے منسلک کرتے ہوئے کسی قدر متفکر ہوئے تھے۔

''عین بیٹا کیا ہوا؟ آپ کس بات کو سوچ رہی ہیں آپ کی تشویش اب کوئی معنی نہیں رکھتی سو اب مزید کچھ سوچیے ہم نے رشتوں کے وقار کو بکھرنے نہیں دیا کچھ بھی ہو جائے رشتوں کا وقار مجروح نہیں ہونا چاہیے چہرے اور رشتے دونوں بدنما دکھائی دینے لگتے ہیں ہم نے ہر احساس کو ایک طرف رکھ کر رشتوں کے تقدس کو بچایا ہے اور کس تعلق پر آن نہیں آنے دی۔'' نواب صاحب مدہم لہجے میں گویا تھے عین نے بنا کچھ کہے اٹھ کر ان کے شانے پر سر رکھ دیا تھا انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیٹی کو دیکھا تھا اور اپنا دست شفقت ان کے سر پر رکھ دیا تھا۔

''اباجان ہم یہ نکاح نہیں کرنا چاہتے اس خاندان سے کوئی رشتہ باقی رکھنا نہیں چاہتے مرزا چاچا نے آپ پر اتنا بڑا

الزام لگایا آپ کی عزت کی پرخچے اڑا دینا چاہیے ہم ایسے شخص کے بیٹے سے زندگی کا ناطہ نہیں جوڑ سکتے۔" وہ آنکھوں میں نمی لیے مدہم لہجے میں گویا تھیں۔ نواب صاحب نے ان کے سر پر بوسہ دیا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

"بیٹا انسان کے اعمال اس کا زادہ راہ ہوتے ہیں، جو انسان اچھائی یا برائی کا مرتکب ہوتا ہے وہ کسی اور کے لیے نہیں درحقیقت اپنے لیے گڑھا کھودتا ہے ہر انسان اپنے اعمال کا کیا بھگتے گا ہم انسانوں کو کوئی اختیار نہیں کی ہم ان کے اعمال کی جانچ پڑتال کریں یا ان کے لیے سزائیں تجویز کریں اس عمل کو اللہ پر چھوڑ دینا بہترین عمل ہے اللہ اسے معاف کرتا ہے کہ نہیں یہ اللہ اور بندے کا آپس کا معاملہ ہے ہم اس بارے میں بحث کرتے یا جانچ پڑتال کرتے مناسب دکھائی نہیں دیتے انسان کو اس بات کا کوئی اختیار نہیں سو ہم نے مرزا صاحب کو معاف کردیا ہے ہمیں ان سے کوئی پُرخاش نہیں ہے انہوں نے اگر کوئی برا عمل کیا بھی ہے تو ان کا اپنا فعل ہے اس کے لیے وہ اپنے رب کو جواب دے ہوں گے، اس کے متعلق ہمیں بات کرنا زیب نہیں دیتا عیب کرنے سے یا دوسروں کے عیب گننے سے ہمارے اعمال بھی جانچ پڑتال کا باعث بنتے ہیں جب ہم کسی اور کو ان کو برے اعمال کے لیے زیر بحث لاتے ہیں تو ہم دراصل وہ عیب اپنے نام سے درج کراتے ہیں، برائی کرانے والا محض برا نہیں ہوتا غیبت کرنے والا اور معاف نہ کرنے والا بھی اتنا ہی برا قرار پاتا ہے۔" نواب صاحب بیٹی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے تھے نواب زادی نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"ابا جان آپ کا ظرف بڑا ہے اور دل کشادہ مگر ہم ایسے چال باز شخص کے صاحب زادے سے کوئی رشتہ نہیں چاہتے ہم اس احساس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے کہ ہمارے خاوند اس شخص کے سپوت ہیں جنہوں نے ہمارے والوں کے خلاف اتنی بڑی سازش رچائی۔" عین النور فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئی تھیں نواب صاحب نے ان کو اپنے مقابل بٹھایا تھا اور ان کے سامنے بیٹھ کر پُرشفقت لہجے میں بولے تھے۔

"بیٹا زندگی میں اس سے بڑی سازشیں ہوتے دیکھی نہیں لوگ تختے الٹ دیتے ہیں یہ سازش تو کامیاب ہونے سے قبل بے نقاب ہوگئی، ہمیں تو اس کے لیے اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہیے اچھے لوگوں کی مدد ہمیشہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر ہمارا کوئی عمل نیک اور صالح تھا تو اس کے بدلے ہمیں اللہ نے بچالیا ہے ہمیں مرزا صاحب سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ انسان کی فطرت میں حسد اور دیگر خامیاں پایا جانا باعث حیرت نہیں ہے انسانی فطرت کو جھٹلایا یا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں انسانوں سے نہیں اپنے رب سے امید رکھنا چاہیے مرزا صاحب دوست ہیں احباب سے شکوے کرنا مناسب نہیں اگر وہ خود اپنے کیے پر شرمندہ ہیں تو ان کی معافی ممکن ہے اگر وہ نیک راہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوگی مگر ایسے لوگ کب اچھائی کی سمت قدم بڑھائیں یا ایسی سازشوں کو جاری رکھیں؟ اس کے متعلق خبر نہیں ہوتی ہمیں ان کو معاف کرنا تھا ہم نے دل سے ان سے حسن سلوک کرتا ان کو شرمندہ نہیں ہونے دیا نہ جھکنے نہیں دیا دوستوں کی قدر کرنا ہماری روایت ہے آپ بھی مرزا صاحب کے عمل کو بھول جایئے، حیدر میاں پڑھے لکھے انسان ہیں یقیناً ان کی فطرت اپنے والد محترم کی فطرت سے مختلف ہوگی، آپ مرزا صاحب کی خطا کو حیدر میاں سے منسلک مت کریں یہ مناسب عمل نہیں ہے...... ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ آپ ٹھنڈے دماغ سے از سرنو سوچیے آپ کو حیدر میاں اس سازش کا حصہ نظر نہیں آئیں گے۔ ان کا کردار اور اعمال اپنے والد محترم سے قطعاً مختلف ہیں، یوں بھی ہم کسی اور کے کیے کی سزا کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے...... آپ ہماری بات سمجھ رہی ہیں نا؟" نواب صاحب نے پوچھا تھا عین نے والد محترم کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



بددعا

سلیم اختر

بھوپال کے نواح میں اجڑی اور ویران حویلی کی داستان، وہاں کے مکینوں کو ایک مظلوم کی بددعا نے چاٹ لیا تھا۔

مہم جوئی پر مبنی ایک پراسرار داستان

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

بھوپال کے نواح میں ایک پہاڑی اور جنگلی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہاں ایک گاؤں رام گڑھ اپنی آبادی اور وہاں کے ٹھاکر راج کمار کی وجہ سے مشہور ہے۔ رام گڑھ میں کئی ایکڑ پر پھیلی ایک حویلی ہے۔ جو کسی دور میں راج کمار کی ملکیت تھی۔ حویلی کے بڑے گیٹ پر ایک بڑی سی تختی لگی ہے۔ جس پر ''راج کمار افریقہ والا'' لکھا ہے۔ کسی وقت اس تختی پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا تھا۔ مگر اب اس پر سونے کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ تختی بھی اپنی رنگت کھو چکی ہے۔ حویلی اجڑ چکی ہے۔ اور ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ابھی اس میں جنگلی جانور سانپ اور بدروحیں راج کرتی ہیں۔ لوگ اس حویلی کی طرف جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ اس ویران اور کھنڈر نما حویلی کو دیکھ کر دیکھنے والے کے جسم میں ڈر اور خوف کی لہریں سرایت کر جاتی ہیں۔ لگتا ہے ابھی کوئی بدروح اس حویلی سے باہر نکل کر اس کی روح کو فنا کر دے گی۔ حالانکہ اس حویلی میں ہیرے اور جواہرات مدفن ہیں۔ جو کبھی راج کمار اور اس کے خاندان کی ملکیت تھے۔ مگر کسی میں اتنی جرات نہیں کہ وہ حویلی کے اندر جا کر کوئی قیمتی زیور اٹھا لائے۔ حویلی کے لان میں بڑی بڑی کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔ راج کمار کے خاندان کا کوئی بھی فرد سوائے میرے زندہ نہیں ہے۔ سب کے سب ایک جوگی کی بددعا کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ایک وقت تھا حویلی میں رونق تھی۔ ہر لمحے عید کا سا سماں رہتا تھا۔ راج کمار نے بڑی محنت اور شوق سے یہ حویلی تعمیر کروائی تھی اور اس پر کروڑوں روپے خرچ کئے تھے۔ کمروں میں خوبصورتی کے لئے کئی چیزیں سونے کی بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ راج کمار سونے کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس کا کاروبار افریقہ کے کئی ممالک کینیا، یوگینڈا اور تنزانیہ وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ان ممالک میں سونے کی کانیں تلاش کر کے وہاں سے سونا نکال کر کئی ممالک میں فروخت کرتا تھا۔ اس کے اس کاروبار کو کسی قسم کا قانونی تحفظ حاصل نہ تھا۔ اس کے پاس سیکڑوں ملازم تھے۔ جو یہ کام غیر قانونی طریقوں سے اور قانون کی حفاظت کرنے والوں کو خرید کر کرتے تھے۔ راج کمار کے ہاتھ بہت ہی لمبے تھے۔ اس کے تعلقات اوپر کی سطح تک تھے۔ حویلی میں کئی ملازم کام کرتے تھے۔ راج کمار کو رام گڑھ کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔ اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی اولاد والے بن گئے تھے۔ وہ سب کے سب عیش کر رہے تھے۔ راج کمار اور اس کا بڑا بیٹا پرکاش زیادہ تر وقت عرب کینیا میں گزارتے تھے۔ نیروبی میں ان کا بڑا اور شاندار دفتر تھا۔ راج کمار کا چھوٹا بیٹا کبھی دہلی اور کبھی بمبئی میں ہوتا تھا۔ اس کا نام راکیش تھا۔ راکیش انتہائی حد تک حسن پرست تھا۔ اس کی بیوی ارجنا لاکھوں میں ایک تھی۔ پھر بھی وہ ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہ آتا تھا۔ اس کا بیٹا راجندر کمار اور پرکاش کا بیٹا سریندر کمار ہم عمر تھے۔ وہ دونوں ہی راکیش پر گئے تھے۔ دولت نے ان کو بے حد بگاڑ دیا تھا۔ وہ اپنے دادا راج کمار کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے تھے۔ وہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ راج کمار جب افریقہ سے لوٹتا تو حویلی میں جشن کا سا سماں ہوتا۔ اسی وجہ



سے اس کا نام راج کمار افریقہ والا پڑ گیا تھا۔ کوئی تو اسے صرف افریقہ والا ہی کہتے تھے۔

رام گڑھ کے علاقہ میں اکثر جوگی اور سادھو وغیرہ کا گزر رہتا تھا۔ اکثر تو راج کمار کی امارت کا ذکر سن کر اپنی خالی جھولی بھرنے کی آس لے کر آجاتے تھے۔ راج کمار فراخ دلی کا مظاہر نہ کرتا تھا۔ غریبوں، مزارعوں اور غرض مندوں کی مدد کرنے کے سلسلہ میں وہ بے حد کنجوس تھا۔ حویلی کے دیگر مکین بھی اسی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ وہ موسم بہار کے دن تھے۔ راج کمار ان دنوں افریقہ گیا ہوا تھا۔ راکیش بمبئی والے دفتر میں تھا۔ حویلی میں راجندر اور سریندر تھے...... کہ ایک جوگی اپنی جوان بیٹی گیتا کو ساتھ لئے راج کمار کی حویلی تک آپہنچا۔ جوگی کی بڑی بیٹی شیلا کی شادی ہو رہی تھی۔ جوگی راج کمار کی امارت کی دھوم سن کر وہاں اپنی بیٹی شیلا کے جہیز کے سلسلے میں مدد لینے آیا تھا۔ اسے امید تھی کہ راج کمار کی حویلی سے اسے اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس کی بیٹی شیلا کی شادی دھوم دھام سے ہو جائے گی۔ راجندر اور سریندر نے جوگی کے ہمراہ اس کی بیٹی گیتا کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ گیتا حسین ہی اتنی تھی کہ دیکھنے والا چند لمحوں کے لئے کسی سحر میں جکڑا جاتا۔ اس کا سرو جیسا قد۔ متناسب سیمیں بدن۔ سیاہ ہرنی سی بڑی بڑی آنکھیں۔ گلاب کی ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں سے تراشے ہوئے لب۔ ستواں ناک جس میں بڑی نازک سی لونگ کا لشکارا کئی دلوں پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ اس کے عارض پر پڑنے والے چھوٹے چھوٹے بھنور دیکھنے والے کو مبہوت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس پر صراحی کی مانند گردن اور سرخ سفید میدے میں گھلی سندور سی رنگت اور جوانی کی بہاریں ٹوٹ کر برس رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے بے نام جذبے راجندر اور سریندر کو اپنے دلوں

میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کی اور جوگی کو یقین دلایا کہ وہ اس کی بیٹی کے جہیز کے لئے اتنا کچھ دیں گے کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جوگی نے ان کی باتوں کا یقین کرلیا۔ راجندر اور سریندر نے جوگی کو بتایا کہ ان کا دادا راج کمار دہلی گیا ہوا ہے۔ وہ رات کو دیر سے آئے گا۔ وہ ہی تمہاری بیٹی کے جہیز کے لئے رقم دے گا۔ اس لئے تم رات کو حویلی میں ہی رہ جاؤ۔ صبح رقم لے کر چلے جانا۔ جوگی کو نوکروں والا ایک کمرہ دے دیا گیا۔ گیتا کو علیحدہ کمرہ دیا گیا۔ جہاں ایک نوکرانی بھی رہتی تھی۔ یہ راجندر اور سریندر کی چال تھی۔

رات کو انہوں نے گیتا کو زبردستی بے آبرو کر ڈالا۔ صبح ہوئی تو گیتا زندہ نہ تھی۔ اس نے خودکشی کرلی تھی۔

جوگی نے اپنی جوان بیٹی کا حشر دیکھا تو بلک بلک کر رویا۔ جوگی نے روتے روتے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور بلک بلک کر راجندر اور سریندر کو بددعا دی۔ ''بھگوان کرے تم کبھی اولاد کی خوشیاں نہ دیکھ پاؤ۔ تمہارے خاندان کا کوئی بھی فرد مرد ہو یا عورت اولاد پیدا نہ کر سکے۔ یہ حویلی ویران ہو جائے اور کوئی تمہارا نام لیوا نہ ہو۔''

یہ کہہ کر جوگی نے گیتا کی لاش کندھے پر ڈالی اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ اس نے گیتا کی لاش کو آگ لگا دی اور خالی ہاتھ لوٹ گیا۔ اس کے بعد جوگی کی کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی وہ دوبارہ اس حویلی کی طرف لوٹ کر آیا۔ راجندر اور سریندر نے جوگی کی بددعا کو کوئی اہمیت ہی نہ دی اور پھر عیش و مستی کی دنیا میں گم ہو گئے۔ جوگی نے گیتا کی چتا جہاں جلائی تھی۔ وہاں سے کبھی کبھار گیتا کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ جو حویلی تک پہنچتی تھیں۔ لگتا تھا گیتا کی روح ادھر ادھر بھٹک رہی ہے۔ ایک سال بیت گیا۔ راج کمار اور اس کے خاندان پر جوگی کی بددعا کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ ایک سال بعد راج کمار کا چھوٹا بیٹا راکیش اپنے بمبئی والے دفتر مردہ پایا گیا۔ اس کے قتل کی وجہ آج تک معلوم نہیں ہو سکی اور نہ ہی قاتل پکڑا گیا۔ راج کمار نے دولت پانی کی طرح بہائی کہ کسی طرح راکیش کا قاتل پکڑا جائے مگر پولیس اپنی لاکھ کوشش کے باوجود یہ معمہ حل کرنے میں ناکام رہی۔

راج کمار میرا نانا تھا۔ میں اس کی بڑی بیٹی سنیتا کا بیٹا ہوں۔ میں راجندر اور سریندر سے بہت ہی چھوٹا ہوں۔ میں بھی اپنے والدین کے ہمراہ اسی حویلی میں رہتا تھا۔ کئی باتوں اور واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ جب راجندر اور سریندر نے جوگی کی بیٹی گیتا کو بے آبرو کیا تھا۔ اس وقت میری عمر دس سال ہو گی۔ بعد کے حالات بھی میری آنکھوں نے دیکھے ہیں۔ جوگی کی بددعا اب رنگ لانے لگی تھی۔ چار سال گزر گئے تھے۔ اس عرصہ میں حویلی میں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ کوئی عورت اگر امید سے ہوتی تو اس کا حمل بلاوجہ ضائع ہو جاتا۔ راجندر اور سریندر کی شادیاں ایک ہی دن بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھیں اس روز ہماری حویلی میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ میرے نانا نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ اتنا کھانا پکایا گیا کہ انسان اسے کھا نہ سکے اور جانوروں کے کھانے کے لئے جنگل میں پھینک دیا گیا۔ وہ راجندر اور سریندر کی سہاگ رات تھی۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں اپنی اپنی دلہن کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر رہے تھے اور باہر گیتا کی چیخیں اور رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی روح حویلی میں بھٹک کر احتجاج کر رہی تھی۔

راجندر اور سریندر نے ایک ہی خاندان میں شادی کی تھی۔ ان کی بیویاں آپس میں بہنیں تھیں۔ ان کا تعلق بھی امیر خاندان سے تھا۔ ان کا باپ بھی ارب پتی تھا۔ وہ بھی سونے کا ہی بیوپاری تھا۔ صبح ہوئی تو راجندر اور سریندر دونوں کے چہرے بجھے بجھے سے تھے۔ لگتا تھا وہ رات سو نہیں سکے۔ ان کی بیویاں بھی الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ دو دن اور دو راتیں مزید بیت گئیں راجندر اور سریندر کے لبوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ان کی خاموشی اور خلاؤں میں گھورتے رہنا کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔ تیسرے روز ان کی بیویاں اپنے والدین کے پاس گئیں اور پھر لوٹ کر نہ آئیں۔ انہوں نے راجندر اور سریندر سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ راجندر اور سریندر نے بھی اس فیصلہ کو تسلیم کرلیا۔ ہماری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ میرے نانا اور ماموں سریش غصہ سے کھولنے لگے کہ سیٹھ اشوک کمار نے ان کی توہین کی ہے۔ اس نے بیٹیوں کو گھر ہی بٹھانا تھا تو اس نے ان کی شادی کیوں کی تھی۔ راج کمار

اور سریش ......اشوک کمار سے بات کرنے کے لئے اس کے گھر جانے کو تیار ہوئے تو راجندر اور سریندر نے ان کو روک لیا۔

''آپ اشوک کمار کے گھر نہ جائیں۔'' راجندر نگاہیں جھکاتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہ جاؤں؟'' راج کمار غصہ سے بولا۔

''اشوک نے بیٹیوں کو گھر بٹھا کر ہماری توہین کی ہے۔'' سریش بولا۔

''اس میں اشوک اور اس کی بیٹیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' سریندر نے زبان کھولی۔

''تو پھر کون قصوروار ہے؟'' راج کمار غصہ سے بولا۔

''ہم دونوں۔''

''کیا مطلب؟'' سریش حیران کن لہجے میں بولا۔

''ہم دونوں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہم اب باپ نہیں کہلوا سکیں گے۔'' راجندر شرمندگی کے عالم میں بولا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔'' راج کمار جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

راجندر اور سریندر نے جوگی کی بیٹی گیتا کے ساتھ زیادتی کرنے کی تفصیل کے ساتھ ساتھ جوگی کی بددعا کا بتایا تو راج کمار اور سریش کمار سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جوگی کی بددعا میں اتنا اثر ہوگا۔ اس کا تو کسی نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ راجندر اور سریندر کی حالت قابل رحم ہوگئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ بھگوان ان کو اتنی کڑی سزا دے گا۔ حویلی میں ماتم کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ جہاں دو دن قبل مسرتوں کے پھول لہرا رہے تھے۔ وہاں اب خزاں نے ڈیرے ڈال لئے۔

''جوگی کو ہر حالت میں اور ہر قیمت پر تلاش کر کے حویلی لایا جائے۔'' راج کمار نے اپنے خاص کارندوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

مگر ان کے تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جوگی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ راج کمار کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ کیونکہ وہ راجندر اور سریندر سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اس کی دولت اور جائیداد کے وارث تھے۔ اس نے یوگنڈا میں سونے کی تلاش شروع

غزل

کیا یہ بہت ضروری تھا ہمارا یوں جدا ہونا
روشن صبحوں میں تاریکیوں کا چھا جانا
بہار میں پھولوں کا بن کھلے مرجھا جانا
محبتوں کے ساحل پر کشتیوں کا بہہ جانا
حبس بھری ہواؤں میں تتلیوں کا مر جانا
وقت کے سیلاب میں لمحوں کا گزر جانا
رم جھم ساون کا طوفان میں بدل جانا
پر فضا علاقوں میں آفتوں کا آ جانا
شفاؤں کے دور میں درد لا دوا ہونا
کیا یہ بہت ضروری تھا ہمارا یوں جدا ہونا

......☆☆......

نظم

زیست کا حاصل
اک نادان سی پیاری لڑکی
جس کی آنکھیں جھیل سی گہری
جس کی زلفیں کالی گھٹائیں
جس کی پلکیں ٹھنڈی چھاؤں
جو بات کرے
تو پھول کھلیں
جو ہنسے تو کلیاں چٹکیں
وہ نادان سی پیاری لڑکی
مجھ سے جدا ہو کر بھی
میری ذات کا حصہ ہوگئی
میری زیست کا حاصل بن گئی

ریحانہ سعیدہ......لاہور

کرنی تھی۔ اس نے راجندر اور سریندر کو وہاں بلوانا تھا۔ تا کہ وہ اس کے روبار سے واقف ہو جائیں۔ راجندر اور سریندر کا مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہو جانا راج کمار کے لئے گہرا صدمہ تھا۔ یوں بھی ہو جائے گا...... ایسا تو اس نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔ ان ہی دنوں راج کمار کو ایک اور صدمہ سے دور چار ہونا پڑا...... بحری جہاز میں بھاری مالیت کا سونا ہندوستان آرہا تھا۔ اس بار مال راج کمار نے بک نہ کرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے مخبری کر دی کہ اس کا تمام مال بندرگاہ پر پہنچتے ہی پکڑا گیا۔ راج کمار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سرکاری اہلکاروں کے پیٹ بھر کر وہ مال چھڑوالے۔ مگر اس کی کوئی تدبیر اور مال و دولت کام نہ آئی۔ تمام مال بحق سرکار ضبط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی راج کمار کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ دو دن بعد راج کمار رہا تو ہو گیا۔ مگر اخبارات میں اپنی بدنامی کی خبر وہ برداشت نہ کر پایا۔ مال و دولت اس کے کام نہ آسکے اور وہ زندگی سے ناتہ توڑ گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ راج گڑھ میں صف ماتم بچھ گئی۔ جوگی کی بددعا آندھی بن کر راج کمار کی حویلی میں داخل ہوئی اور سب کچھ ملیا میٹ کر ڈالا۔ راجندر اور سریندر کی مردانہ صلاحیتوں کی محرومی کی خبر آگ کی مانند رام گڑھ اور اردگرد کے علاقوں میں پھیل گئی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ انہوں نے حویلی سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا اور پھر خاموشی سے وہ اس محرومی کا علاج کرانے کی غرض سے بمبئی روانہ ہو گئے۔ پھر وہاں سے دہلی...... مگر کوئی بھی ڈاکٹر، حکیم، سادھو اور سنیاسی ان کی محرومی کا مداوا نہ کر سکا۔ دولت پانی کی طرح بہائی گئی۔ مگر جوگی کی بددعا کا توڑ نہ مل سکا۔ انکل سریش نے ان دونوں کو کینیا بلوالیا کہ ممکن ہے وہاں ان کا علاج ہو جائے۔ مگر وہاں بھی ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہاں سے ان کو انگلینڈ بھیجا گیا۔ مگر خوشیاں ان سے روٹھ گئی تھیں۔ ان کو اپنے کئے کی بھیانک سزا ملی تھی۔ اب وہ پچھتاتے تھے۔ مگر کچھ حاصل نہ تھا۔ بظاہر وہ خوبصورت اور بھرپور جوان تھے۔ مگر ان کا اندر سیم زدہ ہو گیا تھا۔ پچھتاوے کی آگ نے ان کو اندر ہی اندر جلانا شروع کر دیا۔ ندامت اور شرمندگی نے ان کو زندگی سے بے زار کر ڈالا۔ وہ رام گڑھ لوٹ آئے اور پھر ایک روز انہوں نے خودکشی کر لی۔ راج کمار کی حویلی ایک بار پھر نوحوں میں

ڈوب گئی...... آہستہ آہستہ حویلی کے اور مکین بھی زندگی سے ناتہ توڑ گئے......

انکل پرکاش نے مجھے بھی کینیا بلالیا۔ اب میں ہی اس خاندان کا وارث اور آخری سہارا تھا۔ میں نے اپنے آنکھوں سے اس حویلی کو برباد ہوتے دیکھا تھا۔ اس لئے میں بے حد حساس ہو گیا تھا۔ میں ہر لمحہ حویلی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ لگتا تھا میں بھی اسی محرومی کا شکار ہوں۔ جس کے شکار راجندر اور سریندر ہوئے تھے۔ مگر میں نے اس پر قابو پانے کا عہد کر رکھا تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ میں ایک بار اس حویلی کو اس طرح آباد کروں گا جس طرح میرے نانا نے آباد کر رکھی تھی۔ انکل پرکاش بھی اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ اب کاروبار کا بوجھ بھی میں نے ہی اٹھانا تھا۔ ایک سال تک میں کاروبار کے رموز سے واقفیت حاصل کرتا رہا۔ پھر میں نے زندگی کے کارزار میں قدم رکھ دیئے۔ سونے کی کانوں کی تلاش میں میں نے دن رات ایک کر ڈالا۔ مقامی مزدور نہایت کم قیمت پر مل جاتے تھے۔ مگر وہاں قبیلہ سسٹم ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ افریقہ اس دور میں بھی ایک تاریک براعظم تھا۔ اس تاریک اور پراسرار خطہ زمین میں بسنے والی مخلوق جدید زمانہ کی ہلاکت خیز سائنسی ایجادوں سے محروم تھی۔ مغربی اور امریکی ایجادوں کے قصے ان لوگوں نے سن ضرور رکھے تھے مگر ان کے بارے میں مزید تفصیلات وہ نہ جانتے تھے۔ وہاں پر کئی قدیم تاریخی قبیلے حکمران تھے۔ ان میں وحشیانہ اور جاہلانہ پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میں نے مزید کئی ماہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں گزار دیئے۔ مگر پھر بھی میں ان کے بارے میں مکمل طور پر نہ جان سکا۔ میری معلومات ابھی تک تشنہ ہی تھیں۔ زائر میں میں نے کافی محنت کی اور ہاں کی ایک مقامی کمپنی کے ساتھ مل کر سونے کا ذخیرہ دریافت کیا۔ ان لوگوں نے میری کمپنی اور میرے ساتھ بہت تعاون کیا اور ہم وہاں سے سونا نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ بہت بڑی کان تھی۔ جس نے نہ صرف مجھے بلکہ راج کمار اینڈ کمپنی کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ میں مالی طور پر بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں انکل پرکاش بھی چل بسے اور میں زندگی کی اس دوڑ میں تنہا رہ گیا۔ اب

میں ایک امیر ترین شخص تھا۔ حسین اور نوجوان لڑکیاں مجھ پر فریفتہ ہونے کے لئے بے تاب رہتی تھیں۔ مگر میں......تو ایک ادھورا اور نامکمل انسان تھا۔ میں اس لئے ان سے دور بھاگتا تھا۔ میں نیروبی کے نائٹ کلبوں میں باقاعدگی سے جاتا۔ شراب پیتا۔ دوشیزاؤں کے ساتھ رقص بھی کرتا۔ مگر میں کسی کو اپنے ساتھ رات گزارنے کی دعوت نہ دے پاتا۔ لڑکیاں میری اس بے رخی کو غرور کا نام دیتیں۔ مگر میں اندر ہی اندر کڑھنے لگتا۔ اپنی بے بسی پر رونا بھی آتا۔ جاگتی آنکھوں میں بلا کی ویرانیاں پھیل جاتیں۔ ان میں کوئی مدھر سپنا نہ ہوتا۔ ادھورے خوابوں کا سایہ تک نہ ہوتا۔ میری آنکھیں اور میرا دل اس طرح خالی تھے جیسے زندگی کا کوئی بھی کیف آور نشہ ان میں کبھی نہ جگمگایا ہو۔ میری بے مہر آنکھیں پیاروں سے گریزاں تھیں اور خواب دیکھنے سے کترانے لگی تھیں ان کی گہرائی میں کئی تلاطم چھپے ہوئے تھے۔ جوان کی پلکوں کے کناروں پر تھرایا کرتے تھے۔ میں ایک گہنایا ہوا چاند تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک دن مکمل مرد بن جاؤں گا۔ مگر ابھی میری توجہ اپنے کاروبار پر تھی۔ مزید ایک سال تک میں کامیابیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی مردانگی کی طرف توجہ دینی تھی۔

ایک افریقی ملک کی مقامی پارٹی سے ایک جزیرہ میں واقع ایک کان سے سونا نکالنے کا معاہدہ طے پایا تھا۔ چھ ماہ بعد جب ہم نے وہاں سے سونا نکالنے پروگرام بنایا تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں ایک فانگ نامی قبیلہ کا کنٹرول ہے اور ان لوگوں کی مدد کے بغیر وہاں قدم بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ سونے کی کانوں پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ فانگ ایک قدیم اور تاریخی قبیلہ تھا۔ ان کی عورتوں کے بارے میں مشہور تھا کہ کالی رنگت کے علاوہ ان میں حسین ہونے کی تمام صلاحیتیں بھرپور موجود تھیں۔ ان کی سربراہ ایک عورت تھی۔ جس کو وہ ملکہ کہتے تھے۔ اس کا نام میقودہ تھا۔ اس کے حسن کے بارے میں لوگ بتاتے تھے کہ وہ ایک آتش فشاں تھی۔ اسے دیکھ کر وقت کی نبضیں رک جاتی تھیں۔ اس کا حسن بے مثال تھی۔ وہ جوان تھی۔ جوانی اس پر گھٹا بن کر برس رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ اس کا جسم اور آنکھیں بولتی ہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ ہوتی

بے خطا مومنین کو اذیت نہ دو

''بِغَیْرِ کل مَا اکْتَسَبُوا'' کی شرط گزشتہ آیت میں ممکن ہی نہ تھی اور اس آیت میں ناگزیر تھی۔ اگر مومنین و مومنات میں سے کوئی اپنے کسی قابلِ گرفت عمل پر مستوجب سزا قرار پائے تو اس سزا پر اذیت کا ہونا تو ناگزیر ہے اور یہ اذیت معاشرے کو اعتدال پر باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو تو انہیں اذیت پہنچانے والا ''بہتان'' اور ''اثم مبین'' کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ بوجھ اٹھانے کی تعبیر ظاہراً اس امر کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ گناہ کا نتیجہ بھگتنا ایک منفی عمل کا فطری ردعمل ہے۔ گویا اللہ کسی کو بغیر ارتکابِ گناہ کے کبھی کوئی سزا نہیں دیتا۔ یہ تو عمل اور ردعمل کے الٰہی قانون کی گرفت ہے۔

بعض کے نزدیک ''بہتان'' ہی ''اثم مبین'' ہے اس میں شک نہیں کہ ''بہتان'' کا ''بہتان'' ہونا واضح ہو جائے تو اس کا ''اثم مبین'' ہونا بھی بیّن ہو جاتا ہے لیکن بسا اوقات ''بہتان'' کی حقیقت دوسروں پر نہیں کھلتی۔ اس لیے ایک جہت سے یہ دو تعبیرات اذیت پہنچانے کی دو صورتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی اہلِ ایمان کو بے خطا اذیت پہنچاتا ہے تو گاہے اپنے اس غلط فعل کی توجیہہ کے لیے اس پر بہتان طرازی کرتا ہے۔ دوسری طرف کسی نیک شخص پر بہتان لگانا بھی باعثِ اذیت ہوتا ہے۔

(تشریح: سورۂ احزاب (۶) آیت: ۵۸)

انتخاب: حنا خان...... پشاور

ہے۔ اسے دیکھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی عورت نہیں...... سلگتا ہوا ایک انگارہ ہے۔ جس سے اس کا سارا بدن جل جائے گا...... ملکہ میقودہ اس جزیرے کی مختار کل تھی۔ اس جزیرہ تک پہنچنا ایک نہایت ہی مشکل کام تھا۔ قبیلہ کے لوگوں کے علاوہ کسی اور شخص کو وہاں جانے کی اجازت ہی نہ تھی۔ ان کی ایک اپنی دنیا تھی۔ وہ اس دنیا سے باہر نہ نکلتے تھے۔ باہر کی دنیا کا کوئی شخص وہاں بھول کر آجاتا تو وہ زندہ لوٹ کر نہ جاتا تھا۔ وہ لوگ اسے گرفتار کر کے ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیتے اور پھر ملکہ اس کے ساتھ جو سلوک کرتی وہ سحر انگیز اور بھیانک بھی تھا......

فانگ قبیلہ کی عورتیں اپنی ناک میں ہر وقت ایک چھوٹا سا تالہ لگائے رکھتیں تھیں جو کہ سونے کا ہوتا ملکہ میقودہ کی ناک میں بھی ایک سونے کا تالا لگا ہوا تھا جو دوسرے تمام تالوں سے بڑا تھا۔ سونے کی کان کو انہوں نے ایک بڑا سا دروازہ بنا کر بند کر ڈالا تھا۔ اس دروازے پر لگا ہوا تالا بھی سونے کا تھا۔ اس تالے کی چابی وہ تالا تھا۔ جو ملکہ میقودہ کی ناک میں لگا ہوا تھا۔ جب تک ملکہ کی ناک والا تالا نہ کھلے۔ کان والا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ اس کی چابی ملکہ کے پاس تھی۔ سونے کے متلاشی اور ملکہ کے حسن کی خیرات حاصل کرنے کے خواہش مند کئی غیر ملکی اس جزیرے میں آخر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ملکہ میقودہ ایک عیاش ملکہ تھی۔ اس نے شادی بھی نہ کی تھی۔ اس کے حسن کا رعب اور جلوہ ہی اتنا طاقتور تھا کہ اس کے قبیلے کا کوئی فرد اور کوئی عورت نہ اس کے آگے زبان کھولتے تھے اور نہ ہی اس سے آنکھ ملا کر بات کرتے تھے۔ کسی کو بھی اس کی حکم عدولی کی تاب نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ کوئی اس کے عمل میں مداخلت نہ کر سکتا تھا۔ کوئی باہر کی دنیا کا مہمان اس جزیرہ میں آجاتا اور جب اسے ملکہ میقودہ کے سامنے پیش کیا جاتا۔ تو وہ ملکہ میقودہ کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ سونا حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ ملکہ کے حسن سے سیراب ہونے کو بھی اس کا من مچل اٹھتا۔ ملکہ ...... اجنبی کی خواہش جان جاتی...... حکم دیتی کہ اجنبی کو مہمان کا درجہ دے کر اس کی خاطر مدارت کی جائے ...... یوں اجنبی کا خوف کم ہو جاتا۔ اس کے بعد ملکہ میقودہ اسے تنہائی میں اپنی خواب گاہ میں بلاتی...... جو خصوصی طور پر بنائی گئی تھی۔ اجنبی مہمان ملکہ کا نیم عریاں جسم دیکھ کر اپنے آپ میں نہ رہتا۔

''تم سونے کی تلاش میں آئے ہو دوست!'' ملکہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی۔

''ہاں...... نہیں...... ہاں...... نہیں۔'' اجنبی کی زبان اس کا ساتھ نہ دے پاتی کہ وہ کیا کہے اور کہا نہ کہے۔

''میں اس سونے کی کان کی مالک ہوں۔ اگر میں تمہاری بن جاؤں تو پھر...... یہ سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔

''ملکہ کے الفاظ اجنبی کے کانوں میں رس گھولنے لگتے...... مرد کے لئے ایک عورت کی قربت ایک ایسی مجبوری ہے کہ اس کو پانے کے لئے مرد عورت کی ہر شرط مان لیتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں صرف دو ہی بھوکیں ہیں۔ ایک پیٹ کی بھوک اور دوسری جنسی بھوک۔ دوسری بھوک ملکہ کی بھی مجبوری تھی۔ پھر جب اس جنس کی آگ ٹھنڈی ہوتی تو اجنبی زندگی کی بازی ہار چکا ہوتا۔ ملکہ میں کوئی ایسی حیوانی کشش تھی۔ جس میں کوئی ایسا زہر تھا کہ جو بھی شخص اس کے ہمراہ رات گزارتا۔ وہ زندہ نہ رہتا۔ مرد کا جسم نیلا پڑ جاتا اور وہ زندگی گنوا بیٹھتا۔

اس پر خطر جزیرے...... فانگ قبیلہ اور ان کی ملکہ کے بارے میں انوکھی معلومات جان کر میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ سوچا بھول جاؤں اس جزیرہ اور سونے کی کان کو۔ میں وہاں سے کچھ بھی حاصل نہ کر پاؤں گا۔ میں دو دن اس بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر میں نے اس مہم کو سر کرنے اور اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ہندوستان سے دو قابل عامل اور سادھو بلوائے۔ ان کو میں نے بھاری رقم دی اور ملکہ میقودہ کے بارے میں تمام حالات بتا کر ان سے اس سلسلہ میں مدد کرنے کو کہا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس راز کو کھوجنے کی بھرپور کریں گے کہ ملکہ میقودہ میں یہ خاص طاقت کہاں سے اور کیسے آگئی ہے۔

کئی ماہ کی سوچ بچار کے بعد میں نے اس جزیرے کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شاید کرہ ارض کا واحد جزیرہ تھا۔ جس کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ اس جزیرہ کو گھنے اور دشوار گزار جنگلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کئی لوگ کہتے تھے۔ یہ جزیرہ آسیب زدہ ہے اور یہاں بد روحیں رہتی ہیں کیونکہ باہر کی دنیا سے اندر جانے والا کوئی بھی فرد واپس زندہ یا

مردہ لوٹ کر نہیں آتا۔ مگر یہ حقیقت نہ تھی۔ اصل حقیقت ملکہ میقودہ تھی۔ جزیرہ کے ایک طرف سمندر تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک سمندر کے اندر نوکیلی چٹانوں کا ایک ہیبت ناک سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور یہ چٹانیں کسی جہاز اور کشتی کو کنارے تک صحیح سلامت نہ پہنچنے دیتی تھیں اگر کوئی شخص جان پر کھیل کر وہاں پہنچ بھی جاتا تو پھر وہ ملکہ میقودہ کی جنسی بھوک کا شکار ہو جاتا۔ میں نے ایک کشتی کرایہ پر لی تھی۔ میرے پاس دوربین تھی۔ میں جزیرہ کے اندر دور تک نہ جانا چاہتا تھا۔ میں نے صرف دوربین سے وہاں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ سادھو اور عامل اپنی ڈیوٹی پر جنگلوں میں گھومنے نکل گئے تھے۔ میں جب جزیرہ میں اترا میں خوفزدہ نہ تھا۔ اونچے اور گھنی شاخوں والے درختوں میں تو کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ میں نہایت ہی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ کیونکہ میں فانگ قبیلے کے کسی بھی فرد کی نظر میں نہ آنا چاہتا تھا۔ میں مسلسل ایک ماہ تک جزیرے کے ساحل کے آس پاس گھومتا رہا اور دوربین کی مدد سے جزیرے کے اندرونی مناظر کو دیکھ کر نقشے تیار کرتا رہا۔ نوکیلی چٹانوں سے میرے جسم پر کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ اس یقین نے کہ میں اس پراسرار جزیرے کی زمین پر کھڑا ہوں۔ جہاں ملکہ میقودہ کی حکومت ہے میرے اندر عزم و ہمت کی نئی روح بیدار ہو گئی۔ میرے ایک طرف سمندر کا نیلا پانی تھا اور دوسری طرف گھنے جنگلوں کا سلسلہ تھا۔ ہر سو پرہول سناٹا طاری تھا۔ حتیٰ کہ کسی پرندے اور جانور کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک روز مجھے ایک کھائی کے پاس انسانی ڈھانچہ نظر آیا۔ اس کا سارا گوشت گل سڑ چکا تھا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر وہاں پڑا تھا۔ ایک لمحہ کو میرے جسم میں خوف کی لہریں سرایت کر گئیں کہ یہ بھی ملکہ میقودہ کا شکار ہو گا۔

☆......☆......☆

وہ ایک اونچی سی پہاڑی تھی۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے مجھے شام ہو گئی۔ میں نے دوربین کی مدد سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ تو مجھے ملکہ میقودہ کی رہائش گاہ نظر آ گئی۔ وہاں گہما گہمی تھی لگتا تھا جیسے کوئی جشن منایا جا رہا ہے۔ وہاں سیکڑوں چراغ جل رہے تھے اور قبیلہ کی لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ ملکہ ان میں نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ اونچی جگہ پر براجمان تھی۔ لڑکیاں رقص کرتے ہوئے اس کے آگے پیچھے جھول رہی تھیں۔ لڑکیاں رقص کے ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھیں ان کے لبوں پر خوشی کے ایسے گیت تھے جن سے وہاں کا سارا ماحول جھوم رہا تھا۔ میری نظریں ملکہ میقودہ پر مرکوز تھیں۔ اس کے حسن نے مجھے مدہوش کر ڈالا تھا۔ ایسا حسن میں نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا اس کا حسن میرے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا۔ وہ خوبصورتی اور حسن کا لافانی شاہکار تھی۔ میرے رگ و پے میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ پہلی بار میرا دل بے قابو ہوا تھا۔ وہ شراب کے خمار کی مانند میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ میری رگوں میں ایک آگ سی دوڑنے لگی تھی۔ میرے من میں ملکہ میقودہ کے حسن کی دولت سے مالا مال ہونے کی خواہش ابھرنے لگی...... میں نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ اس عہد کے ساتھ کہ میں پھر لوٹ کر آؤں گا۔ اور اس جزیرے کا فاتح بن کر واپس جاؤں گا۔

☆......☆......☆

میں لوٹ تو آیا مگر مجھے کسی پل چین نہ تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ میں تو ایک ادھورا اور نامکمل شخص ہوں۔ میں صرف خواب دیکھ سکتا ہوں۔ ان کی تعبیر پانا میرے نصیب میں نہیں ہے۔ مگر میں پھر بھی ملکہ کے حسن کی طاقت کا راز جاننا چاہتا تھا۔ جس کی مدد سے وہ ایک ہی رات میں کسی بھی مرد کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔ یہ ایک انوکھا راز تھا۔ میں اس حقیقت کو جاننے کی ہر کھوج میں لگ گیا۔ عامل اور سادھو بھی اس مشن پر کام کر رہے تھے۔

کئی ماہ کی سر توڑ کوششوں کے بعد ملکہ کی انوکھی طاقت کا راز بھی معلوم ہو گیا۔ عامل اور سادھو نے مل کر یہ راز کھوجا تھا کہ اس جزیرے کے ساتھ ہی ایک اور جزیرہ ہے۔ جس کا رقبہ نہایت ہی کم ہے۔ وہاں پر کوئی انسان آباد نہیں ہے اور وہاں صرف جنگلی جانور رہتے ہیں جن میں زیادہ تعداد بندروں کی ہے۔ اس جزیرہ میں کچھ درخت ایسے ہیں جن پر انگور کی طرح کا ایک پھل لگتا ہے۔ اور وہ ہر موسم میں ہوتا ہے۔ جزیرہ کے لوگ اس پھل کو جیشوا کہتے ہیں۔ اس پھل کی کئی خصوصیات ہیں۔ لیکن سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ اس کا ایک دانہ کھانے سے انسانی جسم میں ایک عجیب طرح کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مرد کھائے تو اس میں مرد انگی اور بے پناہ طاقت جنم لیتی ہے۔ اس کی شخصیت اور وجود میں ایک حیوانی کشش پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک ایسا

مقناطیس بن جاتا ہے کہ جس کی کشش سے صنف نازک اس کی طرف کھچی چلی آتی ہے۔ اگر عورت کھالے تو اس میں بھی ایک مخصوص کشش پیدا ہوجاتی ہے کہ مرد اس کے بازوؤں کے حصار میں آکر موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔ اور وہ ایک ایسی فاتح بن جاتی ہے جو اپنی اس انوکھی طاقت کے بل بوتے پر مرد کو زیر کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوجاتی ہے۔ مگر اس کا نقصان یہ بھی ہے کہ وہ جس نے جیشوا کھایا ہو۔ وہ تو زندہ رہتا ہے مگر وہ جس نے جیشوا نہ کھایا ہو...... زندگی سے ناتہ توڑ جاتا ہے۔ جیشوا ایک فرد کے لئے امرت اور ایک کے لئے زہر بن جاتا ہے۔ بندر وہ پھل کھاتے تھے...... مگر جب ان کی اموات ہونے لگیں تو وہ سنبھل گئے۔ بندروں نے وہ پھل کھانا چھوڑ دیا تھا...... ملکہ میقو وہ دو ماہ بعد اس جزیرے میں آتی تھی اور جیشوا کھا کر لوٹ جاتی تھی۔ بندر ملکہ سے مرعوب تھے۔ ملکہ کی جزیرے میں آمد پر وہ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ ملکہ ان کے لئے کھانے پینے کی اشیاء لاتی تھی۔ جس بناء پر وہ ملکہ جیشوا کھاتی اور لوٹ جاتی۔ ملکہ کے علاوہ وہ بندر کسی اور ذی روح کو اپنے علاقہ میں داخل نہ ہونے دیتے اور نہ ہی وہ کسی کو جیشوا کھانے دیتے۔ ملکہ کی انوکھی طاقت کا راز اس جزیرہ کا پھل جیشوا ہی تھا۔ میں نے عہد کر لیا کہ میں اس جزیرہ میں جاؤں گا اور جیشوا کھا کر ملکہ میقو وہ کا غرور ضرور توڑوں گا۔ مگر وہاں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جنگل میں رہنے والے بھی کبھی کبھی نہایت ہی خوفناک اور بے درد بن جاتے ہیں۔ وہ انسان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور پھر اس جزیرہ میں تو جیشوا کے درخت بھی ان کے قبضہ میں تھے۔ وہاں جانا موت کے دعوت دینے والی بات تھی۔ مگر اس پر تو میری زندگی کا انحصار بھی تھا۔ جیشوا کھا کر میں اپنی کھوئی ہوئی مردانگی بھی حاصل کر سکتا تھا...... زندگی یا موت...... میں نے ان دونوں میں سے ایک کا فیصلہ کرنا تھا۔ دو ماہ اسی سوچ و بچار میں گزر گئے۔ میں خوابوں میں بھی جیشوا ہی دیکھتا کہ میں اس کو کھا کر مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ بن گیا ہوں۔ میرے من میں برسوں سے مرجھائے ہوئے پھول کھل اٹھے ہیں۔ اب مجھے کوئی لڑکی مغرور ہونے کا خطاب نہیں دے گی۔ اب میں کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گا۔ میں نے دیہاتی اور پسماندہ علاقوں میں ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی جو پالتو بندروں کا ناچ اور تماشہ دکھا کر روزگار کماتے ہیں۔ وہ گاؤں اور گلی گلی پھرتے ہیں جلدی ہی میں ان لوگوں تک پہنچ گیا۔ میں نے ان کو بڑی مشکل سے اعتماد میں لیا اور ان کو تمام بات بتا کر ان سے اس سلسلہ میں مدد کی اپیل کی۔ مگر انہوں نے اس جزیرہ میں جانے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ وہاں کالے بندر رہتے ہیں جو بہت ہی خطرناک اور لڑاکا ہیں۔ انہوں نے مجھے کسی دیہات میں ایک ایسے بندر والے کا پتہ دیا جس کے پاس ایک ایسی کالی بندریا تھی جس کا تعلق اس جزیرے کے بندروں سے بنتا تھا۔ میں کئی میل کا سفر طے کرتا ہوا اس تک جا پہنچا۔ اس نے بھی پہلے تو انکار کر دیا۔ مگر جب میں نے اسے رقم کا لالچ دیا تو وہ میرے ہمراہ اس جزیرے تک جانے پر تیار ہوگیا۔ وہ بتانے لگا کہ وہ ایک بار اس جزیرہ میں جا چکا ہے۔ مگر وہ جیشوا کی تلاش میں نہ گیا تھا اور نہ ہی اسے جیشوا کی اہمیت کا علم ہے۔ اس نے بتایا کہ اس جزیرے میں گھنے جنگل اور غار ہیں وہاں بندر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بندر کوئی خوفناک جانور نہیں ہے اور نہ ہی اسے درندہ کہا جاسکتا ہے۔ لاڈ اور پیار سے اس سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ گروپ کی شکل میں ہوں اور وہ اس حالت میں بپھر جائیں تو کسی اکیلے انسان کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ یہ انسان کا گوشت نہیں کھاتے۔ مگر غصہ میں آکر وہ کسی انسان پر ٹوٹ پڑیں تو اس جسم پر گوشت رہنے ہی نہیں دیتے۔ ایسی خطرناک حالت میں وہ کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔ جب ان کے گروہ میں بندر اور بندریا کی شادی ہوتی ہے۔ شادی کے عرصہ میں ان کے گروہ کے قریب سے گزرنا خودکشی کے برابر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس خوشی کے عالم میں وہ اپنی حدود میں کسی بھی انسان کی موجودگی برداشت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ دیگر جانوروں کی موجودگی کی پروا نہیں کرتے۔ شادی کے عرصہ میں ان پر رومانوی کیفیت طاری ہوتی ہے جو نہایت ہی دلچسپ اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شادی کے دنوں میں ان کا خوشی سے اچھلنا اور شور کرنا ایسا لگتا ہے جیسے سیکڑوں انسان قہقہے لگا رہے ہیں۔

اس شخص نے مجھے تسلی دلائی اور کہنے لگا کہ وہ مجھے جیشوا

ضرور کھلائے گا۔ اس کی بندریا کا تعلق ان بندروں کے قبیلہ سے ہے۔ وہ بندریا کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اس کی موجودگی میں بندر اسے کچھ نہ کہیں گے وہ چاہتا تھا کہ وہ اکیلا ہی جائے گا اور جیسے بھی جیشوا لے آئے گا۔ مگر مجھے اس کی باتوں میں مکمل طور پر یقین نہ تھا۔ اس لئے میں نے بھی اسے ہمراہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ کا جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ بندروں نے آپ کو دیکھ لیا اور بپھر گئے تو؟''

''میں دور سے ہی دیکھتا رہوں گا۔ میں ان کے سامنے نہ آؤں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔ اگر کسی بندر نے آپ کو نقصان پہنچایا تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔''

''میرے مقدر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ تم نہیں جانتے کہ جیشوا کھانا میرے لئے کتنا ضروری ہے۔'' میری ضد سے مجبور ہو کر وہ مجھے ساتھ لے جانے پر رضا مند ہو گیا۔ اس نے اس جزیرہ تک پہنچنے کے لئے جنگل کی بجائے ایک صحرائی راستے کا انتخاب کیا۔ وہ ایک طویل، دشوار گزار اور جان لیوا سفر ثابت ہوا۔ صحرائی علاقہ سے گزر کر ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ خدا خدا کر کے وہ سلسلہ ختم ہوتو ہمیں پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنگل سے گزرنے کے بعد پھر میدانی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔ ہم دو دن اور دو راتیں برابر چلتے رہے مگر میدانی سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹیاں برابر نظر آ رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے دوسری طرف وہ بندروں والا جزیرہ تھا۔ مگر پہاڑ کی چوٹیاں دور ہوتی نظر آ رہی تھیں...... وہ صحرائی میدان بھی اب انتہائی خطرناک لگنے لگا تھا۔ ہر لحظہ جنگلی درندوں اور وحشی قبائل کے حملے کا دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ میدان کی خوفناک تنہائی اور تاریکی میں آسمان گھومتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ جس کی کیفیت بھی کسی آندھی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ پھر تیز ہوا چلنے لگی۔ جس نے ریت کو اڑانا شروع کر دیا۔ ہم ایک نشیب والی جگہ پر لیٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی آندھی نے وہ شدت اختیار کی اب ہمیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ہمیں اپنے اوپر ریت گرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اب بندر والا پچھتانے لگا تھا کہ ہم نے میدانی راستہ اختیار کر کے غلطی کی ہے۔ جنگل والے راستے سے جاتے تو صحرائی طوفان اور آندھی سے تو محفوظ رہتے۔ بندریا بھی ہمارا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ معلوم نہیں ریت کا وہ طوفان کتنا عرصہ جاری رہا۔ جب طوفان تھما تو ہم نیم مردہ حالت میں اٹھے۔ ہماری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ کیونکہ ان میں ریت بھری ہوئی تھی۔ نقاہت اور تھکاوٹ نے ہمیں پژ مردہ کر دیا تھا۔ مگر وہاں ٹھہرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگے۔

خدا کی قدرت کہ وہ آسمان جو پہلے آندھی سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اس پر چاند نکل آیا اور مدھم مدھم چاندنی ہر سو پھیل گئی۔ اس روشنی میں ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ بالآخر ہم پہاڑیوں کی وادی میں پہنچ گئے۔ گھنے درختوں کی قطار نظر آنے لگی۔ یہاں سے ہی بندروں والے جزیرے کا آغاز ہوتا تھا۔ ہم اب نہایت ہی احتیاط سے قدم آگے بڑھا رہے تھے چلتے چلتے ہم ایک اونچی پہاڑی پر پہنچ گئے۔ وہاں سے نیچے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مداری نے مجھے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا وہ بندروں کا مسکن ہے۔ اور وہاں ہی جیشوا کے پودے ہیں۔ میں نے دور بین کو صاف کیا اور اس طرح دیکھنے لگا۔ دور بین سے وہاں کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ کئی بندر ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔ کئی درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور کئی پتھروں پر ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی شرارتوں سے میں لطف اندوز ہونے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک مادہ ایک بڑے سے پتھر پر رانی بنی بیٹھی ہے اور ایک بندر اس کے سامنے بیٹھا اسے ایسے انداز سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ اس پر اپنے پیار کا اظہار کر رہا ہو اور اس سے بھی محبت کی بھیک مانگ رہا ہو۔ مادہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تو بندر اچک کر اس طرف ہو گیا اور اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ بندریا نے منہ پھیر لیا۔ بندر کو بہت ہی غصہ آیا۔ اس نے چڑ چڑ شروع کر دی اور پھر دوڑ کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور قلابازیاں لگا کر ادھر ادھر مختلف ٹہنیوں پر پلٹے کھانے لگا۔ یوں ہی پلٹے کھاتے کھاتے وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور سیدھا زمین پر آن گرا۔ وہ

شرمندہ سا ہو کر پھر بندریا کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ بندریا نے پھر بھی اسے منہ نہ لگایا اور اپنا رخ بدل دیا۔ اتنے میں ایک اور بندر آیا۔ بندریا نے اسے دیکھا تو دوڑ کر اس کے پاس چلی آئی اور اس کے منہ سے منہ لگا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پھر وہ دنوں اٹھ کر ایک طرف چل دیئے۔ پہلے والے بندر نے بہت شور کیا اور دانت نکال کر بے ہنگم چڑ چڑ کرنے لگا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو درختوں کے اوپر اور نیچے محبت کے ڈرامے کھیلے جا رہے تھے۔ جن میں لڑائی مار کٹائی اور سنسنی خیز بھی تھی۔ میں اور مداری ان رومان آلود مناظر اور شور میں کچھ دیر کھوئے رہے اور پھر مداری بندریا کو لے کر نیچے گہرائی میں اترنے لگا۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ میں کسی بھی صورت میں نیچے نہ آؤں۔ جب بندروں نے مداری اور بندریا کو دیکھا تو شور وغل یکبارگی تھم گیا اور وہ سب کے سب حیرت زدہ ہو کر مداری اور بندریا کی طرف دیکھنے لگے۔ تمام بندر جہاں تھے وہیں ساکت ہو گئے۔ کچھ خشمگیں نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ کون ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گیا ہے۔ اتنے میں مداری نے اپنی بندریا کو آزاد کر دیا۔ پہلے تو وہ جھجکی اور سوچنے لگی کہ کیا کروں...... پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ کئی بندر دوڑتے ہوئے اس کی طرف آ گئے انہوں نے بندریا کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا اور غضب ناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ انہوں نے چڑ چڑ کی اور بندریا کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر بندریا خاموش اور بھیگی بلی بنی بیٹھی تھی۔ اتنے میں ان میں سے ایک بندر گھیرا توڑ کر ایک طرف بھاگنے لگا اور ایک غار میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا تو اسکے ہمراہ ایک اور بندر تھا۔ جو قد کاٹھ میں ان سب سے بڑا تھا۔ وہ ان کا سردار تھا۔ وہ جب گھیرے والے مقام پر پہنچے تو تمام بندر خاموش ہو گئے۔ وہ سیدھا بندریا کے پاس پہنچا وہ اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ کافی دیر بندر کے پاس ہی کھڑا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس سے پوچھ رہا ہو کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟

جواب میں بندریا نے اسے اپنے اور اپنے مالک کے بارے میں بتایا ہو گا کہ اس کا مالک اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اچھا کھانا دیتا ہے مگر وہ آزادی کی نعمت سے محروم ہے...... بندروں کے سردار نے اس کے مالک کی طرف دیکھا اور کسی قسم کے ردعمل اظہار نہ کیا۔ اس نے تمام بندروں کو بھی منع کر دیا کہ وہ اس کو کسی قسم کا نقصان اور تکلیف نہ پہنچائیں۔ سردار...... بندریا کو ساتھ لے کر غار کی طرف چل پڑا اور پھر وہ دونوں غار میں داخل ہو گئے۔ کئی اور بندر بھی پہاڑی کے دامن میں اتر گئے۔ کئی اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ صرف دو بندر وہاں رہ گئے جو ایک بڑے سے پتھر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس کی نظریں مسلسل مداری کے تعاقب میں تھیں۔ انہوں نے اس وقت تک وہاں بیٹھنا تھا جب تک وہ واپس نہ چلا جاتا۔ مگر اس نے خالی ہاتھ تو واپس نہ لوٹنا تھا۔ اس نے جیشوا توڑنے تھے۔ مداری اٹھا اور آگے بڑھنے لگا۔ بندروں نے اسے کچھ نہ کہا۔ مداری نے کھانے کی چیزیں ان کی طرف پھینکیں جو خاص طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔ دونوں بندر وہ کھانے میں لگ گئے۔ اس عرصہ میں مداری نے جیشوا کے کئی دانے توڑ لئے اس نے کپڑے کے ایک تھیلے میں کافی سارے جیشوا کے دانے ڈال لئے۔ جب وہ واپس مڑنے لگا تو بندروں کو علم ہو گیا کہ وہ جیشوا کے دانے توڑ کر لے جا رہا ہے۔ وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ ساتھ ساتھ چیختے بھی جا رہے تھے۔ اس کے شور کی آواز سن کر کچھ اور بندر بھی آ گئے۔ مداری بھاگا آ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں میں اس کی کامیاب واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر بندروں نے اسے چوٹی پر نہ پہنچنے دیا۔ انہوں نے اس کو دبوچ لیا۔ جیشوا کے دانوں والا تھیلا دور جا گرا اور وہ مداری کو گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گئے۔ مداری چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ مگر میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اگر بندروں کو میری موجودگی کا علم ہو جاتا تو وہ مجھے بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ میں نے دیکھا کہ بندر اور مداری ایک غار میں چلے گئے۔ اس کے بعد نہ تو اس کی چیخیں سنائی دیں اور نہ کوئی بندر نظر آیا۔ انہوں نے مداری کا کام تمام کر دیا ہو گا۔ خوف اور دہشت کے مارے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ جیشوا کے دانوں والا تھیلا وہاں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ ادھر ادھر دور بین سے دیکھا۔ کوئی بندر نظر نہ آیا۔ تو میں نے جان ہتھیلی پر رکھی اور کچھ نیچے اتر کر وہ

تھیلا اٹھایا اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔ میں نہ جانے کتنی دیر بھاگتا رہا۔ ایک جان لیوا اور تھکا دینے والے سفر کے بعد میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔

☆......☆......☆

جیشوا کا ایک دانہ صبح اور ایک رات کھانے سے میں نے ایک ہی ہفتہ بعد اپنے اندر بے پناہ طاقت محسوس کی۔ جوگی کی بددعا کا اثر زائل ہو گیا۔ میں اب ایک مکمل مرد بن گیا تھا۔ میں ایک ماہ مسلسل جیشوا کے دانے کھائے۔ ابھی میرے پاس کافی دانے پڑے ہوئے تھے۔ جیشوا کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا۔ جو کچھ میں نے سنا تھا۔ وہ سچ سے بھی بڑھ کر ثابت ہوا۔ میری تو کایا ہی پلٹ گئی۔ میں اب زندوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ مگر وہ میری بھول تھی۔ میں تو سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا...... جوگی کی بددعا میرے خاندان کو کسی جونک کی مانند چمٹ گئی تھی میں ملکہ میقودہ تک جا پہنچا...... اس کے حسن اور جوانی کی شراب بھی پی لی مگر میں زندہ رہا۔ ملکہ میقودہ کا زہر میری زندگی نہ چھین سکا۔ ملکہ کے لئے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ شاید...... جیشوا کھانے سے میرے اندر کا زہر زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے سب کچھ الٹ گیا۔ میرے اندر بھرے ہوئے زہر نے ملکہ کی جان لے لی۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ میں وہ منظر برداشت نہ کر سکا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ملکہ کی موت کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میں نے دیکھا سونے کی وہ کان اور ملکہ کی رہائش گاہ آہستہ آہستہ زمین میں دھنسنے لگے۔ اور پھر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا گڑھا سا بن گیا جس میں سے آگ اور دھواں نکلتا رہا اور پھر وہ گڑھا پانی سے بھر گیا اور وہاں ایک تالاب نظر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا...... میری آرزوئیں، خواہشات، امنگیں، گویا اچانک ایک زلزلہ آیا اور میری خوشیوں کا تاج محل آناً فاناً زمین بوس ہو گیا۔ تاریک براعظم سے میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میں نے کاروبار ختم کیا اور ہندوستان لوٹ آیا...... میں برسوں بعد رام گڑھ آ رہا تھا۔ حویلی کی ویرانی دیکھ کر میرا دل اور بھی دکھی ہو گیا...... میں اس حویلی کو آباد کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھ میں اب اتنی تاب نہ تھی۔ میں نے رام گڑھ میں ہی ایک اور حویلی تعمیر کروائی اور پھر وہاں پر کاروبار شروع کر دیا...... سمیتا میری زندگی میں خوشبو کا جھونکا بن کر داخل ہوئی اور میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اس کی شکل بڑی حد تک ملکہ میقودہ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا معصوم چہرہ کسی جھیل کی طرح گہری آنکھیں، پیار تراش کے یاقوتی، ہونٹ۔ اکہرا بدن...... وہ ہر لحاظ سے حسین تھی۔ وہ پوجے جانے کے قابل تھی۔ میں اس کی پرستش کرنے لگا تھا...... ہم جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ دلہن کے لباس میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کی افشاں سے دمکتی مانگ...... خوبصورت پیشانی پر چمکتا نو رتن ٹیکہ...... لرزتے کانپتے ہونٹ...... نازک سی ناک میں پڑی ننھی سی نتھ...... سنہرے آئی شیڈ سے سجی بھاری پپوٹوں اور گھنی پلکوں والی بند آنکھیں...... وہ خطرناک حد تک معصوم اور حسین لگ رہی تھی...... وہ ہماری سہاگ رات تھی...... امنگوں اور آرزوؤں بھری رات۔ سمیتا کسی پرکٹی چڑیا کی طرح میرے آہنی بازوؤں میں پھڑپھڑاتی رہی اور میں دھاندلی کرتا رہا...... صبح کا اجالا میرے دامن میں محرومیوں کا انبار نے آیا۔ سمیتا مر چکی تھی۔ اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ لگتا تھا اس کے جسم میں زہر پھیل گیا ہے۔ اس کی موت کا ذمہ دار میں ہی تھا۔ وہ جیشوا کا اثر تھا۔ اس کے بعد بھی دو عورتیں میری زندگی میں آئیں۔ مگر وہ بھی سہاگ رات کو ہی زندگی سے ناتا توڑ گئیں...... برسوں بیت گئے ہیں...... میں اب دن بدن موت کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ جیشوا کھانے کی مجھے کڑی سزا ملی ہے کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرا کوئی وارث نہیں ہے...... دل آنگن میں دکھوں کا راج ہے۔ پت جھڑ اور اداسیوں کے پتے ہر سو بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے دکھوں کا آسمان کتنا بیکراں ہے۔ خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی ہیں۔ یہ خوشیاں بھی جاڑے کی دھوپ کی طرح ہوتی ہیں۔ کہ ابھی پورا آنگن روشن بھی نہیں ہو پاتا کہ چھاؤں پھیل جاتی ہے...... سہاروں کے تحت جینے والے لوگ بے بس اور ناکارہ ہوتے ہیں...... میری طرف بارش کی منتظر کھیتیاں اکثر سوکھ جاتی ہیں۔



اللہ رکھا

ریاض بٹ

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے

کتوں کی لڑائی سے شروع ہونے والے دشمنی کی روداد

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

کچھ باتوں کو دہرانے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ تفتیشی کہانی (موجودہ) کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے۔

نومبر 2016ء کے شمارے میں شائع شدہ کہانی پس پردہ میں ایک مخبر عورت کا ذکر آیا تھا نور پری عرف نوراں کا۔ ایک رات میں تھانے سے واپس آ کر اپنے کوارٹر میں پہنچا ہی تھا کہ داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔

ابھی میں نے وردی نہیں اتاری تھی اس وقت رات کے نو بج چکے تھے تھانے میں مصروفیات اس قسم کی ہوگئی تھیں اس دن کہ میں معمول سے کافی دیر بعد کوارٹر میں پہنچا تھا۔

لیکن اس وقت سوچنے والی بات یہ تھی کہ دروازے پر کون ہے ابھی میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ دستک ایک بار پھر سنائی دی۔

میں نے تیز تیز قدموں سے صحن عبور کیا اور دروازے پر پہنچ کر ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

”کون ہے بھئی۔“

”میں ہوں تھانیدار صاحب نور پری۔“ میں نے دروازہ کھول دیا نور پری عرف نوراں تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔

میں نے دروازے کو کھلا ہی چھوڑ دیا اور نوراں کو کہا کہ وہ کوارٹر کے کمرے سے دو کرسیاں اٹھالائے۔

چند ہی منٹوں بعد اس کے سامنے بیٹھا اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا صحن میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات یہ چغلی کھارہے تھے کہ وہ کوئی کہانی سنانے آئی ہے۔

”نوراں خیر تو ہے۔“

”خیر کہاں ہے تھانیدار صاحب آج میں اپنا دکھڑا لے کر آئی ہوں۔“

”اپنا دکھڑا۔“ میں نے زیر لب دہرایا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ میرے خاوند کو تو جانتے ہیں نا۔“ اس کے لب ہلے۔

”بالکل جانتا ہوں اللہ رکھے کو اور تمہارے ہی توسط سے جانتا ہوں۔“

”اس کو کیا ہوا؟“

”ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔“

”دیکھو نوراں یہ وقت پہیلیاں بجھوانے کا نہیں ہے صاف صاف اور کم سے کم لفظوں میں اپنا مسئلہ بتاؤ۔“

”مجھے لگتا ہے کہ (میرے منہ میں خاک) اسے کوئی نقصان پہنچنے والا ہے۔ اسے کوئی قتل کرسکتا ہے۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی تمہارے دل میں یہ خیال کیوں آیا۔“

”وجہ آپ کو بتادیتی ہوں آگے آپ جانیں اور آپ کا کام شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ میرے خاوند کو کتے لڑانے کا شوق ہے حالانکہ میں کئی بار اس کو سمجھا چکی ہوں کہ یہ شوق خطرناک ہے اور دوسرے یہ بے زبانوں پر ظلم بھی ہے لیکن میری باتوں کو وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا بلکہ کئی بار غصے میں آ کر یہ کہہ دیتا



تھا کہ اپنے کام سے کام رکھو کہیں یہ نہ ہو کہ اس گھر میں صرف کتے ہی رہ جائیں اور تم نظر نہ آؤ۔ میں نے اس کے ساتھ مغز کھپانا چھوڑ دیا تھا کافی دنوں سے میں نے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

لیکن......

کل اس کے دوست اچھو نے مجھے بتایا۔

''بھابی کل بڑی خطرناک بات ہوگئی تھی۔''

''کیا کون سی بات۔''

''کل کتوں کی لڑائی پر بھائی اللہ رکھا کی چوہدری رمیز کے بیٹے سے لڑائی ہوگئی تھی اس نے پستول نکال لیا تھا اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کراتے تو...... دراصل اس کا کہنا یہ تھا کہ لوگوں کے شور مچانے کی وجہ سے اس کا کتا بھاگا تھا حالانکہ یہ بات نہیں تھی سب نے دیکھا تھا کہ بھائی اللہ رکھا کے کتے نے اس کے کتے کی ایسی درگت بنائی تھی کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہوگیا تھا ورنہ ہو سکتا تھا جان سے جاتا جب منصفوں نے بھائی اللہ رکھا کے کتے کی جیت کا اعلان کیا تو چوہدری رمیز کے بیٹے محسن سے یہ ہار ہضم نہیں ہوئی وہ بھائی اللہ رکھے کے گلے پڑ گیا کہاں وہ منحنی سا کاغذی پہلوان اور کہاں ماشاءاللہ بھائی، بھائی نے اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اس نے پستول نکال لیا اگر ایک بندہ بھتی سے اسے پکڑ نہ لیتا تو......!'' وہ بغیر اسٹاپ بولتی جا رہی تھی۔

''میں اسی لیے تو بے وقوف کو سمجھاتی تھی کہ آگ سے نہ کھیلو لیکن مجھ غریب کی کون سنتا ہے۔'' وہ خاموش ہوگئی۔

میں نے اس کے دل کا بھید جاننے کے لیے کہا تھا۔

''جس بندے نے تمہاری بات نہیں مانی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور چین کی بانسری بجاؤ۔''

''یہ بات نہ کہیں تھانیدار صاحب اس میں تو میری جان ہے اس کی جیداری ہی تو مجھے پسند ہے آپ نے پنجابی

فلمیں نہیں دیکھیں اس میں ہیروئن ہیرو کی جی داری پر ہی تو مرتی ہے جب وہ دس بارہ بندوں کو بھگا دیتا ہے تو......!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ میں دیکھوں گا کہ اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں اس وقت کوئی پنڈورو بکس کھولنا نہیں چاہتا تھا ورنہ مجھے پتا تھا کہ اس کا چرخہ چل پڑا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی اور آخر میں یہی پتا چلے گا کہ ہم تو وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

بہر حال مجھے حالات ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے چوہدریوں کے بگڑے ہوئے شہزادوں سے میرا پالا کئی دفع پڑ چکا تھا پھر جب لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تھا تو چوہدری رمیز کے بیٹے محسن نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا تھا آج تو تم بچ گئے ہو لیکن میں دیکھوں گا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

اس رات مجھے کافی دیر نیند نہ آئی سوچوں کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔

اگلی صبح وہی ہوا جس کا خدشہ تھا یعنی کچھ نہ کچھ ہوگا جب پچھلی رات نوراں کوارٹر میں آئی تھی تو ایک بات اس نے یہ بھی کہی تھی کہ میرے خاوند کو یہ پتا نہ چلے کہ میں یہاں آئی تھی لیکن اب صبح صبح وہ پریشان چہرے کے ساتھ تھانے میں میرے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی۔

''تھانیدار صاحب اللہ رکھا پوری رات گھر نہیں آیا میں نے رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹی ہے۔''

''نوراں ذرا صبر سے کام لو ہو سکتا ہے وہ خود ہی کہیں چلا گیا ہو اور واپس آ جائے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''تھانیدار صاحب میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے آپ میری طرف سے اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ لیں۔''

''ٹھیک ہے تم محرر کے پاس جا کر رپورٹ لکھوا دو اگر تم کسی پر شک لکھوانا چاہا تو......!'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مجھے تو چوہدری رمیز کے بیٹے محسن پر ہی شک ہے ویسے میں ان چوہدری وغیرہ سے نہیں ڈرتی ان کے ایسے ایسے راز میرے سینے میں دفن ہیں کہ......!''

''تم مخبری کرو محسن کی لیکن ایسے طریقے سے کرو کہ اس کو ذرا بھی شک نہ ہو۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا اور تھانیدار صاحب ایک بات میں کہے دیتی ہوں کہ اگر محسن نے میرے خاوند کے ساتھ کچھ کیا ہے تو میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''دیکھو زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے جب تم میرے پاس آ ہی گئی ہو تو بالکل مطمئن ہو کر جاؤ میں قانون کی حفاظت کرنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں پھر نوراں......!'' میں نے چند لمحے توقف کیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے خود کئی دفعہ قانون کی مدد کی ہے۔'' وہ کچھ نہ بولی چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

لیکن میں چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو بلا کر اچھو کو لانے کے لیے بھیج دیا ایک گھنٹے بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھو کو دیکھ کر کسی فٹ بال کا گمان ہوتا تھا عجیب گول مٹول سا بندہ تھا۔

رنگ گندمی اور عمر تیس سال کے اریب قریب ہوگی۔

''اچھو، تمہارا اصل نام کیا ہے۔''

''جناب......اصغر۔''

''تمہارے اتنے اچھے نام کی لوگوں نے مٹی پلید کر دی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس جناب، جب گھر سے ابتدا ہو تو یہی ہوتا ہے وہ بات آپ نے سنی ہوگی نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں (ہونٹوں سے بات نکلنے کی دیر ہوئی ہے ہر سو پھیل جاتی ہے)۔''

''یہ بات تو تم نے بالکل ٹھیک کہی ہے، خیر تم اپنے دوست کے متعلق کچھ بتاؤ۔'' میں نے اسے اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ وہ غائب ہو گیا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھابی نوراں پوچھتی ہوئی ہمارے گھر آئی تھی۔''

''تم نے کیا بتایا؟''

''تھانیدار صاحب! مجھے خود کچھ پتا نہیں، میں اسے کیا بتاتا؟''

''کیا واقعی؟'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

''کیا مطلب تھانیدار صاحب! کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے پتا ہے وہ کہاں گیا ہے؟''

''کیا چوہدری رمیز کا بیٹا محسن اسے غائب نہیں کرسکتا۔''

''چھوٹا چوہدری محسن تو بہت کچھ کرسکتا ہے' وہ اپنے دشمن کو زندہ دفن بھی کرواسکتا ہے۔''

''اتنی اندھیر نگری۔''

''وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھانیدار صاحب! میں تو خود ڈر رہا ہوں کہ اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ میں نے اس کے خلاف باتیں کی ہیں تو......'' اس نے ایک جھرجھری سی لی اور خاموش ہوگیا۔

''اب اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا' ذرا مجھے اس کے خلاف کوئی ثبوت تو ملنے دو۔ تم بالکل نہ گھبراؤ' اسے کچھ پتا نہیں چلے گا' قانون تمہارے ساتھ ہے۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا جونہی کوئی بات معلوم ہو فوراً مجھے بتانا۔''

''آپ بالکل فکر ہی نہ کریں تھانیدار صاحب! آپ نے میرا حوصلہ بڑھادیا ہے' اب ایک بات میں آپ کو اور بتادیتا ہوں' اللہ رکھے اور چھوٹے چوہدری محسن کی دشمنی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''پری بیگم۔''

''پری بیگم......'' میں اچھل پڑا۔

''جی ہاں' ثاقب چغتائی نے اپنی نوکرانی پر جھوٹا الزام لگایا تھا کہ اس نے اس کی ایک تصویر چوری کرلی ہے۔''

قارئین ثاقب چغتائی اور پری بیگم کے متعلق آپ پچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہیں اور یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ میں ثاقب چغتائی کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا اور اس کی وجہ بھی نازش علی کی خودکشی۔ اب اچھو ایک نیا انکشاف کررہا تھا' میں نے اچھو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تو بڑے کام کے بندے ہو بھئی! پری بیگم کی کہانی تو مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ پری بیگم کی وجہ سے اللہ رکھے اور محسن کی دشمنی کی وجہ سے ہے؟''

''تھانیدار صاحب! دراصل اللہ رکھے نے پری بیگم کو اپنی بہن بنایا ہوا ہے' ثاقب چغتائی اور چھوٹا چوہدری ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں یعنی دونوں ہی عورتوں کے شکاری ہیں۔ جب اللہ رکھے کو یہ بات پتا چلی کہ پہلے ثاقب چغتائی نے پری بیگم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن جب اس کی دال نہیں گلی تو اس نے کمال ڈھٹائی سے اس پر تصویر کی چوری کا الزام لگادیا تو اللہ رکھے نے ثاقب چغتائی کی خوب بے عزتی کی' وہ اس وقت تو خاموش رہا لیکن بعد میں اس نے محسن کو اللہ رکھے کے پیچھے لگادیا' کتوں کی لڑائی سے پہلے بھی دو دفعہ ان کی آپس میں لڑائی ہوچکی ہے۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔''

پھر میں نے اسے رخصت کیا تھا اور اے ایس آئی آفاق کو اپنے کمرے میں بلالیا تھا۔ پچھلی کہانی میں اس بات کا ذکر بھی آیا تھا کہ ثاقب چغتائی اپنے گھر سے فرار ہوگیا تھا۔ اب یہ بات بھی بتادیتا ہوں کہ اس نے چھوٹے چوہدری محسن کے پاس پناہ لی تھی۔

اب حالات بہت آگے بڑھ چکے تھے' مجھے یہ خدشہ لگ رہا تھا کہ اب ثاقب چغتائی کا ملنا مشکل ہی تھا لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا' میں نے اے ایس آئی کو کہا کہ وہ تین چار اہلکاروں کو ساتھ لے جاتے اور چھوٹے چوہدری اور ثاقب چغتائی اگر مل جائیں تو ساتھ لے آتے۔

دو گھنٹے بعد وہ خالی ہاتھ واپس آگیا نہ چھوٹا چوہدری ملا تھا اور نہ ثاقب چغتائی۔ البتہ چوہدری رمیز ضرور آگیا تھا' وہ سیدھا میرے پاس آنا چاہتا تھا لیکن اہلکاروں نے اسے آنے نہیں دیا' اے ایس آئی آفاق نے مجھے بتایا۔

''سر! چوہدری رمیز کو میں نے برآمدے میں بٹھادیا ہے اور دو اہلکاروں کو اس کی نگرانی پر مامور کردیا ہے۔ وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہے اور فوری آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اسے ابھی آدھا گھنٹہ اُدھر ہی بٹھائے رکھو' تم سپاہی عظمت کو بھیجو کہ وہ اسپتال جاکر نازش علی کے متعلق پتا کر آئے۔''

''ٹھیک ہے سر!'' آدھے گھنٹے بعد میں نے چوہدری رمیز کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی یوں لگ رہا تھا جیسے

وہ اپنی ہی بوٹیاں نوچ رہا ہو۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ غصے سے بولا۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا' صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میری پہنچ بہت اوپر تک ہے' آپ نے میری حویلی میں پولیس بھیج کر اچھا نہیں کیا۔''

''اوہ' چوہدری صاحب ذرا آرام سے بیٹھ کر بات کریں۔ میں نے تو ایک مجرم ثاقب چغتائی کی تلاش میں اپنے اہلکار بھیجے تھے۔'' چوہدری بیٹھ گیا اور بولا۔

''ثاقب چغتائی مصور؟''

''جی ہاں۔'' میں نے اپنی اسٹک کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''وہ میرے دوست عاقب چغتائی کا بیٹا ہے اور میرے بیٹے کا دوست ہے' بس اتنی سی بات ہے لیکن آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟''

''بات اتنی سی نہیں ہے چوہدری صاحب! مجھے تو آپ کے بیٹے کی بھی تلاش ہے۔'' میں نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''کس لیے جناب! آخر اس نے کون سا جرم کردیا ہے۔'' چوہدری نے تیکھے لہجے میں کہا۔

میں نے تمام واقعات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ سارے واقعات سننے کے بعد چند لمحے اس نے اپنی تھوڑی کھجائی' پھر بولا۔

''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ محسن نے ہی اللہ رکھے کو غائب کیا ہے' باقی یقین جانیں' میں ثاقب کے متعلق صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ میرے مرحوم دوست عاقب کا بیٹا ہونے کے علاوہ...... میرے بیٹے کا بھی دوست ہے اور تصویریں وغیرہ بناتا ہے۔''

''چلیں میں مان لیتا ہوں کہ آپ ہر بات سے بے خبر ہیں لیکن چوہدری صاحب باپوں کو اتنا بے خبر نہیں ہونا چاہیے' اب تو آپ کو اپنے بیٹے اور اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کا اصل چہرہ موجودہ حالات کے آئینہ میں نظر آ گیا ہوگا۔ اس لیے آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ قانون کی مدد کرتے ہوئے دونوں کو تھانے میں حاضر کردیں' مجھے کافی دن پہلے اطلاع مل چکی تھی کہ ثاقب آپ کی حویلی میں چھپا ہوا ہے۔''

''پھر وہ کہاں ہیں؟ مجھے تو محسن یہ بتا کر گیا ہے کہ وہ شکار پر جارہے ہیں۔''

''کہاں؟'' میں نے چوہدری کے چہرہ کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہ میں نے پوچھا اور نہ اس نے بتایا۔'' چوہدری کی اکڑ خوں ہوا ہوگئی تھی' اس کی جگہ اس کی پیشانی پر غوروفکر کی لکیریں ابھر آئی تھیں' لگتا یہی تھا کہ وہ واقعی ''بے خبر'' باپ ہے۔ بہرحال میں نے اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ جونہی اس کا شہزادہ اور ثاقب آئے' انہیں تھانے میں حاضر کردے۔

اس نے کہاں سے حاضر کرنا تھا؟ مجھے پکا یقین ہوگیا تھا کہ دونوں منظر سے غائب ہوچکے ہیں۔ لیکن مجھے اللہ رکھے کی بھی فکر تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھا' یہ خدشہ بھی اپنی جگہ پر موجود تھا کہ کہیں اسے قتل کرکے لاش کو غائب نہ کردیا گیا ہو۔''

اس دوران سپاہی عظمت آچکا تھا' وہ شاید چوہدری کے میرے کمرے سے نکلنے کا منتظر تھا کیونکہ جونہی چوہدری میرے کمرے سے نکلا' وہ کرموب کھڑا ہوگیا۔

''کہو بھئی عظمت! نازش علی کے متعلق کیا خبریں ہیں۔''

''سر! ابھی بھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔''

''عظمت تم اس طرح کرو کہ شہباز کو اسپتال بھیج دو وہ سفید کپڑوں میں اس کی نگرانی حاصل کرے۔'' میں نے میز پر بکھرے کاغذات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! میں ساری بات سمجھ گیا ہوں اور شہباز کو بھی سمجھا کر ابھی اسے اسپتال روانہ کردیتا ہوں۔''

میں نے سر کی جنبش سے اسے جانے کی اجازت دے دی' ضروری کاغذات نمٹاتے نمٹاتے شام ہوگئی' کوارٹر میں جانے سے پہلے میں نے اے ایس آئی آفاق کو بلا کر اس کی یہ ڈیوٹی لگادی کہ وہ مخبروں کو متحرک کردے' ثاقب چغتائی اور محسن کو ہر صورت میں ملنا چاہیے۔

یہ اطلاع مجھے مل چکی تھی کہ دونوں نگرانی کرنے والے مخبر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئے تھے۔ کبھی کبھی ایسے بھی ہوجاتا تھا' مجرم توقع سے زیادہ ہوشیار نکل

آ ئے تھے۔

تین دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی' چوتھے دن اطلاع آئی کہ نازش علی زندگی کی بازی ہار گیا ہے' یہ ایک افسوس ناک اطلاع دی تھی۔

قارئین ابھی میں نازش علی کی کہانی نہیں سناؤں گا آگے اس کا ذکر آئے گا۔ البتہ یہ بتا دیتا ہوں کہ نازش علی کا بڑا بھائی اسپتال میں مجھے ملا تھا' اس نے بتایا تھا کہ نازش علی نے شادی نہیں کی تھی جبکہ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا ان کی ایک بہن شاکرہ فیصل آباد میں بیاہی ہوئی تھی۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے یہ پولیس کیس نہیں بنتا تھا کیونکہ مرنے والا یہ بیان دے کر مرا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے' زہر خود کھایا ہے' حالات جو بھی ہوں۔

یہ اسی دن شام کی بات ہے کہ مجھے سپاہی انور نے آ کر بتایا۔

''سر! ایک عورت آئی ہے وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''بھئی اس سے نام پتا پوچھا ہوتا؟''

''نام اس نے پری بیگم بتایا ہے اور......''

''اسے بھیج دو' باقی باتیں اس سے میں خود پوچھ لوں گا۔'' ابھی تک میں نے اس کا صرف نام سنا تھا بہ نفیس ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو میں نے بغور اس کا جائزہ لیا' وہ تیس بتیس سالہ ایک خوبرو خاتون تھی' خدوخال میں جنس مخالف کے لیے بے پناہ کشش تھی۔

''بی بی! میں تمہیں خود بلانے سے متعلق سوچ رہا تھا' یہ تو اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئیں۔''

''تھانیدار صاحب! حکم کریں۔''

''پہلے تم بتاؤ کہ کون سی ضرورت تمہیں تھانے تک لے آئی ہے۔''

''ثاقب نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا وہ آپ کے علم میں آ چکا ہوگا' میں آج کل جہاں ملازمت کر رہی ہوں وہ بہت خدا ترس انسان ہیں۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' صاحب اور ان کی بیگم ذکیہ بہت اچھی ہیں۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے' میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ ذکیہ بیگم آج کل بہت پریشان ہے وہ تو خودکشی کے متعلق سوچ رہی ہیں لیکن پھر ان کو اپنے بیٹے کا خیال آ جاتا ہے۔''

''اوہ آخر اسے کیا پریشانی ہے؟''

''وہ ایک بلیک میلر کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہیں' پہلے تو وہ کسی نہ کسی طرح اس کے مطالبے پوری کرتی رہی ہیں کیونکہ وہ ان کی دسترس میں تھے لیکن اب اس نے ایک لاکھ کا مطالبہ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ یہ اس کا آخری مطالبہ ہوگا وہ اس کی تصویریں بمع نیگیٹیو واپس کر دے گا۔''

''تمہاری مالکن ذکیہ کا شوہر کرتا کیا ہے؟''

''ان کی شہر میں دو ٹیکسٹائل ملز ہیں' محبوب ٹیکسٹائل ملز کے نام سے۔''

''بڑی اسامی ہے۔'' میں نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔

''رقع یا خط کون لے کر آتا ہے؟''

''ایک لڑکا لے کر آتا ہے یہی کوئی بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔''

''دیکھو بی بی! ہمیں قانونی تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں' بغیر رپورٹ کے ہم کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! فی الحال ذکیہ بی بی کسی قسم کی رپورٹ درج کروانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' میں آپ کو ایک اشارہ دے دیتی ہوں پھر فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔'' اور جب پری بیگم نے مجھے اشارہ دیا تو میں نے اسے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم کسی طرح ذکیہ بیگم کو مجھ سے ملا دو میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں اور اسے چند مشورے دینا چاہتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! میری ایک سہیلی ہے شبانہ' میں اس کے گھر ذکیہ بیگم کو لے جاؤں گی اگر آپ شام کو ٹائم نکالیں تو احسان مند ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے' تم مجھے اپنی سہیلی کی رہائش کے متعلق بتا دو۔''

یہ اسی شام کی بات ہے' میں ذکیہ بیگم کے سامنے بیٹھا اس کا جائزہ لے رہا تھا' وہ دھان پان سی پچیس چھبیس سالہ خاتون تھی' رنگ گورا اور نین نقش تیکھے تھے۔ اس وقت

کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور ہم کمرے میں اکیلے تھے۔

''بی بی! تم نے وہ بات تو سنی ہوگی جوڈر گیا وہ مر گیا۔''

''بات تو سنی ہے تھانیدار صاحب! لیکن اب بات بہت آگے نکل چکی ہے' یہ میری شادی سے پہلے کی غلطی ہے ڈھائی سال پہلے کی لیکن تھانیدار صاحب میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھے بے ہوش کر کے میری ایسی تصویریں بنا لے گا جو ایک دن مجھے اس مقام تک لے آئیں گی کہ خودکشی کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہے گا حالانکہ میری عصمت کا موتی سلامت تھا لیکن تصویروں کو دیکھ کر کون یقین کرے گا۔''

''بی بی میرا ایک مشورہ ہے؟''

''تھانیدار صاحب! میں تو تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہی ہوں آپ حکم کریں۔'' میں نے چند لمحے سوچنے کی اداکاری کی پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات تو مشکل ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے تم اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دو۔''

''تھانیدار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''موجودہ حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے' مجھے امید ہے اس طرح تم موجودہ اذیت سے نجات حاصل کرلوگی۔''

''لیکن تھانیدار صاحب! اس طرح تو میں اپنے شوہر کی نظروں میں گر جاؤں گی جو میں کسی طرح گوارا نہیں کرسکتی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آ گئے ہیں۔

''مجھے تمہاری نوکرانی پری بیگم نے یہ بتایا تھا کہ محبوب صاحب! تم سے بہت بلکہ والہانہ محبت کرتے ہیں اور وہ ایک روشن خیال ہیں' اسی لیے مجھے امید ہے کہ تمہاری ازدواجی زندگی کی عمارت کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اپنی جگہ برقرار رہے گی' ایک بات اور اگر تم نے خودکشی کرلی تو محبوب صاحب کو کتنا دکھ ہوگا۔'' میں نے آخر میں ایک نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ٹھیک ہے' میں روبرو بیٹھ کر تو ان کو سب کچھ نہیں بتا سکتی' البتہ ایک خط میں سب حالات تفصیل سے لکھ کر خط ان کے دفتر کے پتے پر بھیج دوں گی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے ساتھ سپاہی شہباز بھی آیا تھا' ہم سفید کپڑوں میں تھے' اس کے بعد باہر بیٹھے سپاہی کے ساتھ میں تھانے میں واپس آ گیا۔ رات جو چکی تھی' میں آرام کرتے اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ اللہ رکھے کا مسئلہ علیحدہ لٹکا ہوا تھا' اس بار نوراں کی مخبری بھی ایک جگہ رکی ہوئی تھی۔ ثاقب اور محسن کا کوئی کھرا کھوج نہیں مل رہا تھا بلکہ وہ شاید کچھ کر ہی نہیں رہی تھی کیونکہ کئی بار میرے پاس آ کر یہی رونا روئی تھی۔

''آپ میرے خاوند کو ڈھونڈیں ورنہ میرا جینا محال ہے' میرا چھوٹا اظہر بھی رو رو کر بے حال ہو رہا ہے۔''

اب میں اسے تسلی دلاسہ دینے کے علاوہ کیا کرسکتا تھا' اللہ رکھے کے متعلق وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ زندہ بھی تھا یا...... ثاقب اور محسن کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا' کسی کیس کی تفتیش میں ایسا بہت کم ہوا تھا۔

میری معلومات کے مطابق ثاقب کا اب آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور محسن کے متعلق میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اگر وہ جلد ہمارے قبضے میں نہ آیا تو کوئی بڑی واردات کرسکتا ہے۔ ابھی میں سوچوں کے یہی تانے بانے بُن رہا تھا کہ سپاہی شہباز نے میرے عرصے میں داخلہ وکر یہ اطلاع دی۔

''سر! اُدھر مین بازار میں ایک حادثہ ہوگیا ہے۔''

''کیسا حادثہ شہباز؟'' میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! اچھو دوران لڑائی بیلچہ لگنے سے ہلاک ہوگیا ہے۔''

''دوران لڑائی...... کیا مطلب' بات پلے نہیں پڑی ذرا کھل کر بتاؤ...... ایک منٹ یہ اطلاع تم تک کس طرح پہنچی۔''

''سر! عاشق باہر بیٹھا ہوا ہے وہ یہ اطلاع لے کر آیا ہے۔''

''اسے میرے پاس بھیجو ذرا!'' سپاہی نے یہ بھی بتایا تھا کہ عاشق ہارڈ ویئر کی دکان پر ملازم ہے۔

''ٹھیک ہے سر! صرف ایک منٹ میں حاضر کرتا ہوں۔''

پھر واقعی ایک منٹ میں وہ میرے سامنے تھا۔ میں نے

غور سے اس کا جائزہ لیا' اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے' دہشت اور خوفزدگی کے ملے جلے تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہوکر رہ گئے تھے۔

''بھئی! عاشق اتنے خوف زدہ کیوں ہو' خیر تو ہے۔'' میں نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''یس تھانیدار صاحب! کیا بتاؤں' ایسا خوفناک منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا' اچھو کا بھیجہ باہر آ گیا ہے۔''

پھر اس نے جو تفصیل بتائی وہ میں مختصراً بتا دیتا ہوں۔

عاشق اچھو کا پڑوسی ہونے کے ناطے اسے اچھی طرح جانتا تھا' عاشق مین بازار میں اتفاق ہارڈ ویئر کی دکان میں ملازم تھا' بازار سے گزرتے ہوئے کئی بار میری نظر اتفاق ہارڈ ویئر پر پڑی تھی' بہت بڑی دکان تھی۔ پورے شہر میں اس کی ٹکر کی شاید ہی کوئی کان ہو۔ ان کا ہول سیل کا کام تھا' آج حسب معمول دکان میں رش تھا' بقول عاشق کے اچانک دو گاہک آپس میں لڑ پڑے' بات بڑھ گئی نوبت گالی گلوچ سے ہوتی ہوئی ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ایک گاہک نے اچانک بیلچہ اٹھالیا' لوگ بیچ بچاؤ کرانے لگے' ان میں اچھو پیش پیش تھا پھر......''

''عاشق کچھ باتیں غلط طلب ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی باتیں تھانیدار صاحب؟''

''ایک تو یہی بات کہ اچھو اس وقت وہاں یعنی دکان میں کیوں موجود تھا؟''

''جناب وہ ہتھوڑی اور کیلیں لینے آیا تھا۔''

''کیا تم لوگ پرچون بھی چیزیں بیچتے ہو۔''

''اچھو چونکہ میرا پڑوسی ہے' اس لیے۔''

''چلو ٹھیک ہے' تم باہر بیٹھو تھوڑی دیر میں ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

یہ ایک بات کی وضاحت کردوں کہ کچھ لوگ ایسے واقعات میں احتیاط سے کام لیے لیکن مجھے عاشق نے یہ بھی بتایا تھا کہ دکان کے مالک امتیاز نے نہ صرف لوگوں کو روک رکھا تھا بلکہ لاش کے پاس سے لوگوں کو دور کردیا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی انور کو ساتھ لیا اور دکان پر پہنچ گیا۔ دکان کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر تھا لیکن میں نے دیکھا کہ امتیاز کے باقی نوکر داخلی دروازے پر دیوار بنے کھڑے ہیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی کو باہر ہی کھڑا رہنے کا حکم دیا اور خود دکان میں داخل ہوگیا۔ امتیاز نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تھانیدار صاحب! یہ واقع میری ہی دکان میں ہونا تھا۔'' وہ چہرے سے مضطرب اور پریشان لگتا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''امتیاز بھائی! حوصلہ کریں' یہ اتفاقات تو ہوتے رہتے ہیں' ویسے میں اس بات سے خوش ہوں کہ آپ نے تمام احتیاطی تدابیر اپنائی ہیں۔'' وہ بولا

''تھانیدار صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔''

میں نے لاشہ کو دیکھا اس کی حالت لفظوں مین بیان کرنا مشکل تھی' مختصراً یہ کہ لاش کا بھیجہ باہر نکل آیا تھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے حالات معلوم کیے معلوم ہوئے جو عاشق بتا چکا تھا۔

میں نے لاش ہیڈ کانسٹیبل کی میت میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی اور لڑائی کرنے والے دونوں بندوں کو سپاہی انور کی نگرانی میں دیا' باقی بندوں کے ایڈریس نو کروانے کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی اور خود مالک امتیاز کو لے کر کاؤنٹر کے پیچھے آ گیا' وہاں تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں' امتیاز ٹوٹا پھوٹا لگتا تھا۔

''دیکھیں امتیاز صاحب! اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں' آپ پریشان نہ ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! یہ سب میری دکان میں پیش آیا ہے' اس لیے میری پریشانی اور فکر فطری بات ہے۔''

''خیر جو کچھ ہو چکا ہے وہ واپس نہیں آ سکتا' آپ ہمت سے کام لیں اور اگر کوئی بات آپ کی دل مین ہی تو بتادیں۔''

''تھانیدار صاحب! بات تو کوئی نہیں' مجھے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے میں تو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوتا ہوں۔''

''دراصل ہمیں کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے' اس لیے آپ کل کسی وقت آ کر اپنا بیان لکھوا دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب! آپ بالکل بے فکر ہو جائیں' میں کل صبح ان شاء اللہ تھانے میں جا کر بیان محرر کے پاس لکھوادوں گا۔'' اس کے بعد ہم نے لڑائی کرنے والے دونوں بندوں کو ساتھ لیا تھا اور تھانے میں واپس

آ گئے تھے۔

یہاں اے ایس آئی آفاق میرے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔

''سر سنا ہے اچھو کے ساتھ حادثہ ہو گیا ہے یعنی وہ لڑائی کرنے والے دو بندوں کو چھڑاتے ہوئے سر میں بیلچہ لگنے سے ہلاک ہو گیا ہے۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے آفاق! اچھا ہوا تم آ گئے' ابھی دونوں سے انٹرویو لینا ہے لیکن...... میں نے چند لمحے توقف کیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثاقب اور محسن کا کوئی سراغ ملا؟''

''سر! ابھی تک تو کوئی سراغ' کوئی اشارہ نہیں ملا۔ وہ تو یوں غائب ہو گئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے تھے' ویسے میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔''

''آئیڈیا یہی ہے نہ کہ بڑے چوہدری رمیز کو تھانے میں بٹھا لیں اور ادھر اُدھر مشہور کروا دیں کہ جب تک محسن تھانے میں نہیں آئے گا اس کے باپ کو نہیں چھوڑا جائے گا۔''

''بالکل سر! میرے خیال میں اس حربے کو بھی آزما لیتے ہیں' کئی بار اس طرح ہم کامیاب ہوئے تھے۔''

''لیکن محسن کے معاملے میں یہ نہیں چلے گا' وہ خود غرض ہے۔ چوہدری رمیز کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ محسن اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔'' میں نے آفس بوائے کے لیے گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔ دراصل مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی' کچھ دیر کے بعد ہم چائے پینے کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔

''ویسے ہو سکتا ہے بات وہی ہو' بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔'' اے ایس آئی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ ممکن ہے۔'' میرا کپ خالی ہو چکا تھا' میں نے اسے ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ہم نے دونوں بندوں کو بلا لیا۔

ایک کی عمر تیس سال اور دوسرے کی پچیس کے اریب قریب ہو گئی' دونوں پریشان تھے شاید سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔

''تمہیں لڑائی کرنے کا بہت شوق ہے۔'' اے ایس آئی نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بس جناب' غلطی ہو گئی۔'' دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''اتنی بڑی غلطی' تمہاری اس غلطی نے ایک انسان کی جان لے لی ہے۔'' میں نے خواہ مخواہ اپنی اسٹک کو اٹھا کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے خوفزدہ نظروں سے میری اسٹک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب میں نے جان بوجھ کر بندے کو نہیں مارا' میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔'' جس کے ہاتھ سے اچھو کو بیلچہ لگا تھا' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''چلو' میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری اچھو کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن ......'' میں نے چند لمحوں کے لیے اس کی خوفزدہ آنکھوں میں دیکھا پھر کٹیلے لہجے میں کہا۔

''تم دونوں کی آپس میں کیا دشمنی ہے؟''

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتانا مناسب ہوگا کہ ان میں ایک کا نام صفدر جبکہ دوسرے کا عمران معلوم ہوا تھا' دونوں چپ ہو گئے۔

''سر! لگتا ہے ہمیں انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑیں گی۔'' اے ایس آئی نے انہیں دبکا مارتے ہوئے کہا۔

''وہ......جی......بس ہمیں غصہ آ گیا تھا۔''

''صفدر! تمہیں زیادہ غصہ آ گیا تھا اور تم نے بیلچہ اٹھا لیا تھا اور وہ بھی بغیر کسی ٹھوس وجہ کے' کیوں ہے نہ یہی بات؟'' میں نے حضور کو طنزیہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''بغیر وجہ کے؟'' اس نے زیر لب دہرایا پھر بولا۔

''واقعی وجہ تو معمولی ہی تھی' دراصل عمران نے میرے پاؤں کے اوپر پاؤں رکھ دیا تھا' میرا یہ پاؤں زخمی ہے۔'' مجھے درد ہوا تو میرے منہ سے گالی نکل گئی بس اسی سے بات بڑھ گئی۔

''ہاں جی' عمران صاحب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔'' میں نے عمران کی طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

''جناب! یہی بات تھی۔'' اس نے مسمی صورت بنائے

ہوئے کہا۔

''دیکھو! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو' سچی بات بتادو تو فائدے میں رہو گے۔ تم ہمیں بے وقوف نہیں بناسکتے۔'' اے ایس آئی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جناب! آپ ہماری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟''

''تمہارا لہجہ اس بات کی چغلی کھارہا ہے کہ تم لوگ چکر دینے کی ناکام کوشش کررہے ہو۔'' دونوں خاموش رہے۔

''سر! یہ بات کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔'' اے ایس آئی نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''میں سمجھ گیا کہ اب دونوں کی خیر نہیں۔'' اے ایس آئی باہر نکل گیا جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عارف تھا۔

''ان کو باہر لان میں لے جاؤ۔'' اے ایس آئی نے ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ بھی آئیں' میں ان کو بھوت بناؤں گا۔''

''ٹھیک ہے' آج دیکھتے ہیں کہ بھوت بن کر انسان کیسا لگتا ہے۔'' ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی دونوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے' تھوڑی دیر بعد عجیب منظر میرے سامنے تھا۔

اے ایس آئی نے دونوں کو ایک ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''دونوں آپس میں سر ٹکراؤ' ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم لڑائی میں کتنے ماہر ہو؟''

''او جناب! ہم مر جائیں گے۔'' دونوں یک زبان ہوکر منمنائے لیکن انہیں سر تو ٹکرانے ہی پڑے تھے۔ دو تین ٹکروں کے بعد ہی ان کے چہرے خون سے بھر گئے اور وہ واقعی بھوت نظر آنے لگے' وہ دونوں بیٹھ گئے اور اس طرح ہانپنے لگے' جیسے انہیں کوئی پہاڑ سر کرنا پڑا ہو۔

''جناب! ہمیں پانی پلادیں۔'' صفدر نے مریل سی آواز میں کہا۔

''پانی بھی ملے گا اور چائے بھی لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہمیں الو بنانے کی بجائے سچ اگل دو ورنہ تمہارا اس سے بھی برا حشر ہوگا۔'' اے ایس آئی نے انہیں کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ہم تو خود الو بن گئے ہیں بلکہ الو کے پٹھے بن گئے ہیں' ساجن نے ہمیں مروادیا۔'' عمران نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''ابھی تم مرے نہیں ہو بلکہ زندہ ہو' چلو شروع ہوجاؤ۔'' میں نے اس بار لہجے کو نرم کرلیا۔

''یہاں میں آپ کو ایک بات بتادوں کہ ہمیں ان سے دو چار سوالات کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اندر خانے کہانی کچھ وار ہے' اس لیے ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔'' صفدر نے ساری بات بتادی اور رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا ویسے وہ دونوں کسی رعایت یا رحم کرنے کے حق دار نہیں تھے۔

''ان کو فی الحال حوالات میں بند کردو۔'' میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عارف سے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان نے صفدر کا باز پکڑتے ہوئے کہا پھر سپاہی عارف نے عمران کا بازو پکڑا تھا اور دونوں کو دھکیلتے ہوئے لے گئے تھے۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد میں اور اے ایس آئی آفاق دفتر میں آگئے۔

''سر! یہ ساجن نیا نام سامنے آیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بیٹھتے ہی کہا۔

''دیکھو آفاق! میرا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ ساجن نامی بندہ کوئی بڑا اجرائم پیشہ ہے اور یہ ہمیں جرائم کی دنیا میں ہی ملے گا' تم نے اس کا حلیہ تو ذہن نشین کرلیا ہے نہ۔''

''بالکل سر! ویسے مجھے یہ شک بھی ہے کہ صفدر اور عمران بھی جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں ساجن کا پتا معلوم ہے۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔

''لیکن میں نے جان بوجھ کر پتا معلوم کرنے پر زور نہیں دیا۔''

''سر! میں سمجھ گیا پہلے یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی' ساجن جیسے لوگ باخبر رہتے ہیں ان کی جاسوسی یا مخبری کا نظام ہوتا ہے۔ ان کو پتا چل چکا ہوگا کہ ان کا پلان

فیل ہو چکا ہے اور دونوں بندے ہماری پکڑ میں گئے ہیں' انہوں نے ٹھکانہ بدل لیا ہوگا۔''

''بالکل یہی بات ہوئی ہوگی لیکن قانون اتنا بھی بے بس نہیں ہے کہ ساجن جیسے بندے اسے انگلیوں پر نچا سکیں' ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ تم عنایت علی سے رابطہ کرو' ایسے بندوں میں وہ گھلا ملا رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں آج ہی اس سے رابطہ کرتا ہوں' ایک دو کیسوں میں اس نے ہمارے لیے مخبری بھی کی تھی۔''

اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں دفتر کے دوسرے جھمیلوں میں الجھ گیا اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

دن دن اسی طرح گزر گیا' اگلے دن حسب توقع ٹیکسٹائل ملز کا مالک محبوب مجھ سے ملنے آ گیا وہ ایک خوب رو اور ہینڈسم بندہ تھا۔

جب وہ میرے کہنے پر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا' وہاں مجھے شرمندگی اور بے بسی کے تاثرات نظر آئے۔

''محبوب صاحب' کیا حال چال ہیں؟'' میں نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

''بس جناب! اللہ باری تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اس نے نظریں نیچی کرلیں' وجہ میں سمجھ رہا تھا لیکن میں تو اسے اخلاق اور قانون مدد دینا چاہتا تھا اس لیے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں محبوب صاحب' انسان کو برائی کو ختم کرنے کے لیے حوصلے اور برداشت سے کام لینا چاہیے ورنہ یہ بلیک میلر شیر ہو جاتے ہیں۔''

''تھانیدار صاحب! میں اس لیے پ کے پاس آ ی ہوں میں نے ایک لاکھ روپے کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ ہماری حتی الامکان کوشش یہ ہوگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی مجرم بھی پکڑے جائیں اور آپ کی رقم بھی بچ جائے۔''

''تھانیدار صاحب! مجھے ایک لاکھ کی کوئی پروا نہیں' میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ مجرم پکڑے جائیں اور تصویریں بمعہ نیگیٹو ہمیں مل جائیں۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا' ویسے تو آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کے حق حلال سے پیسے بلیک میلر کے پیٹ میں جائیں۔'' وہ خاموش ہو گیا' اس دوران چائے آ گئی تھی اور باتوں کے درمیان ہم نے اس سے دو دور ہاتھ لیے تھے۔

وہ چلا گیا' اس کے جانے کے بعد اے ایس آئی آفاق عنایت علی کو لے کر آ گیا۔ عنایت علی ایک چلتا پرزہ تھا' رنگ گندمی' آنکھیں چھوٹی اور ماتھا تھوڑا چوڑا تھا۔

''عنایت علی! کیا حال چال ہیں؟'' میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سرکار! ہم تو آپ کے قدموں کی خاک ہیں' آپ کے سامنے کیسے بیٹھ سکتے ہیں' مجھے پتا تھا کہ اس نے چاپلوسی میں ڈپلومہ کیا ہوا ہے۔

''اوہ کھوتے کے کھر' بیٹھ جاؤ ورنہ یہ نہ ہو تھانیدار صاحب تمہیں ایسے بٹھائیں کہ کبھی نہ اٹھ سکو۔'' اے ایس آئی نے اسے دبکا مارتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے بیٹھ گیا جیسے قریب ہی کہیں دھماکہ ہوا ہو۔

''تم صرف باتیں ہی کرتے ہو یا کوئی کام بھی کرتے ہو؟'' میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔

''جناب! میں اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ سے بات کرسکوں۔''

''کیسی بات' عنایت علی۔''

''سرکار! ساجن جرائم کی دنیا کا بہت بڑا استاد ہے' اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ مجھے تو چٹکیوں میں مسل دے گا ویسے اتنا میں بتا سکتا ہوں کہ اس ک اصل نام سجاد عرف شبرائی ہے کیونکہ اس کی آنکھیں شراب کی رنگت جیسی ہیں اور اس نے کئی مجرموں کو پناہ دی ہوئی ہے اور آپ کے لیے پریشانی کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا ڈیرہ آپ کی نگری سے باہر ہے۔'' میں اس کی بات سمجھ گیا' اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا ڈیرہ ہمارے تھانے کی حدود سے باہر تھا۔

''تم عنایت علی اس بات کو چھوڑو کہ اس کا ڈیرہ کہاں ہے؟ بس مجھے اس کے ڈیرے کا پتا بتا دو۔'' اس نے پتا

بتا دیا میں نے اے ایس آئی سے کہا۔

''بھئی کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اب تم صفدر سے ساجن کے ڈیرہ کا پتا معلوم کرو'' اس نے آ کر وہی پتا بتایا جو عنایت علی نے بتایا تھا۔

''عنایت علی! تم جکرا اپنے ذرائع سے پتا کرو کہ کیا آج کل بھی ساجن اس ڈیرے میں رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے سرکار! لیکن میری حفاظت؟''

''تمہاری حفاظت کا بندوبست ہو جائے گا۔'' لیکن پھر وہ غائب ہو گیا' دو دن' تین دن اور پھر چار دن اس کی شکل نظر نہ آئی۔ لگتا یہ تھا کہ مجرم بہت باخبر اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ دلیر بھی تھے۔

ہم نے عنایت علی سے یہ کہا تھا کہ وہ آج گھر جائے اور سوچے کہ اس نے کام کیسے کرنا ہے' کل سے سادہ کپڑوں میں دو اہلکاروں اس کے ساتھ ہوں گے۔ قارئین یہاں اس بات کی وضاحت کروں کہ ہمیں خفیہ رکھنا پڑتا ہے اور یہ اہلکار ایسے ہوتے ہیں جنہیں پولیس اہلکاروں کی حیثیت سے کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔

مجھے یہ شک بھی پڑ گیا تھا کہ کہیں عنایت علی مجرموں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ڈر کے مارے خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہو۔

اس رات میری طبیعت ذرا بوجھل بوجھل تھی' ابھی میں آرام کرنے کے لیے چار پائی پر لیٹا ہی تھا کہ داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چار پائی سے اتر کر گھر میں پہننے والے چپل پاؤں میں پہنے حفظ ماتقدم کے طور پر سروس ریوالور ہاتھ میں لیا اور داخلی دروازے کے پاس جا کر اونچی واز میں کہا۔

''کون ہے بھئی؟''

''تھانیدار صاحب! دروازہ کھولیں' میں اللہ رکھا ہوں۔''

''اللہ رکھا......'' میں اچھل پڑا اور دروازہ کھول دیا۔

میں نے کوارٹر کے برآمدے میں لگے بلب کی روشنی میں دیکھا کہ اللہ رکھے نے کالی چادر سے منہ سر لپٹا ہوا ہے۔

میں اسے اندر کمرے میں لے گیا اور چار پائی پر بیٹھنے کے لیے کہا اس نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور سامنے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر غٹا غٹ پی گیا اور ایسے ہانپنے لگا جیسے اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی پہاڑ سر کرنا پڑا ہو۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کی حالت سنبھلی اور وہ بولا۔

''تھانیدار صاحب! حیران نہ ہوں' میں اللہ رکھا ہی ہوں۔ اس کا بھوت نہیں ہوں میں صرف ثاقب چغتائی اور محسن کا کھوج لگانے کے لیے غائب ہوا تھا۔''

''میں تمہیں بھوت تو نہیں سمجھ رہا' البتہ اپنے سامنے زندہ دیکھ کر حیران ضرور ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! باقی باتیں بعد میں ہوں گی اس وقت آپ مجرموں کو پکڑنے کی تیاری کریں' ساجن کا موجودہ ڈیرہ میں نے ڈھونڈ لیا ہے مجھے امید ہے وہاں آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ اگر وہ عنایت علی کو پکڑوانے کی غلطی نہ کرتا تو شاید ابھی میں کامیاب نہ ہوتا۔''

''تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے' تم گھر جاؤ تمہاری بیوی پریشان ہے۔'' میں نے اللہ رکھے سے کہا۔

''نہیں تھانیدار صاحب! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ جاؤں گا' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے تم قبرستان کے پاس انتظار کرو' میں تھانے سے نفری لے کر آتا ہوں لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ عنایت علی تو چار دن سے غائب ہے اور......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تھانیدار صاحب! یہ تو مجھے پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں غائب تھا البتہ اسے ساجن کے بندوں نے آج ہی اسلحہ کے زور پر ڈیرے پر پہنچایا ہے۔''

میں نے تھانے میں جا کر آٹھ پھر تیلے اور جنگ کے مہر اہلکاروں کو تیار کیا اور ہم ڈیرے پر پہنچ گئے میرے پاس سروس ریوالور اور ان کے پاس اسلحہ موجود تھا۔

یہاں یہ بات بتا دوں کہ ساجن کا موجودہ ڈیرہ ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہیڈ کانسٹیبل دیوار پھاند کر اندر کود گیا اور اس نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ جس مقابلے کی ہمیں توقع تھی وہ نہیں ہوا۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے' رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی' سب بے خبر سو رہے تھے کہ ہم نے

انہیں جالیا تھا۔

پھر ظاہر ہے ہم انہیں لے کر تھانے میں آ گئے تھے۔ وہ کہیں ہیں نہ کہ اگر نیت صاف ہو تو اللہ تعالیٰ خود ہی مدد فرما دیتے ہیں۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ ہم اتنی آسانی سے اتنے بڑے مجرموں کو چھاپ لیں گے۔

مجرموں میں ساجن کے علاوہ ثاقب چغتائی' چھوٹا چوہدری محسن' چار ساجن کے گرگے اور دو مفرور قاتل تھے۔ ایک کمرے سے عنایت علی بھی رسیوں میں جکڑا برآمد ہو گیا تھا۔ جتنی آسانی سے سب ہمارے ہاتھ آئے تھے اتنی آسانی سے انہوں نے اپنے جرم نہیں قبولے تھے۔ ہمیں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔

قارئین اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ انکشافات کا پنڈورہ بکس کھولا جائے' ساجن کا اصل نام اور عرفیت آپ کے علم میں آ چکی ہے۔ ساجن نام اسے جرائم پیشہ اور مفرور مجرموں نے دیا تھا کیونکہ وہ واقعی ان کا ساجن تھا اور انہیں پناہ دیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت چالاک اور دلیر سمجھتا تھا اور جب کوئی مجرم کپڑوں سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پولیس کو چیلنج کرتا ہے تو...... اس نے بھی عنایت علی کو پکڑوا کر پولیس کو چیلنج کیا تھا۔ اس کے جرائم اور حماقتوں کی ایک طویل فہرست ہے بہر حال وہ پکڑا گیا تھا اور اسے اپنے جرائم کی سزا بھگتنی تھی۔

اب میں آپ کو ثاقب چغتائی اور چھوٹے چوہدری کے جرائم کی کہانی سنا دیتا ہوں۔ بات نازش علی سے شروع کرتا ہوں' نازش علی کو بچپن سے تصویریں بنانے کا شوق تھا وہ آڑھی ترچھی لکیریں اور شکلیں بناتا رہتا تھا پھر اسے ایک استاد مل گیا' گوہر رحمانی جس نے نازش علی کا شوق لگن اور ٹیلنٹ دیکھتے ہوئے اسے مصور بنا دیا لیکن نازش علی کے پاس وسائل نہیں تھے۔

ایک دن اس کی ملاقات ثاقب چغتائی سے ہو گئی اور جب ثاقب چغتائی کو اس بات کا علم ہوا کہ نازش علی تصویریں بناتا ہے تو اس کے ہاتھ گویا گوہر فراد آ گیا جیسا کہ یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ ثاقب چغتائی عورتوں کا رسیا تھا اور چھوٹا چوہدری اس کا ہانڈی والا (شراکت دار) تھا۔ نازش علی بنائے گا' نام ثابت چغتائی کا ہو گا اور نازش علی کو ٹھیک ٹھاک معاوضہ دیا جائے گا۔

نازش علی غربت کی وجہ سے راضی ہو گیا یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ ثاقب چغتائی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ مردوں میں ایسا حسن کم ہی ہوتا ہے' عورتیں اس پر مرتی ہیں اور وہ جعلی مصور بننے کے بعد دو آتشہ ہو گیا تھا اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو شاید گاڑی چلتی رہتی لیکن چھوٹے چوہدری کے شیطانی ذہن نے ثاقب چغتائی کو مشورہ دیا کہ عورتوں کی کیمرے سے تصویریں بنا کر انہیں نہ صرف بلیک میل کیا جائے بلکہ اپنی مٹھی میں بھی رکھا جائے عرصہ تین چار سال سے وہ یہ دھندا کر رہے تھے۔

پھر وہ دن آیا جب ان سے پری بیگم والی حماقت ہو گئی لیکن اس سلسلے میں ان کو منہ کی کھانی پڑی اور ثاقب چغتائی نہ صرف پولیس کی نظروں میں آ گیا بلکہ اللہ رکھا کو اپنا دشمن بھی بنا لیا پھر کتوں کی لڑائی پر محسن کی لڑائی اللہ رکھے سے ہو گئی اور نوراں میرے پاس آ گئی' اللہ رکھے کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ ثاقب چغتائی اور محسن کو پکڑوانے کے لیے خود ہی غائب ہو گیا تھا منظر سے۔ اب تو پولیس پوری تندہی سے انہیں تلاش کرے گی' نازش علی کی وجہ سے ثاقب چغتائی پہلے ہی چوہدری رمیز کی حویلی میں چھپنے پر مجبور ہو گیا تھا ویسے ثاقب چغتائی کو یقین تھا کہ نازش علی یا تو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دے گا' یا پھر اسے صرف اتنی ہی مہلت ملے گی کہ وہ یہ بیان دے سکے کہ اس نے خود زہر کھایا ہے لیکن جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے' ساجن چھوٹے چوہدری محسن کا دوست بنا ہوا تھا اور اسے تحفظ دیتا رہتا تھا۔ ثاقب چغتائی اور محسن نے جا کر وہاں پناہ لے لی کیونکہ اللہ رکھے کی وجہ سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ پولیس اب سیدھی حویلی کی طرف آئے گی۔ نازش علی نے خودکشی کیوں کی تھی؟ اب اس طرف آتا ہوں' نازش علی اچھا خاصہ ڈرائیور بھی تھا۔ ایک دن وہ ثاقب چغتائی کی کار ڈرائیور کر رہا تھا۔ ثاقب بھی کار میں موجود تھا کہ نازش علی سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ایک عورت کار کے نیچے آ کر کچلی گئی۔ سڑک اس وقت سنسان تھی' ثاقب چغتائی نے نازش علی سے کہا۔

''یہ نہ دیکھو کہ عورت مر گئی ہے یا زندہ ہے' جلدی سے گاڑی بھگا لے جاؤ۔'' نازش علی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے' اس نے فوراً اس کے کہنے پر عمل کر دیا۔

نازش علی ایک لڑکی سنبل سے محبت کرتا تھا وہ کبھی کبھی اس سے ملنے آتی رہتی تھی' نازش علی کے زہر کھانے سے چند دن پہلے وہ نازش علی سے رہتی تھی۔ نازش علی کے زہر کھانے سے چند دن پہلے وہ نازش علی سے ملنے آئی تو ثاقب چغتائی کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس کی رال ٹپکنے لگی' ویسے نازش علی کی محبت کا کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔ سنبل کے جانے کے بعد ثاقب چغتائی نے نازش علی کو اپنے پاس بٹھالیا اور بولا۔

''نازش علی اگر تم اس لڑکی کو ہمارے بستر کی زینت بنادو تو میں اور محسن تمہاری جھولی نوٹوں سے بھر دیں گے۔'' نازش علی کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔

''ثاقب صاحب! سنبل میری محبت ہے' میں آج تک آپ کے اشاروں پر ناچتا رہا ہوں لیکن آپ حد سے بڑھ رہے ہیں' آئندہ آپ ایسی بات نہ کریں تو بہتر ہے۔''

''اچھا تو تم کیا کرلو گے؟ دیکھو جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ہمیں انگلی ٹیڑھی ہی کرنا بھی آتا ہے۔ جب تم نے ایک عورت کو کچل دیا تھا اس وقت کی تصویر میرے پاس محفوظ ہے اگر تم نے ہمارے کہنے پر عمل نہ کیا تو آگے خود سمجھ دار ہو؟'' آگے سنانے سے پہلے یہ وضاحت کردوں کہ ثاقب چغتائی نے جھوٹ بولا تھا' میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا جب ایکسیڈنٹ ہوا تھا بہرحال نازش علی اس وقت خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ نازش علی نے اپنے بیان میں مجھے بتایا تھا کہ ثاقب اور محسن ایسی مکڑیاں تھیں جنہوں نے پوری طرح اسے اپنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا لیکن وہ ثاقب چغتائی کا یہ مطالبہ تو کسی صورت نہیں مان سکتا تھا بقول اس کے وہ بند گلی میں آ گیا تھا اور اسے خودکشی کی علاوہ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا تھا۔

اب بات ہو جائے اچھو کی' اللہ رکھے کو وہ واقعی مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن وہ غائب ہو گیا تھا۔ جب وہ ساجن کے پاس چلے گئے تو ان کی ڈوریاں گویا اس کے ہاتھ میں آ گئیں اس نے اپنے شیطانی ذہن میں یہ پلان ہی کر دیا جائے ورنہ ہمارے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔ ان کو بہت دیر بعد خیال آیا تھا ورنہ ہمارے لیے مصیبت بن سکتا ہے ان کو بہت دیر خیال آیا تھا اچھو کو جو کچھ معلوم تھا وہ مجھے بتا چکا تھا' انہوں نے اپنی طرف سے ایسا پلان بتایا کہ یہ قتل نہ لگے بلکہ حادثاتی موت لگے۔ اسی سلسلے میں صفدر اور عمران جو ساجن کے کارندے تھے۔ چھو کے پیچھے لگے ہوئے تھے آخر ہارڈ ویئر کی دکان میں انہیں اپنے پلان پر عمل کرنے کا موقع مل گیا لیکن وہ شاید یہ بھول گئے تھے کہ پولیس کو سچ اگلوانا آتا ہے۔

ساجن نے ہی انہیں مشورہ دیا تھا کہ ذکیہ کو ایک ہی دفع ذبح کردو یعنی ایک لاکھ کا مطالبہ کردو' جی ہاں ثاقب چغتائی ہی ذکیہ کو بلیک میل کررہا تھا لیکن ایک لاکھ وصول کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ مجرموں کے گرفتار ہونی کے بعد دونوں میاں بیوی (محبوب اور ذکیہ) میرے پاس آئے تھے اور میرا شکریہ ادا کیا تھا اور ڈھیروں دعائیں دی تھی' ہم نے بلیک میلنگ کا سارا سامان اور تصویریں قبضے میں لے لی تھیں۔ یہ کہانی نوراں کے میرے پاس کوارٹر میں آنے کی وجہ سے شروع ہوئی تھی اور انجام اس کے خاوند اللہ رکھے نے کروایا تھا۔ نوراں ہماری مخبر بھی تھی اس لیے اس کے بے حد اصرار پر میں اور اے ایس آئی آفاق اک شام اس کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے' اس نے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب قہوے کا دور چلا تو میں نے نوراں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تو اللہ رکھے کی جیداری پر مہر ثبت ہوگئی ہے' اس نے مجرموں کو گرفتار کروانے میں بڑی جیداری کا ثبوت دیا ہے اور ہمارے ساتھ بھی گیا ہے۔''

''تھانیدار صاحب! مجرموں نے تو اسے مارنے کا پکا ارادہ کیا ہوا تھا لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے پھر اس کا تو نام ہی اللہ رکھا ہے اور ساتھ ہی اس نے پیار بھری نظروں سے اللہ رکھے کی طرف دیکھا' اس کیس کے بعد اعلیٰ افسران کی سفارش پر مجھے انعام واکرام سے نوازا گیا تھا لیکن میں نے اصرار کرتے انعام اللہ رکھے اور نوراں کو دے دیا تھا کیونکہ میرے خیال میں وہ وہی اس کے حق دار تھے۔



سرفروش

تفسیر عباس بابر

حصہ دوم

کالی بھیڑوں اور خونی بھیڑیوں کا ایکا ہو جائے تو امن مفقود ہو جاتا ہے فرقہ واریت اور گروہ بندی عام ہو جاتی ہے گھر کے چراغ ہی غداری پر تل جائیں تو سب کچھ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تفسیر عباس بابر کا یہ ناول ''سرفروش'' ایسے ہی حالات پر مبنی ہے وطن عزیز میں اسلام اور امن کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، مکروہ و قبیح سازشیں آئے دن بم بلاسٹ خودکش حملے، ہر شہری احساس عدم تحفظ کا شکار ہے ایسے غیر یقینی حالات میں بے یقینی اور خوف کا احسا فزوں تر ہونا جز و لازم ہے، مسجدیں، امام بارگاہیں، علمی مراکز، دشمن کی نظر کی زد میں ہیں حتیٰ کہ اب دینی مدارس بھی محفوظ نہیں رہے ایک خوف ہے جو اذہان و قبول کے نہاں خانوں میں رچ بس گیا ہے ہمارے دینی مراکز کو بدنام اور سادہ لوح عام کو گمراہ و خوفزدہ کرنے میں غیر ملکی طاقتیں کس حد تک ملوث ہیں زیر نظر ناول کا بنیادی خیال یہی ہے ذہن منتشر اور دل خوفزدہ ہیں آئے دن کوئی ایسا سانحہ گزر جاتا ہے کہ روح تک لرز جاتی ہے حادثہ ایک دم نہیں ہوتا اس کے محرکات و وجوہات ہوتی ہیں کئی دن اس کی پرورش ہوتی ہے مقام فکر یہ ہے کہ ان حادثات کی پرورش میں ہمارے اپنے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں یہ ناول بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے مختصر کہانیوں کے بعد نئے افق میں مصنف کا یہ پہلا ویل ناول بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے۔ مختصر کہانیوں کے بعد نئے افق میں مصنف کا یہ پہلا طویل ناول ہے اس سے پہلے ان کا ایک ناول ''سنگریزے'' کتابی شکل میں چھپ چکا ہے، کوئی بھی قلمکار ہو وہ قلم کی دھار سے دشمن کا سر قلم کر سکتا ہے یہ ہر لکھنے والے پر فرض ہے کہ مٹی سے وفا کے تقاضوں کو ملحوظ نگاہ رکھے۔





''عنایت تو ہوسکتی ہے، لیکن میں یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ صرف کمال پر ہی گزارا کر کے چلے جائیں۔''

''کہاں ہیں آپ؟'' اس نے بکھری ہوئی سانسوں میں کہا۔ ''کاش آپ پر لگا کر میرے پاس آجائیں۔ میں آپ کو اپنے جسم کی جاگیر میں آزاد چھوڑ دوں۔ اپنے لب کا تل آپ کے دل پہ رکھ دوں۔ کہاں ہیں آپ، آ بھی جائیں، آ بھی جائیں ناں۔۔۔''

''محسوس کرو تو تمہارے دل اور تل کے پاس ہوں میں''

وہ سرشار لہجے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل ڈالنے لگا۔

وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ نیم جاں ہو رہی تھی۔ اس کے بستر کی شکنوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اور پھر یہ گفتگو روز کا معمول بن گئی۔ وہ شب بھر جاگتے اور پیار بھری باتیں کرتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔

''گل۔۔ اس وقت تمہارے گھر کے ساتھ والی دکان پر اپنی گاڑی میں موجود ہوں'' ایک شب اس نے کال پر کہا۔

''تو آجاؤ ناں، میرے امی ابو سو چکے ہیں۔ دل کا دروازہ تو کھول دیا ہے۔ میں گھر کا دروازہ بھی کھول رہی ہوں۔''

وہ ایک جھٹکے سے چارپائی چھوڑتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔

وہ اس کے گھر کے سامنے گاڑی میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر فوزیہ براجمان تھی۔ اس نے انگوٹھا دکھا کر ویلڈن کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد وہ گاڑی سے اتر گیا۔ فوزیہ کار کو بیک کرتے ہوئے واپس جا رہی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ گل سے ملنے کے بعد وہ اسے کال کرے گا۔ بے تاب امنگوں سے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ وہ ماں باپ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس نے آہستگی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی، اور آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا۔ وہ کاشف تھا۔ ارشی کا بھائی، بلیک جینز اور بلیو شرٹ کے اوپر اس نے بلیک جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ بے صبری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے آئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی سے جسم ٹھٹھر رہے تھے۔ لیکن اس کا بدن انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔

اس نے اپنا سیل فون ایک طرف پھینکا، اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھا کر اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

اس کی سرخ آنکھیں پلکوں کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ مخمور پلکوں پر گویا زمانوں کا بوجھ رکھ دیا گیا ہو۔ وہ اس کے نچلے لب پر سرخ تل کو چھیڑ رہا تھا۔ ضبط کے بند ٹوٹ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہی کچھ ہوا جو نعمان نے ارشی کے ساتھ سرو کے پودوں کے جھنڈ میں کیا تھا۔ نعمان نے اسے جو کچھ دیا تھا، اب وہ سود سمیت اسے واپس لوٹا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نارِ جہنم سرد پڑ گئی تو وہ فریفتہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پرندہ اڑنے کیلئے پر تول رہا تھا۔

''پھر کب ملو گے؟'' اس نے وارفتگی سے پوچھا۔ ''مجھے ساتھ ہی لے جاؤ میں اب تمہارے بنا رہ نہیں پاؤں گی۔''

یہی تو وہ چاہتا تھا۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ فوزیہ کو کال کر رہا تھا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ کار کی عقبی سیٹ پر بیٹھی حقی کے ذلت کدے کی طرف رواں دواں تھی۔ ہوش آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جذبات میں بہت کچھ کر بیٹھی ہے لیکن اب تیر نکل چکا تھا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیمار ماں کا چہرہ گھوم گیا۔

''وہ تو مر جائے گی'' اس نے زیرِ لب آہستگی سے کہا۔ دو اشک اس کی پلکوں کا دامن چھوڑ کر اس کے رخساروں پر پھیل گئے۔ اس نے گہری سانس لیکر آنکھیں بند کر لیں۔

گاڑی راہبر انسانیت کے مرکزی گیٹ کے سامنے پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

کیپٹن ارباز کی دھندلی نگاہیں ٹی وی سکرین پر مرتکز

تھیں۔ سانحہِ جہان پور لائیو دکھایا جا رہا تھا۔ اس سانحے نے پاکستان بھر کو درد کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل سوگوار تھا۔ اربابِ اختیار ٹی وی پر ایک ہی لفظ کہہ رہے تھے۔ ''مذمت'' لیکن مذمت سے زخم کب مندمل ہوتے ہیں۔

جانے والے کب لوٹتے ہیں۔ تا حال کوئی پیش رفت نہیں ہو پائی تھی۔ حملہ آور ہنوز لاپتہ تھے۔ عوام کا شور دباؤ اور احتجاج فزوں تر تھا۔ ریلیاں نکالی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ احتجاج کس کے خلاف ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے؟

''میں اس المناک سانحے کی پرزور مذمت کرتا ہوں''

اچانک ٹی وی پر مشیر وزیراعلیٰ ہاشم لنگڑیال نمودار ہوا۔

''یقیناً یہ بہت بڑا اور ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بہت جلد اس سانحے کے محرکات کا پتہ چل جائے گا اور دہشت گرد اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوں گے۔'' اس کے سیاسی بیان نے اسے آگ بگولہ کر دیا۔ اسی دوران اس کا ایک بہادر اور نڈر سپاہی غازی خان اس کے سامنے ٹیبل پر چائے کا کپ رکھ کر ٹی وی سکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ عرصہِ طویل سے اس کے ساتھ اسی یونٹ میں تھا۔ اس نے ان گنت دہشت گردوں کو نابود کیا تھا۔ اس کی جرات وجنون نے کیپٹن کو بہت متاثر کیا۔

''سر یہ لفظ مذمت بھی تکیہ کلام ہی بن گیا ہے ان لوگوں کا'' وہ ٹی وی سکرین پر ہاشم لنگڑیال کو ناگوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا مذمت سے دہشت گردی اور عوام کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ میرے بس میں ہو تو مذمت کرنے والے کی مرمت کر کے رکھ دوں۔''

''جوان! یہ سسٹم ہی ایسا ہے۔'' وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔ ''بس دو چار دن واویلا رہتا ہے۔ مذمت والے بھی چپ ہو جاتے ہیں اور میڈیا بھی۔ لیکن اس بار میں چپ نہیں رہنے والا۔ امجد عالم کے ایک ساتھی نے کچھ نشان دہی کی ہے۔ تم لوگ فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہمیں نکلنا ہے۔''

''یس سر'' اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''سر آٹھ بج رہے ہیں آپ ناشتہ۔۔۔۔''

''نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اب چائے پی لی ہے۔'' کچھ دیر بعد فورس کے چھ جوان سربکف ہو چکے تھے۔ کیپٹن ارباز بھی تیار تھا۔ اس نے اپنا پسندیدہ پستول بریٹا اور اے کے سینتالیس منتخب کی۔ پرائیویٹ آپریشن پر عموماً یہی اسلحہ استعمال کیا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک مضبوط اور جدید ماڈل لینڈ کروزر میں محافظ سنٹر کی حدود سے نکل رہے تھے۔

امجد عالم کے ساتھی دلاور خان نے اسے انفارمیشن دی تھی تاہم وہ مکمل انفارمیشن سے آگاہ نہیں تھا۔

''سر جہان پور سے مغرب کی طرف سات کلو میٹر کے فاصلے پر ٹھٹھہ نامی گاؤں ہے'' ابھی دس منٹ پہلے وہ اسے فون پر بتا رہا تھا۔ ''وہاں عبیداللہ نامی شخص مشکوک سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ چٹھہ صاحب مرنے سے ایک گھنٹہ پہلے مجھے بتا رہے تھے۔'' دلاور خان نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔

''وہ ٹھٹھہ میں کہاں ملے گا؟'' کیپٹن نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

''وہ سرو ہیں کا رہائشی ہے۔ نوجوان اور شرپسند قسم کا بندہ ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات پیدا کرنے میں ماہر ہے'' دلاور خان دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''چٹھہ صاحب کو اس پر شک تھا۔ اس کے علاوہ مدرسہ راہبر انسانیت بھی مشکوک ہے، لیکن ثبوت کی عدم دستیابی کی وجہ سے محفوظ ہے، عبیداللہ کا وہاں بہت آنا جانا ہے۔ باقی آپ اسی سے معلوم کر سکتے ہیں۔''

کال منقطع ہو جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ احمد مارکیٹ میں خودکش حملے کے بعد فوزیہ نے کال کی تھی، لیکن دوبارہ اس سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا۔ البتہ اس نے کسی اور نمبر سے میسج کیا تھا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ ایس ایم ایس کے آخر میں اس نے صرف "ایف" لکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا اور اب دلاور خان کی انفارمیشن پر وہ ٹھٹھہ نامی گاؤں جا رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد برلب سڑک مذکورہ گاؤں کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ کافی بڑا قصبہ تھا۔ مخبر کے مطابق

ٹھٹھہ سے ایک کلومیٹر پہلے مولانا عبیداللہ کا مدرسہ تھا۔وہی اس کا منتظم و مہتمم اور پیش امام تھا۔صرف دو منٹ بعد وہ مدرسے کے سامنے پہنچ گئے۔اس طرح کی گاڑیوں کا آنا جانا روز کا معمول تھا۔وہ پرائیویٹ گاڑی تھی اور وہ سب سادہ کپڑوں میں تھے۔مدرسے کی عمارت اچھی حالت میں تھی۔سڑک سے کچھ فاصلے پر بلند و بالا چار دیواری نظر آنے لگی۔مین سڑک پر متعدد دکانیں تھیں۔اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔یہ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا،جب لینڈ کروزر مدرسے کے مرکزی گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔آپریشن چونکہ خفیہ طور پر ہو رہا تھا،لہذا سوائے لیفٹیننٹ کرنل صفدر بخاری کے کسی کو انفارم نہیں کیا گیا۔دو کمانڈوز ہدایت کے مطابق مدرسے کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔عقب میں ٹاہلی اور کیکر کے متعدد درخت اور تاحد نگاہ کھیت کھلیان تھے۔دور سے گاؤں نظر آرہا تھا مدرسے کا مرکزی گیٹ بند تھا۔کیپٹن ارباز اپنے جوانوں کے ساتھ گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔یہاں انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں تھا تاہم وہ اپنی گنز ان لاک کر چکے تھے۔چند ایک لوگوں نے انہیں تحیر و خوف آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ایک سپاہی کی دستک پر ایک جواں سال لڑکے نے گیٹ کا چھوٹا پٹ کھولا۔وہ اٹھارہ انیس کے لگ بھگ ایک عام سا لڑکا تھا۔مسلح افراد کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو کر ٹھٹکا۔اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن غازی خان نے اسے گرفت میں لے لیا۔

”ڈرو مت ہم مولانا صاحب سے ملنے آئے ہیں۔“اس نے نرم لہجے میں کہا۔

سامنے قطار در قطار کئی کمرے اور ان کے سامنے برآمدہ تھا۔کشادہ صحن میں صفیں بچھی ہوئی تھیں۔کچھ چھوٹے بڑے لڑکے صحن میں صفوں پر بیٹھے تھے۔چند ایک نیم دراز تھے۔ایک طرف قطار میں چند غسل خانے بھی نظر آئے۔

”جج جی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“

لڑکے نے خوفزدہ لہجے میں ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔دو مسلح جوان گیٹ کے پاس رک گئے۔کیپٹن ارباز،غازی اور ایک جوان کے ساتھ مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔گنز ان لاک اور انگلیاں ٹریگرز پر کسی بھی طرح کی صورت حال کے لئے ہلکی سی جنبش کی منتظر تھیں۔صحن میں موجود لڑکے انہیں دیکھ رہے تھے۔انہوں نے کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا،البتہ وہ خوفزدہ نظر آرہے تھے۔چند منٹ بعد وہ مطلوبہ دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔اندر سے کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔

”دیکھیے سب ٹھیک ہو گیا ہے اور اس طرح ہی ہوتا ہے یہاں،دو چار دن دھول اڑتی ہے اور پھر ایک دم بیٹھ جاتی ہے۔جناب آپ بے فکر رہا کریں۔“ایک ہلکی سی مردانہ آواز سنائی دی۔کمرے کے ساتھ ملحق دوسرے کمروں کے دروازے بند تھے۔

”جناب فکر کی کوئی بات نہیں“آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔”آپ تو جانتے ہی ہیں یہاں بڑے سے بڑا حادثہ تیسرے دن فراموش کر دیا جاتا ہے۔“

کیپٹن دبے پاؤں آگے بڑھا۔اس نے نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔منقش چٹائی پر تکیے سے ٹیک لگائے ایک آدمی اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھے کسی سے بات کر رہا تھا۔اس کی پشت دروازے کی طرف تھی،تاہم اس کے خدوخال کی جھلک نظر آرہی تھی۔وہ اسکائپ پر کسی سے بات کر رہا تھا۔کیپٹن نے چونک کر غازی خان کی طرف دیکھا۔سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ اندر داخل ہو گئے۔مذکورہ باریش آدمی چونکا۔اس نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر دیکھا،اور فوراً سے پہلے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔کمرے میں اس کے سوا کوئی ذی نفس نہیں تھا۔یہ سادہ سا کمرہ تھا۔چٹائی پر گدے کے اوپر دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔چند اسلامی کتب اور رحل پر نسخہِ قران پڑا تھا۔مولانا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔وہ دزدیدہ نگاہوں سے نیچے پڑے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہا تھا۔

”کک کون ہو تم اور یہ کوئی آنے کا طریقہ ہے؟“وہ ہکلاتے ہوئے ارباز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ گندمی رنگت کا حامل ایک ہٹا کٹا آدمی تھا۔مشت بھر سیاہ داڑھی لمبی زلفیں پیشانی پر محراب۔سفید کرتے

پاجامے میں ملبوس اس کے کھردرے نقوش عجیب سے لگ رہے تھے۔

"تم عبیداللہ ہو؟" کیپٹن نے سخت لہجے میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی لیکن آپ؟"

"مجھے چھوڑو مدرسہ چاروں طرف سے گھیرلیا گیا ہے۔تمہیں امجد عالم چٹھہ کے مرڈر اور سانحہِ جہان پور میں ملوث ہونے کے جرم میں گرفتار کیا جارہا ہے۔" کیپٹن نے پھنکار کر کہا۔

"اوہ جناب میں تو ایک عام سا سیدھا سادہ بندہ ہوں۔آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔

"اور یہ لیپ ٹاپ؟ تم کس سے بات کررہے تھے؟" کیپٹن نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"جج۔۔جناب یہ جرم تو نہیں ہے۔آپ اسے آن کرکے دیکھ لیں۔اس میں تو مدرسے کے اخراجات اور بچوں کا حساب کتاب درج ہے۔" وہ قدرے پراعتماد لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، اپنا آئی ڈی کارڈ دکھاؤ"

کیپٹن کے کہنے پر اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کردیا۔آئی ڈی کارڈ اوریجنل تھا، لیکن یہ تسلی کیلئے کافی نہیں تھا۔

"تم کس سے بات کررہے تھے؟" اس نے دوبارہ سخت لہجے میں سوال کیا۔

"میں جی، استاد محترم حقی صاحب سے بات کررہا تھا۔

ہمارے مدرسے کے اخراجات انہی کی طرف سے آتے ہیں" اس نے تاویل پیش کی۔

"عبیداللہ میں کیپٹن ارباز شیر خان ہوں" وہ بولا تو اسے جھرجھری سی آگئی۔"میں خفیہ طور پر تم جیسے رذیلوں کو نابود کررہا ہوں" اس نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی اور دوبارہ بولا "تمہیں اپنا نام اس لئے بتایا ہے کہ تم کچھ دیر میں مرنے والے ہو، اور تمہارے حقی کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اس نے غازی خان کو مخصوص اشارہ کیا۔وہ آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔اس سے پہلے اس نے لیپ ٹاپ اٹھالیا تھا۔اس کا آئی ڈی کارڈ اور سیل فون کیپٹن کے قبضے میں تھا۔دروازے کے سامنے بچوں کی بھیڑ لگ گئی۔

"اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ" کیپٹن نے بلند آواز میں کہا تو وہ سہم کر ایک طرف چلے گئے۔

"بچاؤ" اچانک ساتھ والے کمرے سے ایک نسوانی چیخ گونجی۔ایک لمحے کیلئے کیپٹن اور اس کے ساتھیوں نے کمرے کی طرف دیکھا۔اسی لمحے عبیداللہ نے جھپٹ کر لیپ ٹاپ چھین لیا اور صحن کی طرف دوڑ لگادی۔کیپٹن نے عقب سے نشانہ لیکر اے کے سینتالیس کا دہانہ کھول دیا۔فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔چھلنی ٹانگوں کیساتھ وہ چیختا ہوا نیچے گرا۔اس کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گیا تھا۔اس کا خون صفوں کو رنگین کرنے لگا۔بچے چیختے چلاتے بے سمت بھاگ رہے تھے۔عبیداللہ بیہوش ہوچکا تھا۔غازی خان اور اس کا ساتھی کمرے کے دروازے کو گھور رہے تھے۔دبی دبی نسوانی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔شاید اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا۔

"اندر جو کوئی بھی ہو باہر آجاؤ" کیپٹن کی آواز گونجی۔

"اور لڑکی کو چھوڑ دو تمہیں آخری موقعہ دیا جارہا ہے۔تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔"

چند لمحوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد اچانک دروازہ کھلا۔ایک نیم برہنہ خوبرو لڑکی چیختی چلاتی دروازے سے بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔

دوسرے ہی لمحے غازی خان نے اسے گرفت میں لے لیا۔کیپٹن نے گن کا رخ دروازے کی طرف کیا اور لبلبی دبادی۔ایک بھیانک چیخ کے ساتھ اچانک خاموشی چھاگئی۔گیٹ پر تعینات دونوں جوان بھاگتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیپٹن کو دیکھ رہی تھی۔وہ ایک دلکش اور بھرپور لڑکی تھی۔اس کے چہرے پر نیل اور زخموں کے نشان نظر آرہے تھے۔وہ سرتاپا لرزتی

ہوئی ہچکیاں لے کررو رہی تھی۔
مسلح جوان کمرے کے دروازے کے سامنے گن تانے کھڑے تھے۔اندر بدستور خاموشی تھی۔
''کون ہوتم؟'' کیپٹن نے لڑکی کی طرف مستفسرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''مم میں شاہدہ ہوں جی۔اسی گاؤں کے حاجی عمر دراز کی بیٹی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''کل میں اسکول سے واپسی پر یہاں سے گزر رہی تھی۔جب یہ بدمعاش مجھے اٹھا کر لے آئے۔میں برباد ہوگئی ہوں۔میں لٹ گئی ہوں۔یہ درندے وحشی ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔'' اس نے بیہوش عبیداللہ کی طرف اشارہ کیا۔''اندر چار بدمعاش ہیں انہیں مار دو صاحب جی، تمہیں اللہ کا واسطہ۔''
''اندر گھس جاؤ اور انہیں زندہ یا مردہ باہر لے آؤ''
کیپٹن نے آرڈر دے دیا۔
غازی کے ساتھ تینوں سرفروش بے جھجک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے اور پھر سب کچھ آناً فاناً ہوگیا۔اچانک دروازے سے تین ہٹے کٹے آدمی نمودار ہوئے۔بڑے بڑے بال خطرناک مونچھیں، ان کی داڑھیاں نہیں تھیں۔چوتھے کی لاش اندر پڑی تھی۔
ان کے ہاتھوں میں جدید آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔
اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتے۔آرمی کے جوان ٹریگر دبا چکے تھے۔وہ تینوں چھلنی ہوکر ایک دوسرے کے اوپر گرے۔گرتے گرتے ایک آدمی نے رائفل کی لبلبی دبا دی۔۔۔برآمدے کے پلر کیساتھ کھڑی شاہدہ اپنے چھلنی ہوتے ہوئے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر زمین پر گری۔چند لمحوں بعد وہ تڑپ تڑپ کر ساکت ہوگئی۔
دہشت گردوں کے کمرے سے کافی مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔غازی خان نے انکشاف کیا کہ مرنے والوں میں دو ہندو تھے۔عبیداللہ ہوش میں آگیا تھا اور درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔اس کی دونوں ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی چھلنی ہوگئی تھی۔اس کے ارد گرد اسی کے خون کا تالاب بن گیا۔کیپٹن، شاہدہ کی لاش کو تاسف سے دیکھتا ہوا اس کے قریب گیا۔وہ آخری دموں پر تھا اس کی آنکھیں بند اور سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔
''جہان پور میں حملہ کس نے کروایا تھا''
کیپٹن نے اس کے پہلو میں ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا۔
''مم میں نے۔۔۔۔خودکش حملہ میں نے کروایا تھا لیکن بم دھماکا۔۔او۔۔اور امجد عالم کا قتل، مجھے نہیں پتہ معلوم''
''تم مسلمان نہیں ہوسکتے، کون ہوتم؟''
کیپٹن نے سفاک لہجے میں کہا اور گن کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔اسے آخری جھٹکے لگ رہے تھے۔
''مم۔۔۔میں مسلمان نہیں۔'' اس نے بمشکل کہا۔
''مم۔۔۔میں۔۔۔۔میں۔۔۔''
کچھ اور بتانے سے پہلے وہ جہنم واصل ہوگیا۔یہ مشن کامیاب رہا تھا۔متعلقہ پولیس آفیسر کو آگاہ کر کے سرفروشوں کا یہ گروہ خاموشی سے واپس روانہ ہوگیا۔کیپٹن کے ذہن میں ایک ہی نام گونج رہا تھا ''حقی''۔

......☆☆☆......

گل کو دیکھ کر حقی کی رال ٹپک پڑی تھی-اسے یقین ہوگیا کہ کاشف کام کا بندہ ہے۔ارشی کے اصرار پر اس نے اسے رکھ تو لیا تھا، لیکن وہ مطمئن نہیں تھا، ڈین نیلسن کی سخت ہدایات کے بعد وہ اور بھی محتاط ہوگیا تھا، اور اب ایک بھرپور خوبرو نوجوان لڑکی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اس کے اندر کا ابلیس انگڑائی لے رہا تھا۔کاشف اور فوزیہ اس کے سامنے کھڑے تھے۔پچھلے دو دنوں سے وہ بہت خوش تھا۔سانحہ جہان پور کے بعد اس کی پوزیشن مضبوط ہوگئی تھی۔وہ بگ باس کی نظروں میں معتبر ہوگیا۔اگرچہ کہ حالات مخدوش اور ناساعد تھے، لیکن وہ مطمئن تھا کیونکہ اس کے تعلقات پاکستان کے ستونوں سے تھے۔جن میں بڑے بڑے عہدیدار اور افسرانِ بالا شاملِ فہرست تھے۔
امجد عالم چٹھہ کو مہارت ومشاقی سے مارنے کے بعد قدوس بھی سرخرو ہوگیا۔کیتھی برنارڈ نے اپنے بڑوں کو رپورٹ دے دی۔وہ بہت خوش ہورہے تھے۔اب چند دن آرام کے بعد کسی اور سنگین کارروائی کا پلان بن گیا، لیکن کیپٹن ارباز ان کی آنکھ میں کھٹک رہا تھا۔نیکسٹ

مشن کیپٹن کو راستے سے ہٹانا تھا۔ کیتھی اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئی تھی۔

''جناب یہ گلناز ہے۔'' کاشف نے گل کی طرف اشارہ کرکے آہستگی سے کہا۔'' حالات کی ستائی ہوئی ہے۔ آپ کے دستِ شفقت کی طلبگار ہے۔''

''ہم نے کب انکار کیا یہ صحیح جگہ پر آئی ہے اور ہم اسے صحیح راستہ پر چلائیں گے۔'' وہ اس کی طرف للچائی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ جاؤ آرام کرو۔ ہم اپنی نئی مہمان سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں۔ کاشف فوزیہ گل کی طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ وہ نروس ہورہی تھی تاہم خوفزدہ نہیں تھی۔ حقی کا جلالی چہرہ اسے متاثر کررہا تھا۔ وہ خود کو محفوظ جگہ پر محسوس کرنے لگی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی نظریں جھکائے گہری سوچ میں مستغرق تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' حقی نے تسبیح تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔'' یہاں تمہیں کسی قسم کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ انسانیت کا راہبر ادارہ ہے۔ یہاں اللہ سے قرب کے مواقع دیے جاتے ہیں۔''

''اللہ سے قرب؟'' ایک دم وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔'' اللہ کا قرب تو اللہ کے خاص بندوں کو ملتا ہے جی۔ میں تو اک گناہ گار لڑکی ہوں۔ میں نے ماں باپ کا دل دکھایا ہے۔'' وہ آبدیدہ ہورہی تھی۔

''یہاں ہر درد کی دوا ہے۔ ہر مسئلے کا حل ہے'' وہ اس کا مرمریں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی لکیروں کو غور سے دیکھنے لگا۔

''واہ تمہاری لکیریں تو بہت کچھ بتارہی ہیں۔ ڈھیروں دولت خوشیاں، کوٹھیاں کار۔۔۔'' وہ اس کے ملائم ہاتھ کالمس کشید کررہا تھا۔

''سچ جناب؟'' وہ پہلی دفعہ دل سے مسکرائی۔

''میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

''آپ کی بات کیسے غلط ہوسکتی ہے، لیکن۔۔۔''

''لیکن یہ کہ تمہیں قربانی کے عمل سے گزرنا ہوگا''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اب اس کی متحرک انگلیاں اس کی کلائی پر رینگ رہی تھیں۔

''عزیز۔'' وہ بلند آواز میں بولا۔

فوراً ہی ایک نوجوان مخصوص شربت کا گلاس لے کر حاضر ہوگیا۔ اس نے گلاس چٹائی پر اس کے سامنے رکھا اور واپس چلا گیا۔

''قربانی کا وقت ابھی دور ہے۔ تم شربت پیو۔ ذہن کی کثافتیں دھل جائیں گی۔ ہر غم نابود ہوجائے گا۔

اس کا مکروہ ہاتھ اس کی شفاف گردن پر کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں پارہی تھی۔

اس نے شربت کا گلاس اٹھایا اور چند لمحوں میں وہ کڑوا کسیلا شربت ختم کردیا۔ اس کی حالت عجیب ہورہی تھی۔ نارِجہنم پھر بھڑک اٹھی تھی۔ وہ ہواؤں میں گویا آنکھیں بند کیے اڑنے لگی۔ اس کا جسم کیف و سرور کی فضاؤں میں اڑ رہا تھا۔ وہ بے خود ہونے لگی۔

چند لمحوں بعد وہی شیطانی عمل شروع ہوگیا۔ کتنی لڑکیاں اس کے بھائی نعمان اور اس کی وجہ سے اس ذلت کدے میں پامال ہوئی تھیں۔ آج وہ خود بدلہ دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے مخصوص کمرے میں پہنچادیا گیا۔ جہاں عرشی اس کی منتظر تھی اور پھر وہی شیطانی عمل دہرایا جانے لگا۔ اس دوران رخشی کمرے سے چلی گئی تھی۔

قیصر فوزیہ اور نعمان ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

اب فوزیہ کا رویہ اس سے دوستانہ ہوگیا تھا، لیکن نعمان کی موجودگی میں وہ اس سے بات کرنے سے گریز کررہی تھی۔ اسی لمحے قدوس کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تینوں کھڑے ہوگئے۔

''نئی لڑکی تنویمی عمل سے گزر چکی ہے۔''

اس نے آہستگی سے کہا۔'' اسے اس کے کمرے میں پہنچاؤ اور انجکشن دیدو۔''

''جی قدوس بھائی۔'' نعمان نے مودب لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے فوزیہ اور قیصر بھی تھے۔

گل کو ہوش آگیا تھا۔ وہ چٹائی پر برہنہ پڑی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کی دسترس میں نہیں

تھا۔ کچھ دیر بعد اسے دوسرا مخصوص شربت پلا دیا گیا۔ وہ کچھ دیر بعد ایک جھٹکے سے اٹھی۔

''یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟'' وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ کون سی جگہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں۔ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

وہ رونے لگی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''یہ وہی جگہ ہے، جہاں تم اور تمہارا بھائی معصوم لڑکیوں کو بھیجتے تھے'' ارشی نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

''اور تمہارے ساتھ وہی کچھ ہوا ہے، جو ہم سب کے ساتھ ہو چکا ہے۔''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئی۔ عمل کا بدلہ اس نے دیدیا تھا۔

ارشی کمرے سے نکل کر چلی گئی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کسی غیر مرئی نکتے کو گھورنے لگی۔ اگرچہ کہ وہ اسی قماش و قبیل کی تھی، لیکن اس کیساتھ ایسا ہوگا اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

چند لمحوں بعد قیصر فوزیہ اور نعمان کمرے میں داخل ہوئے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ پتھر کا بت بن کر رہ گیا تھا۔

وہ اسے پتھرائی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اور پھر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ایک دم وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا۔ شدتِ وحشت سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

''گل۔۔۔'' وہ زور سے دہاڑا۔

تمہیں یہاں کون لایا ہے اس ذلت کدے میں؟''

قیصر اور فوزیہ اسے یک ٹک گھور رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''اسے میں لایا ہوں نعمان۔'' اچانک کاشف نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ذلت کدہ نہیں یہ تو اللہ سے قرب کا ذریعہ ہے۔ اب کیوں تلملا رہے ہو۔ اگر میری بہن ارشی یہاں آسکتی ہے تو تمہاری کیوں نہیں۔۔۔''

وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کے لب پھڑ پھڑا رہے تھے لیکن وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ وہ جست لگا کر گل کے پاس پہنچا۔ وہ سرتا پا لرز رہی تھی۔ وہ اسے گردن سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ اچانک اس نے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ اس نے پستول کی نال گل کی پیشانی پر رکھ دی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے لبلبی پر دباؤ بڑھانے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یکبارگی وہ چلا اٹھی۔

''مارو۔ ماردو مجھے'' وہ چنگھاڑتی ہوئی بولی۔ اس کی آواز کانپنے لگی۔ ''اب تمہاری غیرت کیوں جاگی ہے؟ اس وقت کہاں تھی تمہاری غیرت۔۔۔؟''

معاً ایک فلک شگاف دھماکے کی آواز میں اس کی چیخ معدوم ہو کر رہ گئی۔ اس نے لبلبی دبادی تھی۔ گولی اس کے سر میں گھس کر عقب سے نکل گئی۔ کمرے کی دیوار پر خون اور گوشت کے لوتھڑے چپک گئے۔

وہ تیورا کر نیچے گری اور ساکت ہوگئی۔ نعمان نے دہاڑتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر خون کے چھینٹے بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ اس نے پستول کا رخ کاشف کی طرف کر دیا۔

''تم بھی نہیں بچو گے'' وہ کانپتی ہوئی آواز میں دہاڑا۔

اس پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اسی لمحے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ نعمان کے سینے سے خون کا فوارہ نکلا۔ وہ کرب کے عالم میں تحیر آمیز نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑی ارشی اسے قہرناک نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبے پستول کا رخ نعمان کی طرف تھا۔ وہ بجھتی آنکھوں سے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ایک دم اس کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ساکت ہو گیا۔ اسی لمحے قدوس اور حقی بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

''جلدی کرو یہاں سے نکلنا ہے'' قدوس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سب بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل رہے تھے۔ انہیں ٹھٹھہ کارروائی کی خبر پہنچ گئی تھی کہ عبیداللہ ساتھیوں سمیت مارا گیا ہے۔ وہ افراتفری میں بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگے، اس بات سے بے خبر کہ کیپٹن ارباز کے سرفروشوں کا گروپ مدرسہِ راہبرِ انسانیت کے

قریب پہنچ گیا ہے۔

......☆☆☆......

''مبارک ہو محمد حیات، اللہ نے تمہیں چاند سی بیٹی دی ہے۔''

گیارہ سال بعد نرس کے منہ سے یہ خبر سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ وہ اکثر دعا کرتا تھا کہ یا اللہ میری قسمت میں بیٹا نہیں تو بیٹی ہی لکھ دے اور آج اللہ نے اس کی سن لی تھی۔

محمد حیات محکمہ پولیس میں سالہا سال سے کانسٹیبل ہی چلا آ رہا تھا۔ واجبی سی تعلیم کی وجہ سے ترقی کا موقع نہیں ملا تاہم اس ملازمت کی بدولت اچھا خاصا گزارہ ہو رہا تھا۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ اللہ اولاد نرینہ سے نواز دے لیکن اس کی قسمت میں بیٹے کے خواب کی تعبیر نہیں تھی اور اب شادی کے گیارہ سال بعد اس کی مراد بر آئی تھی۔

''نور بہت پیاری ہے ہماری بیٹی بالکل حور پری ہے''

اس نے خوشی سے معمور لہجے میں اپنی بیوی سے کہا۔ ''بس اللہ اس کے بھاگ اچھے کرے بیٹوں سے نہیں، بیٹیوں کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔''

''جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا حیات'' نور نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بالکل حور پری ہے میری بیٹی میں تو اس کا نام حور ہی رکھوں گی۔'' اس نے بیٹی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''ہاں حور بہت پیارا نام ہے۔'' وہ اس سے بیٹی کو لیتے ہوئے خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔

اور یوں اس کا نام حور پری رکھ دیا گیا۔ وہ کرائے کے تنگ سے مکان میں پروان چڑھتی رہی۔ ادھر اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، ادھر حیات اور نور کے بالوں میں چاندی اور چہروں پر سلوٹیں بڑھنے لگیں۔

حور نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور ماں کے ساتھ سلائی کا کام کرنے لگی۔ اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اٹھارہ کی عمر میں وہ ایک بھرپور اور پرکشش لڑکی بن گئی تھی۔ نکلتا ہوا قد، چھریرا جسم، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، گداز گلابی ہونٹ لمبی گردن، اور گھنی سیاہ زلفیں، وہ واقعی میں حور پری لگتی تھی۔

حسن بکراں کا یہ بیش قیمت خزانہ وہ سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ ہر پل دھڑکا سا لگا رہتا۔ حالات بہت نازک اور ناقابلِ اعتبار تھے۔ اب انہیں حور کی شادی کی فکر لگی رہتی، لیکن کوئی مناسب رشتہ دستیاب نہیں تھا۔ محمد حیات بیٹی کیلئے جہیز کا متحمل نہیں ہو پا رہا تھا۔

''ابھی سے کیا فکر ہے تمہیں محمد حیات؟''

ایک دن نور نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ ''اللہ بہترین مسبب الاسباب ہے، بس اس پر سب چھوڑ دو۔''

''میں باپ ہوں نور، مجھے تو اندیشے سونے نہیں دیتے۔'' وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ ''زمانہ بہت خراب ہے اور کیا پتہ زندگی کا۔۔۔۔''

''چل ایویں پریشان نہ ہوا کر۔ شکر کر ہماری بیٹی کو دنیا داری سے دلچسپی نہیں۔ بڑی نیک ہے ہماری بیٹی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے بولی۔

''یہ تو اللہ کا بڑا احسان ہے نور''

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکر ادا کیا اور عشا کی نماز کیلئے وضو کرنے باتھ روم میں گھس گیا۔ چھوٹے سے دو کمروں پر مشتمل یہ کرائے کا مکان احمد مارکیٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہی احمد مارکیٹ جہاں کچھ روز پہلے خودکش حملہ ہوا تھا۔ اور اس سے چند روز بعد ہی سانحہ جہان پور رونما ہو گیا۔ پولیس کی ڈیوٹیاں سخت ہو گئی تھیں۔ آج وہ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے جلدی ہی گھر آ گیا تھا۔ اس کی طبیعت بہ ظاہر ٹھیک تھی لیکن اندر ہی اندر وہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک روح فرسا احساس اس کے دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ضمیر کی ملامت اس کے چین وسکون کو غارت کر رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت کے پانی سے تر ہو رہی تھیں۔

''میرے اللہ اگر میں نے جرم کیا ہے تو مجھے معاف کر دے۔ میرا چین مجھے واپس کر دے۔ تو رحیم وکریم ہے۔ دلوں اور نیتوں کے حال سے بخوبی آگاہ ہے۔''

وہ آنکھیں بند کیے مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں لرزش اور آنکھوں میں نمی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



چند لمحوں بعد اس نے اپنے کمرے میں پڑے ٹرنک کو گھور کر دیکھا۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور اس کا تالا کھولنے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نور اور حور دوسرے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرنک کھول دیا۔ اس نے تہہ شدہ کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ اس کا ضبط جواب دینے لگا۔ اس کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔ یخ بستہ موسم کے باوجود اس کے مسام سے پسینہ نکل رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا اور پوٹلی کو کھولنے لگا۔ پوٹلی میں سونے کی بالیوں پر نظر پڑتے ہی وہ کانپنے لگا۔ کم و بیش ایک تولہ طلائی زیور اسے اپنی بیٹی حور کے خواب کی تعبیر لگ رہا تھا۔ لیکن اس تعبیر کے پیچھے خون کا رنگ اسے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ نادانستگی میں وہ گناہِ عظیم کا مرتکب ہو گیا تھا۔ یہی احساس اسے مضطرب اور بے کل کر رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بالیوں کو گھورتا رہا۔

اس کے جسم اور ہاتھوں کی لرزش میں اضافہ ہونے لگا۔ اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک جھٹکے سے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے عقب میں کھڑی اس کی بیوی اس کی ہتھیلی پر پڑی سونے کی بالیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ کہاں سے لائے ہو، حیات محمد؟''

اس نے تحیر زدہ لہجے میں استفسار کیا اور اس کے ہاتھ سے بالیاں اٹھا لیں۔

''بہت فکر ہے تمہیں حور کی۔ اس کے لئے بالیاں بھی بنوا لیں اور مجھے بتایا تک نہیں۔''

وہ بالیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

وہ پتھر کا بت بنا اسے گھور رہا تھا۔ اس کے لب متحرک تھے لیکن وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ ایک دم اس نے بالیاں نور کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

وہ اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نور یہ بالیاں مجھے دے دو۔ یہ میری حور کیلئے نہیں ہیں۔''

اس کی آواز میں لرزش نے اسے الجھا کے رکھ دیا۔

''کچھ بتاؤ بھی یہ کیا معاملہ ہے اور یہ بالیاں۔۔۔''

وہ بات کرتے ہوئے اچانک خاموش ہو گئی۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بالیوں پر مرکوز تھیں۔

''حیات محمد، ان بالیوں پر تو خون لگا ہوا ہے۔ کہاں سے لائے ہو یہ؟'' وہ ایک دم بالیاں نیچے پھینک کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اچانک اس کی آنکھوں کے پیالے چھلک پڑے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''نور مجھے معاف کر دو۔ یہ بالیاں مم۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔'' اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حور بھی کمرے میں داخل ہو کر اس کے عقب میں کھڑی ہے۔

''بتاؤ حیات محمد کہاں سے لائے ہو؟'' وہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چلائی'' تم نے کوئی جرم تو نہیں کر لیا؟''

''میں اللہ کا مجرم ہوں نور'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چند لمحوں بعد وہ اسے سارا قصہ سنا چکا تھا۔ وہ فرش پر پڑی بالیوں کو یک ٹک دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں گویا باہر نکل رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی دو بالیاں اسے جہنم کے سیاہ بچھو لگ رہی تھیں۔ حیات محمد کی کہانی نے اسے لرزا کے رکھ دیا۔ حیات محمد کی ڈیوٹی احمد مارکیٹ میں ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ معمول کے مطابق ڈیوٹی پر تھا، جب شام کے سرمئی اندھیرے میں اسے ایک خوش اندام و دلکش لڑکی نظر آئی۔ وہ دراز قامت لڑکی بلیو جینز اور ریڈ شرٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ وہ انتہائی خوبصورت اور پرکشش تھی۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا، اس کی نظر اس کے کانوں میں جھولتی ہوئی سونے کی بالیوں پر تھیں۔ چشم تصور میں وہ یہی بالیاں حور کے کانوں میں دیکھنے لگا۔ لڑکی سرسری نظر سے اسے

دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اسے گماں ہوا کہ لڑکی بدحواس سی ہے۔ تاہم اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ یہاں تو روزانہ سیکڑوں لڑکیاں آتی تھیں، لیکن غیرارادی طور پر اس کی نگاہیں لڑکی کے تعاقب میں تھیں۔ وہ خودکار انداز میں لوگوں کے ہجوم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند فرلانگ چلنے کے بعد لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ اسی لمحے ایک ساعت شکن دھماکا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ان گنت لوگوں کے ساتھ لڑکی کا وجود بھی کئی حصوں میں تقسیم ہوکر ہوا میں منتشر ہوگیا۔

وہ جلدی سے اس طرف بھاگا اچانک ہوا میں اڑتا ہوا ایک نسوانی سر اس کے سامنے آگرا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مسخ شدہ بے چہرہ سر پڑا تھا۔ اس کے زخمی کانوں میں وہی بالیاں نظر آرہی تھیں۔ لوگوں کی بھگدڑ اور چیخ وپکار برپا تھی۔ گویا ایک قیامتِ صغریٰ تھی جو اچانک ٹوٹ پڑی تھی۔ جابہ جا خون گوشت کے لوتھڑے اور انسانی اعضا بکھر گئے۔ بے حسی نے اس کے ذہن پر دستک دی۔ وہ اپنی مدتوں کی صاف شفاف اور بے داغ ڈیوٹی بھول گیا۔ اس نے لڑکی کے کانوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بالیاں کھینچ لیں۔

''حیات محمد مجھے تم سے گھن آرہی ہے'' نور نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہمیں ان بالیوں کی ضرورت نہیں، لے جاؤ انہیں''

وہ روتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''ابا۔۔۔''

اچانک عقب سے حور کی حواس باختہ آواز سن کر وہ کانپ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے کب کوئی ایسی فرمائش کی کہ تم ایسا کام کرو اور اپنا فرض بھول جاؤ'' وہ اس کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ابا مجھے ان چیزوں کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔''

اس کی جھیل سی آنکھوں سے جیسے چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

''اور ان بالیوں میں مجھے بیگناہ اور معصوم لوگوں کا خون نظر آرہا ہے۔ انہیں لیجاؤ۔۔۔۔ انہیں لیجاؤ۔۔۔''

وہ روتی ہوئی باپ کے سینے سے لگ گئی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نور کمرے سے چلی گئی تھی۔

''مجھے معاف کردینا میری بچی'' وہ آبدیدہ ہوکر بولا۔

''میں بھول گیا تھا۔ میں بہک گیا تھا۔ مجھے تم پر ناز ہے میری جان۔ میں یہ بالیاں انسپکٹر پاشا کے حوالے کرنے جارہا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے معاف کردے گا۔ میرے اللہ۔۔۔ تم بھی رحم کرنا۔''

اس نے فرش پر پڑی ہوئی بالیاں اٹھائیں، اور کمرے سے نکل کر صحن عبور کرتا ہوا بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ ماں بیٹی کی رات کشمکش اور اضطراب کے عذاب میں گزر رہی تھی۔ حیات محمد لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ کال اٹینڈ کررہا تھا نہ ہی خود کال کر کے کچھ بتارہا تھا۔ انہیں نہیں خبر تھی کہ حیات محمد کے ضمیر کی آواز نے اس گھر کی دیواروں پر بربادی کا نوحہ لکھ دیا ہے۔

......☆☆☆......

''یا اللہ خیر، یہ تو فائرنگ کی آواز ہے۔''

مسجد کے صحن میں بیٹھے مولوی غلام رسول نے حواس باختہ ہوکر کہا۔ اس کی متجسس ومتحیر! اور خوفزدہ نگاہیں مدرسہِ راہبرِ انسانیت کی عمارت کی طرف مرکوز تھیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بعد اب مکمل خاموشی تھی۔ مخصوص کمرے میں گل اور نعمان کی لہو میں لت پت لاشیں عبرت کا سندیسہ دے رہی تھیں۔ انہی پر کی گئی فائرنگ سے مولوی غلام رسول اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ اب اس کے اندیشوں کو تقویت ملنے لگی۔ مدتوں سے ذہن میں کلبلاتے ہوئے خدشے یقین میں بدل رہے تھے۔ اس نے مدرسے کی طرف جانے کا ارادہ نہیں کیا، کیونکہ دخل در معقولات پر حقی کے خفا ہونے کا احتمال تھا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ ''جو بھی بات ہے سامنے آجائے گی۔''

اس نے سوچا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ حقی اور اس کا گینگ بھگدڑ سے دوچار تھے۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی، کہ ٹھٹھہ کارروائی میں ان کے اہم کارندے واصلِ جہنم ہوچکے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت آرمی کے سپاہی مدرسے کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ اب ان کا یہاں سے بھاگنا خونریزی اور موت

کا موجب بن سکتا تھا۔کیپٹن اور غازی خان نے گیٹ پر موجود گن بردار کو دیکھ لیا تھا، کیونکہ وہ گاڑی کے اگلے حصے میں تھے۔گن بردار نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھا۔اس سے پہلے کہ وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوتا یا کہیں فرار ہوتا کیپٹن گاڑی سے اتر کر برق رفتاری سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔اگرچہ کہ وہ سادہ لباس میں تھے،لیکن ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ اوران کے تیور بہت کچھ بتا رہے تھے، نیز یہ کہ مدرسے والوں کو ٹھٹھہ آپریشن کی اطلاع پہلے سے مل گئی تھی۔کیپٹن کے خطرناک بریٹا کا رخ گن بردار کی طرف تھا۔جبکہ اس کے ہاتھ میں اے کے سینتالیس تھی اوراس کی نال کیپٹن کے سینے کو گھور رہی تھی۔اس دوران دوسرے سپاہی اتر کر الرٹ ہوگئے۔

''گن پھینک دو'' کیپٹن نے دبنگ لہجے میں کہا۔

''تمہیں صرف ایک موقع ملے گا اس کے فوراً بعد تمہیں شوٹ کردیا جائے گا۔''

''گن بردار کنفیوز ہورہا تھا تاہم اس نے کیپٹن کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔وہ بدستور گن تانے اسے گھورتا رہا۔

وہ مرکزی گیٹ کے چھوٹے پٹ کو بار بار دیکھ رہا تھا،جوکہ نیم وا تھا۔بلاشبہ وہ بھاگنے کیلئے پر تول رہا تھا،لیکن یہ رسک زندگی کا آخری رسک ثابت ہوسکتا تھا۔

''سر نے کہا ہے گن پھینک دو۔'' غازی خان کی آواز گونجی۔

''میرے پاس بے آواز پستول ہے۔تمہاری موت کی کسی کو خبر تک نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے تم مجھے مار کر اندر جاسکتے ہو۔'' وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔''لیکن مرنے سے پہلے میں اسے ماردوں گا۔''

اس نے کیپٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا،اور گن کی لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھانے لگا۔

صورتِ حال کافی سے زیادہ سنسنی خیز ہو رہی تھی۔خطرناک گن کے سامنے ارباز کا سینہ تنا ہوا تھا،جبکہ اس کی عقابی نگاہیں گن بردار پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم ہمارے ساتھ تعاون کرو تمہیں کچھ نہیں کہا جائیگا''

اس نے کشادہ دلی سے آفر کی۔''ہم قانون کے لوگ ہیں۔ٹھٹھہ میں تمہارا ایک گینگ جہنم کیلئے روانہ ہوگیا ہے۔''

وہ بدحواس ہوگیا اور بدک کر چھوٹے پٹ کی طرف بھاگا۔اسی لمحے غازی خان نے خاموش پستول کی بے آواز گولی اس کی کنپٹی میں اتاردی۔وہ گن سمیت نیچے گرا اور فوراً سے پہلے ساکت ہوگیا۔اس کا سرخ گاڑھا خون سولنگ کو تر کر رہا تھا۔وہ گاڑی کی اوٹ میں گرا تھا لہذا اس کی خون آلودہ لاش کسی راہگیر کو نظر آنے کا خدشہ بہت کم تھا۔ویسے بھی لوگ مدرسہ راہبر انسانیت کے معاملات ومعمولات سے آگاہ تھے۔گاڑیوں کی آمدورفت اورنت نئے لوگوں کا آنا جانا نئی بات نہیں تھی۔کیپٹن کے دوسرے ساتھیوں میں سے دو مدرسے کی دیواروں کے دائیں بائیں اطراف چوکس کھڑے تھے،جبکہ دوسرے اس کے ساتھ تھے۔غازی خان نے گیٹ کا چھوٹا پٹ کھول کر اندر جھانکا۔سولنگ کی مختصر سی سڑک آگے جارہی تھی۔دائیں طرف مسجد اوراس کا صحن تھا۔جس میں نوعمر بچے نظر آرہے تھے۔سڑک کے اختتام پر چھوٹا سا آہنی گیٹ تھا۔یہ مدرسے کی طرف کھلتا تھا تاہم ابھی وہ بند تھا۔دروازے کے ساتھ فورسیٹر ٹویوٹا کھڑی تھی۔ممکنہ گن بردار مدرسے میں موجود تھے،اوروہیں سے مزاحمت کے امکانات زیادہ تھے۔گیٹ کے ساتھ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔جس میں ایک چارپائی اورمونڈھے کے علاوہ کوئی سازوسامان نہیں تھا۔اس کا در کشادہ اورفرش پختہ تھا۔

''غازی خان لاش اس چھوٹے کمرے میں ڈال دو۔'' کیپٹن نے بے خوف وخطر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اس کی چوکس نگاہیں ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔چند لمحوں بعد لاش کو گیٹ سے ملحق کمرے میں منتقل کردیا گیا۔مسجد کے صحن میں بچے انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔کیپٹن اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔سب کے ہاتھوں میں اے کے سینتالیس گنز واضح نظر آرہی تھیں۔

''بچو، تم اندر چلے جاؤ اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' کیپٹن نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ تمام بچے مسجد کے ہال نما کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی دوران مولوی غلام رسول نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر خوف الجھن اور تذبذب کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کیپٹن کے سامنے پہنچ گیا۔

''السلام علیکم آپ کون ہیں جناب؟'' مولوی غلام رسول نے مہذب لہجے میں استفسار کیا۔

''ہم بعد میں تعارف کروادیں گے مولوی صاحب۔'' اس نے تشکیک آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ مطمئن رہیں۔ اگر آپ نے تعاون کیا تو ہم بے ضرر ثابت ہوں گے۔ ٹھٹھہ کارروائی کی اطلاع تو آپ کو مل چکی ہوگی؟''

''جی جناب میں یہاں پیش امام ہوں'' وہ گویا صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں ہر ممکن تعاون کیلئے تیار ہوں۔ ٹھٹھہ کارروائی کی تو اب تک پورے ملک میں خبر پھیل چکی ہے۔''

کیپٹن اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ اسے ایک شریف اور بے ضرر سا آدمی لگا، تاہم اس سے پوچھ تاچھ کیلئے اسے لہجہ سخت کرنا پڑا تھا۔

''مولوی صاحب۔۔۔ مدرسے میں مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع ملی ہے۔ آپ کچھ جانتے ہیں تو بتادیں ہم قانون کے آدمی ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' کیپٹن نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھٹھہ آپریشن اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ عبیداللہ اپنے دہشت گرد ساتھیوں سمیت مارا گیا ہے۔ آپ کو بتا تا چلوں مارے جانے والے سب غیر مسلم تھے۔''

''استغفراللہ، اللہ رحم فرمائے۔'' اس نے گہری سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''جناب مجھے بھی کئی دنوں سے شبہ ہے، لیکن میں مدرسے کے معاملات میں دخل نہیں دیتا پر آج تو حد ہوگئی ہے۔''

''آج۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ آج؟'' کیپٹن نے تیز لہجے میں کہا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے مدرسے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئی ہیں۔ چیخ وپکار بھی بلند ہوئی لیکن فوراً ہی معدوم ہوگئی تھی۔''

مولوی سے چند لمحے مزید گفتگو کے بعد اس کے شکوک یقین میں بدل چکے تھے۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑی گاڑی کو تشکیک زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ مولانا حقی کی ہے جناب۔'' وہ کیپٹن کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے مولوی صاحب آپ اپنا کام کریں اور ہماری واپسی تک کہیں جایئے گا مت۔'' اس نے مدرسے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے غازی خان دروازے کو نیم وا کر کے اندر جھانک رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر کیپٹن کی طرف دیکھا۔

''سر سامنے ایک مشکوک گن بردار نظر آرہا ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ دوسرے نوجوان دیوار کے ساتھ الرٹ کھڑے تھے۔

''اڑادو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں آرڈر دیا۔

ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ماحول کو لرزہ براندام کر کے رکھ دیا۔ ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی مدرسے میں حقی کے کمرے کے سامنے کھڑا ہوا گن بردار چھلنی ہو کر نیچے گرا اور ساکت ہوگیا۔

''موو'' کیپٹن نے برق رفتاری سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سرفروش ساتھیوں کیساتھ مدرسے کے صحن میں داخل ہوگئے۔ وہ منتشر ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ فی الحال کسی مزاحمت یا جوابی کارروائی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ حقی اور قدوس منظر سے غائب تھے۔ ان کے ساتھ قیصر فوزیہ ارشی اور کاشف بھی روپوش ہو چکے تھے۔ مدرسے میں موجود تین مسلح آدمیوں سے ایک مارا گیا تھا، جبکہ دوسرے دونوں حقی والے کمرے میں دبکے بیٹھے تھے۔

''وکرم۔۔۔ تیار ہو جاؤ، ہم پر حملہ ہو چکا ہے اور کسی بھی صورت زندہ ان کے ہاتھ نہیں آنا۔''

ایک نے دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے

میں کہا۔اس کی انگلی خطرناک گن کی لبلبی پر تھی۔وہ کمرے کی کھڑکی سے آگے بڑھتے ہوئے کیپٹن اوراس کے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''اوکے گھنشام۔'' دوسرے نے آہستگی سے کہا۔

''اچھا ہوا کہ صاحب لوگ تہہ خانے میں جا چکے ہیں۔یہ کہیں تہہ خانہ نہ ڈھونڈ لیں'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ ممکن نہیں وکرم'' وہ مطمئن لہجے میں آہستگی سے بولا۔''وہ سوچ بھی نہیں پائیں گے کہ ادھر چھوٹے سے کمرے میں خشک لکڑیوں کے ڈھیر کے نیچے تہہ خانے کا راستہ ہے۔بس مولوی غلام رسول نہ بک دے کہ کوئی باہر نہیں گیا۔''

اس دوران ایک مسلح جوان دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔اس کی انگلی اے کے سینتالیس کی لبلبی پر ہلکی سی جنبش کی منتظر تھی۔کیپٹن اور غازی خان دوسرے کمروں میں جھانک رہے تھے۔ایک چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں خشک لکڑیوں کے ڈھیر کو بھی انہوں نے تسلی کے ساتھ الٹ پلٹ کر دیکھا،اور چند لمحوں بعد مطمئن ہو کر باہر نکل گئے۔

ایک کمرے سے انہیں دو لاشیں بھی ملی تھیں۔وہ گل اور نعمان کی لاشیں تھیں۔حقی کے کمرے سے مخصوص مشروب اور بہت کچھ ملا تھا۔اسی دوران مسجد سے مولوی غلام رسول کی اذان کی آواز گونجنے لگی تھی۔ظہر کا وقت تھا۔مدرسے میں موت کا رقص شروع ہو گیا۔ایک دم وکرم نے گن سیدھی کی اور کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے فورس کے جوان پر برسٹ کھول دیا۔وہ اس افتاد کیلئے تیار تھا لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی۔۔وہ چھلنی ہو کر لہو میں لت پت ہوا اور نیچے گر کر ساکت ہو گیا۔وکرم اور گھنشام کیلئے اتنا موقع ہی کافی تھا۔وہ برق رفتاری سے باہر نکلے اور مدرسے کے صحن کی طرف بھاگے۔

مختلف کمروں کو چیک کرتے ہوئے کیپٹن اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے باہر نکلے لیکن وہ دونوں مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔

''غازی خان ۔۔۔کوئی بچنا نہیں چاہیے'' کیپٹن دہاڑتا ہوا مدرسے کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔غازی خان اور دوسرے کمانڈوز بھی اس کے پیچھے تھے۔

وکرم اور گھنشام نے مسجد میں داخل ہوتے ہی اندھادھند فائرنگ شروع کر دی۔مولوی غلام رسول اور متعدد بچے نماز کیلئے صفیں باندھ رہے تھے،لیکن یہ ان کی آخری نماز تھی جو کہ ادا نہ ہو سکی۔متعدد بچے خون میں لت پت ہو کر اللہ کی بارگاہ میں موت کی نیند سو گئے۔

''اوئے ظالمو اللہ کا خوف کرو۔''مولوی غلام رسول جو کہ فائرنگ سے بال بال بچ گیا تھا۔ان دونوں کے سامنے کھڑا واویلا کرنے لگا۔

''تم نے اللہ کے گھر کو مقتل بنا دیا ہے۔''وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔وہ بکھری ہوئی لاشوں اور لہولہان اعضا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔وکرم نے گن کی مہیب نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔

''مولوی اپنے اللہ کو یاد کر لے۔تیرا آخری وقت آ گیا ہے۔''وہ پھنکارتا ہوا سفاک لہجے میں بولا۔''تم بہت دنوں سے میری نظر میں تھے۔میں نے حقی صاحب سے کہا بھی تھا پر انہوں نے کہا کہ مناسب وقت کا انتظار کرو اور آج مناسب وقت آ گیا ہے۔''

''او مردود۔تو اللہ کے بندوں کو موت سے ڈراتا ہے۔''مولوی کا لہجہ پرجوش ہو گیا۔''ایسی موت کی تو ہم دعائیں مانگتے ہیں جو اللہ کے راستے میں ہو اور آج میں انہیں سب کچھ بتانے جا رہا ہوں کہ اس مدرسے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔''

وہ ایک جھٹکے سے مدرسے کے دروازے کی طرف بھاگا۔

گھنشام نے جست لگا کر اسے دبوچا اور گن کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔یہی وہ وقت تھا جب کیپٹن اور اس کے سرفروش سپاہی مدرسے کا دروازہ عبور کر کے گاڑی کی آڑ میں پہنچ گئے۔

''مولوی۔۔۔حقی صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے نکل چکے ہیں۔تم اپنی فکر کرو۔''

وکرم نے سفاک لہجے میں کہا۔اسی لمحے گاڑی کی آڑ سے فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔وکرم کا سینہ چھلنی ہوا اور وہ بھیانک چیخ کے ساتھ زمین بوس ہو کر جہنم روانہ

ہو گیا۔

''وکرم۔۔۔۔۔''

گھنشام نے چیخ کر کہا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔

گیٹ کے باہر کیپٹن کے دو ساتھی موجود تھے۔ مولوی نے جست لگا کر اسے عقب سے دبوچ لیا۔ مسلح جوان نزدیک پہنچ رہے تھے۔ گھنشام نے گن پھینک کر پستول نکالا اور اس کا رخ مولوی کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔

دوسرے ہی لمحے مولوی غلام رسول کی گردن سے خون کا فوارہ نکلا۔ وہ بے جان ہو کر نیچے گر گیا۔ عقب سے کیپٹن کی فائرنگ نے گھنشام کی ٹانگوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ متعدد گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ فرش پر گرنے سے پہلے بیہوش ہو گیا۔

''غازی خان تم نے سن لیا ہو گا کہ اس کا نام گھنشام ہے۔'' کیپٹن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مولوی نہیں ہندو ہے۔ اسے ہر حال میں زندہ سلامت لیکر جانا ہے۔''

''یس سر'' اس نے مستعد لہجے میں کہا اور بیہوش گھنشام کو کاندھوں پر اٹھا کر مین گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیپٹن مسجد کے صحن میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر آبدیدہ ہو رہا تھا۔ مرنے والے بچوں کی تعداد سات تھی۔ مولوی غلام رسول نے جوان مردی سے موت کو گلے لگایا تھا۔ اس محاذ میں کیپٹن کا جواں سال ساتھی اکبر بھی کام آ گیا تھا۔ تاہم اطمینان بخش بات یہ تھی کہ دشمن کا ایک اور ٹھکانہ تباہ ہوا تھا۔ گھنشام زندہ ہاتھ لگا تھا اور اس سے بہت کچھ اگلوایا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ محافظ سنٹر کی طرف جا رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر پاشا جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ میڈیا اور ایمبولینس کی گاڑیاں بھی پہنچ رہی تھیں۔ وطن عزیز میں ایک بار پھر صف ماتم بچھ گئی۔ کیپٹن ارباز اس واقعے کا موجب خود کو سمجھ رہا تھا لیکن ایسی قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں۔ اچانک اس کا پرسنل سیل فون گنگنانے لگا۔

اجنبی نمبر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس کا یہ نمبر چند خاص لوگوں کے پاس تھا۔

غیر ارادی طور پر اس نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو میں ہوں فوزیہ'' دوسری جانب سے ایک خوفزدہ سی سرگوشی سنائی دی۔ ''یہ میرا نیا نمبر ہے۔ میں حقی اور قدوس کے ساتھ ہوں ہم اس وقت۔۔۔۔۔۔''

اسی لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ فوزیہ کی دلخراش چیخ کے ساتھ کال منقطع ہو گئی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے محمد حیات؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو''

انسپکٹر پاشا نے تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

وہ پولیس موبائل میں اسے تھانے کے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔ بھاری نفری کے ساتھ وہ کہیں ریڈ پر جا رہا تھا۔

محمد حیات گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''سر میں پریشان ہی نہیں نادم بھی ہوں'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''میں نے اپنے فرض کے ساتھ دغا کیا ہے۔ مجھے معاف کر دیں سر، میں ہر سزا کیلئے تیار ہوں۔''

پاشا اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ حیات نے جیب سے ہاتھ نکالا اور سونے کی خون کی آلودہ بالیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''یہ کیا ہے محمد حیات؟'' اس نے بالیاں پکڑتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ۔۔۔ یہ تو سونے کی بالیاں ہیں۔ کہاں سے لائے ہو اور مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

''سر! یہی میرا جرم ہے جو مسلسل میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا ہے۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان اے ایس آئی، اکرام بھٹی دزدیدہ نظروں سے بالیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اچھا مجھے بتاؤ کہ یہ ساری کہانی کیا ہے'' انسپکٹر نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں یہ کہاں سے ملی ہیں اور کس کی ہیں؟''

''سر یہ اس خودکش حملہ آور لڑکی کی بالیاں ہیں۔ جس

نے احمد مارکیٹ میں حملہ کیا تھا۔''

ایک دم اس نے چونک کر محمد حیات کی طرف دیکھا۔ جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''تمہیں پتہ ہے تم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو؟''

''مجھے پتہ ہے سر اور میں جانتا ہوں اس کی سزا کیا ہوسکتی ہے'' وہ اپنے سامنے کھڑے پاشا کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''لیکن سر ان بالیوں کی مدد سے آپ اس خودکش حملہ آور لڑکی کا پتہ معلوم کرسکتے ہیں۔''

اس دوران اے ایس آئی اکرام بھٹی بھی گاڑی سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ دوسرے اہلکار عقبی حصے میں بیٹھے ساری باتیں سن رہے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ جدید اسلحے سے لیس وہ مخبری پر کسی مجرم کی سرکوبی کیلئے جارہے تھے۔

''یقیناً میں ایسا ہی کروں گا حیات۔'' وہ اپنی سوچتی ہوئی نظریں اس پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہم افسران بالا کو کیا بتائیں گے کہ اتنے دنوں بعد یہ بالیاں کہاں سے ملی ہیں۔''

''سر میں افسرانِ بالا کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرلوں گا۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ بس کاروائی شروع کریں۔ ان بالیوں کی مدد سے مجرم تک پہنچا جاسکتا ہے۔''

''تم بہت بھولے ہو حیات محمد'' وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اقرارِ جرم کرنے سے تم پھنس جاؤ گے۔ اپنی بیوی اور بیٹی کا سوچو اور یہ معاملہ یہیں دبادو۔ یہ بالیاں بھی تم رکھ لو۔''

اس نے بالیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہ سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ایک جھٹکے سے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ ان گنت معصوم لوگوں کے خون میں لتھڑی ہوئی بالیاں ہیں۔ میں انہیں نہیں رکھ سکتا۔ میں یہ ایس پی صاحب کو دے دوں گا۔ انہیں ساری بات بتادوں گا سر۔''

وہ چند لمحے اسے سوچتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اب اس کے چہرے پر سختی کے تاثرات نظر آنے لگے۔ تاہم اس نے کسی سخت ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''ٹھیک ہے حیات'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''ابھی تو ہم ریڈ پر جارہے ہیں۔ بدنام زمانہ اشتہاری مجرم اچھو گجر کے ٹھکانے کی اطلاع ملی ہے۔ واپسی پر کچھ کرتے ہیں۔ تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔''

اس نے بالیاں جیب میں رکھیں اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

بیس منٹ پہلے مخبر نے انہیں اچھو گجر کی ایک گاؤں میں موجودگی کی خبر دی تھی۔ وہ گزشتہ ایک سال سے علاقے میں دہشت کی علامت تھا۔ قتل ڈکیتی اور اغوا کی متعدد وارداتوں میں ملوث اچھو گجر پولیس کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ حیات محمد دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی کے عقبی حصے میں سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جدید ترین اسلحے سے لیس دیگر اہلکار اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی میں اضافی گنز میں سے ایک سیون ایم ایم رائفل اسے بھی دیدی گئی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد پولیس موبائل مطلوبہ گاؤں جمال پور کی مختصر سی پختہ روسڑک پر اتر گئی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھانہ جہان پور سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ پختہ روسڑک کے آس پاس چاول کی فصلیں حدِ نگاہ تک نظر آرہی تھیں۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ انتہائی اندھیری رات اور سردی عروج پر تھی۔

''سائرن مت بجانا اکرام۔'' پاشا نے اسے ہدایت دیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ''گاڑی گاؤں کے باہر ہی روک دینا۔ آج ہر حال میں اچھو کو زندہ یا مردہ پکڑنا ہے۔''

''اوکے سر'' اس نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

اچھو گجر طافو کے ڈیرے پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ ایک بدخصلت اور سخت دل آدمی تھا۔ متعدد وارداتوں اور ڈکیتیوں میں اس نے کئی لڑکیوں کو بے آبرو کیا۔ وہ پیسے اور زیورات سے زیادہ لڑکیوں پر توجہ دیتا تھا۔ طافو جمال پور کا چھوٹا سا زمیندار تھا۔ وہ بھی مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھا اور قانون کی گہری نظر اس پر بھی تھی۔

"سر نفری کم نہیں ہے؟" اکرام نے برگد کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے گاڑی روکتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا۔ مذکورہ درخت گاؤں سے چند فرلانگ پیچھے سڑک کے کنارے ایستادہ تھا۔ اس سے آگے پانچ منٹ پیدل چلنے کے بعد طافو کا ڈیرہ تھا۔

"ہمت مت ہاروا کرام" پاشا نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ اسپیشل فورس کے چار کمانڈوز ہیں، اور یہ مجرم لوگ بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ یہ اندر سے بہت کھوکھلے اور بزدل ہوتے ہیں۔"

"جی سر۔" اکرام نے مودب لہجے میں کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ طافو کے ڈیرے کے مرکزی گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس اے کے سینتالیس، جدید پستول اور سیون ایم ایم رائفلیں تھیں۔ گاؤں میں چہار سو ہو کا عالم تھا۔ ڈیرے کے سامنے ایک کتا بھونک کر خود ہی چپ ہو گیا۔ گیٹ کا چھوٹا پٹ نیم وا تھا۔ محمد حیات سیون ایم ایم کا بلٹ چڑھا چکا تھا۔

وہ بہت پر جوش تھا تاہم نور اور حور پری کا خیال اسے مضطرب کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آج اس کی طبیعت مضمحل اور مضطرب سی کیوں ہے۔ اگر چہ کہ وہ پہلے بھی ایسی متعدد کارروائیوں میں شامل ہو چکا تھا، لیکن آج دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ خوفزدہ ہرگز نہیں تھا، لیکن مطمئن بھی نہیں تھا۔ بارہا اس کی پلکیں نمناک ہو رہی تھیں۔

دو کمانڈوز ڈیرے کے دائیں اطراف دیواروں کے پاس تعینات ہو چکے تھے۔ اکرام بھٹی کو عقبی حصے میں بھیج دیا گیا۔ کچی چار دیواری پر مشتمل یہ ایک عام سا ڈیرہ تھا۔ پاشا نے ضروری ہدایات کے بعد دو کمانڈوز اور حیات کے ساتھ گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیا۔ خلاف توقع کوئی چھل پہل نہیں تھی، لیکن یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی۔

"محمد حیات تم اندر داخل ہو کر ہمیں اشارہ کرو گے" پاشا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا فوراً چھوٹا پٹ آہستگی سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کم و بیش ایک ایکڑ پر مشتمل ڈیرے کے کچے صحن میں ٹاہلی کیکر اور نیم کے درخت نظر آ رہے تھے، سامنے دو کچے کمروں کے سامنے ایک ٹریکٹر کھڑا تھا۔ ایک کمرے کی پیشانی پر ایک بلب روشن تھا۔ اندر سے میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ماحول کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر سر باہر نکالتے ہوئے "اوکے" کا سگنل دے دیا۔ چند لمحوں بعد وہ اندر داخل ہو کر کمروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مختلف جگہوں پر درختوں کی آڑ بہت کام آ رہی تھی۔ پاشا نے دوسرے دو کمانڈوز کو بھی بلا لیا، جبکہ اکرام بدستور ڈیرے کے عقب میں موجود تھا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دروازوں کے سامنے پہنچ گئے۔ میوزک کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ پاشا نے کمرے کی خستہ سی کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اچھو گجر کو اس نے فوراً پہچان لیا۔ کمرے میں بلب روشن تھا۔ سامنے ایک ٹیبل پر ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر چل رہا تھا۔ کسی بیہودہ سے گانے کی ویڈیو میں نیم عریاں انڈین لڑکی رقص کر رہی تھی۔ کمرے میں اکلوتی چارپائی پر ایک جواں سال خوبرو نیم برہنہ لڑکی نیم دراز تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کھردرے نقوش کا حامل لمبا تڑنگا اچھو گجر اپنی ہوس کی تسکین کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھا۔ دوسرے کمرے کے سامنے پاشا کے ساتھی مستعد کھڑے تھے۔ ان کی انگلیاں گن کی لبلبی پر تھیں۔ اچھو لڑکی کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ وہ بے بس پرندے کی طرح چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ حتی المقدور مزاحمت کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ لیکن درندہ صفت اچھو اپنی دھن میں مگن تھا۔ پاشا نے رائفل کی نال ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے سوراخ میں رکھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے شیطانی عمل کی تکمیل کرتا اس نے نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ اچھو کی بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ ساتھ ہی لڑکی کی چیخیں بھی گونج رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ چارپائی پر لہو میں لت پت اچھو کی لاش عبرت کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کے پورے وجود کو چھلنی

کردیا تھا۔ بالخصوص اس کے سر کا آدھا حصہ اڑ گیا تھا۔ اب سے کچھ دیر پہلے وہ لمحہ موت سے بے خبر ایک مجبور لڑکی کے جسم کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ قدرت کی لاٹھی اس طرح ہی حرکت میں آتی ہے۔ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ خاصی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ چارپائی کے سرہانے اچھو کی جدید آٹو میٹک رائفل پڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً دوسرے کمرے میں بھی فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

''کون ہو تم''

پاشا نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''مم۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے بمشکل کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ بدستور نرم لہجے میں بولا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اچھو کی لاش کو گھور رہی تھی۔ اس کا خون بہہ کر کمرے کی کچی زمین پر پھیل رہا تھا۔

''میں جمال پور میں ہی رہتی ہوں تھانیدار صاحب''

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آج شام ان کتوں نے مجھے اغوا کرلیا۔ میرا باپ کیا کرے گا۔ وہ تو مر جائے گا''

اس نے نفرت سے اچھو کی لاش پر تھوک دیا۔

اس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ جمال پور کے رہائشی احسان الٰہی کی اکلوتی بیٹی ہے۔ طافو اور اچھو کی اس پر کئی دنوں سے نظر تھی۔ آج شام کے اندھیرے میں وہ جونہی ان کی گاڑی کے پاس سے گزری انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ دوسرے کمرے میں طافو کے علاوہ اچھو کے تین ساتھی بھی مارے جاچکے تھے۔ انہیں مزاحمت یا جوابی کارروائی کا موقع بھی نہیں ملا۔

لڑکی نے اپنا نام زرینہ بتایا تھا۔ پاشا کی ہدایت پر لڑکی کی ڈیرے میں موجودگی کو راز میں رکھا گیا، اور اسے خاموشی سے ایک اہلکار کے ساتھ پولیس موبائل میں پہنچا دیا گیا۔ حیات محمد دوسرے کمرے میں بکھری ہوئی لاشوں کے پاس کھڑا تھا۔ اسی لمحے پاشا اندر داخل ہوا۔ انتہائی تیزی سے اس نے ایک مردار مجرم کی گن اٹھائی اور محمد حیات کو چھلنی کردیا۔ حیرت و بے یقینی سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ زمین پر گرا اور چند لمحے تڑپ کر ساکت ہوگیا۔ اسپیشل فورس کے جوان کمرے سے باہر پورے ڈیرے کی تلاشی میں مصروف تھے۔ انہیں یہاں سے کافی اسلحہ اور منشیات کا سامان ملا تھا۔

پاشا نے انہیں بتایا کہ حیات محمد مجرموں کی جوابی فائرنگ سے مارا گیا ہے۔ اکرام بھٹی نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد اچھو اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر زبان زدِ خاص و عام ہوگئی۔ نیوز چینل پر خبر چل رہی تھی۔ ''پولیس مقابلے میں بدنام زمانہ اشتہاری مجرم اچھو کی عبرت ناک ہلاکت۔ پولیس کا ایک فرض شناس اہلکار حیات محمد بھی شہید۔۔۔''

......☆☆☆......

مدرسہ راہبر انسانیت کے زیرِ زمین تہہ خانہ کافی کشادہ اور تمام تر سہولیات سے آراستہ تھا۔ ٹھٹھہ آپریشن کا سنتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آکر زیرِ زمین روپوش ہوگئے تھے۔ لکڑیوں کے اسٹور سے چھوٹا سا دروازہ تہہ خانے کی طرف کھلتا تھا۔ کیپٹن اور اس کے ساتھی اگر ذرا سا تردد کرلیتے تو یہ خفیہ دروازہ دریافت ہوسکتا تھا، لیکن اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا کہ لکڑیوں کے ڈھیر کے نیچے اسٹور نما مختصر سے کمرے میں چور دروازہ بھی ہوسکتا ہے۔ ٹھٹھہ آپریشن میں مولانا عبیداللہ جو کہ اسلامی نام سے پاکستان میں عرصہ طویل سے رہ رہا تھا اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت نے ڈین نیلسن کو جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ گویا اس کے قصرِ فرعونیت کی دیواروں میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ کیتھی برنارڈ بھی تلملا رہی تھی۔ ان کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔ پاکستان میں ان کے تمام سہولت کار فی الوقت بے بس نظر آرہے تھے۔ دو کمروں پر مشتمل تہہ خانہ بھی حقی کو چوہے دان لگ رہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق کسی غیر مرئی نکتے کو بڑی دیر سے گھور رہا تھا۔ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا قدوس بھی پریشان تھا۔ خفیہ ایجنسی کے لوگوں نے نام نہاد مدرسہ

سیل کر دیا تھا۔ عین ممکن ہے مزید تحقیق وتلاش کے بعد وہ تہہ خانے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ حقی کا پرسنل نمبر آن تھا اور وہ مختلف بااثر لوگوں سے رابطے میں تھا۔

فوزیہ، قیصر، ارشی اور کاشف دوسرے کمرے میں تھے۔ دونوں کمروں میں حسبِ ضرورت مختصر سامان موجود تھا۔ بیڈ صوفے اور فریزر کے علاوہ اشیائے خورد ونوش بھی مناسب مقدار میں دستیاب تھیں۔ ایک چھوٹا سا کچن اور ایک کمرے میں اٹیچ باتھ کی سہولت بھی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟''

قیصر نے تشویش زدہ لہجے میں ارشی اور فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''ہم بری طرح پھنس گئے ہیں اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ یہ وطن دشمن لوگ ہیں۔''

''صورت حال جو بھی ہے ہم سب دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔'' ارشی نے محتاط لہجے میں گویا سرگوشی کی، لیکن اب اگر یہاں سے نکلنا ہے تو ان لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگی۔ یہی راستہ ہے۔''

''پتہ نہیں یہ لوگ کب سے ہمارے ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں'' ہمی میں رہ کر ہمی کو مار رہے ہیں۔''

فوزیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''فوزیہ صاحبہ آپ تو عرصہ طویل سے ان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ آپ تو کچھ جانتی ہوں گی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کیا کر رہے ہیں؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟''

''یہی جاننے کیلئے تو میں ان کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں لیکن فی الوقت یہ بحث غیر ضروری ہے'' اس کے لہجے میں سنجیدگی بدستور برقرار تھی۔ ''ایک بار یہاں سے نکل جائیں باقی پلان بعد میں بنائیں گے۔''

''اس چوہے دان سے نکلنے کا ہی تو مسئلہ ہے۔'' کاشف نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر۔۔ اللہ سے نیک امید ہی رکھنی چاہیے۔ وہ بہترین مسبب الاسباب ہے۔''

''بے فکر رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جانتی ہوں یہ لوگ بہت پاورفل ہیں۔ ان کے سورسز وسائل اور نیٹ ورک ہم لوگوں کی سوچ سے بھی کہیں آگے ہے۔'' ارشی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ یہاں یوں ہی نہیں رہ رہے۔ پاکستان کے اعلیٰ عہدیداروں سیاستدانوں اور افسرانِ بالا کا مکمل تعاون ان کے ساتھ ہے۔ بس ذرا انتظار کرو۔''

ارشی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ حالات کی اس قدر کشیدگی کے باوجود حقی خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا لوگوں سے رابطے کر رہا تھا۔

''لنگڑیال۔۔۔ اتنا پیسہ ہم نے اتنے سالوں میں نہیں دیا جتنا اب تمہیں دیا جائے گا'' وہ سیل فون پر ہاشم لنگڑیال سے بات کر رہا تھا۔ ''ہم مدرسے کے تہہ خانے میں چھپے بیٹھے ہیں۔ مدرسے سے آرمی کو ہٹا کر کوئی اپنے ہاتھ کا پولیس آفیسر بھیجو۔ ہم یہاں سے باآسانی نکل جائیں گے۔''

''دیکھیے جناب آپ کو کچھ صبر اور انتظار کرنا ہوگا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''مدرسے میں ہونے والی خون ریزی نے خفیہ ایجنسیز کو متحرک کر دیا ہے۔ پولیس اور آرمی بھی، ان ایکشن ہے۔''

''طوطا چشمی کی کوشش نہ کرنا لنگڑیال'' وہ پھنکار کر بولا۔ ''ہمیں کچھ ہوا تو تمہاری نسلیں نابود ہو جائیں گی۔ اس کا اندازہ تم جہان پور اور احمد مارکیٹ بلاسٹ سے کر سکتے ہو۔ امجد عالم چٹھہ بھی بہت پھدک رہا تھا۔ ہم نے اسے مچھر کی طرح مسل کے رکھ دیا۔''

یہی وہ وقت تھا جب فوزیہ، حقی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سانحہ جہان پور اور احمد مارکیٹ میں خون کی ہولی کے محرکات کیا تھے؟ اس نے حقی کی زبانی سن لیا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلے مناظر اسے نمی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ سانس روکے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''حقی صاحب۔ سرڈین نیلسن سے میری بات ہو چکی ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔ بس موقع کا انتظار ہے۔''

دوسری طرف سے لنگڑیال منمنا رہا تھا۔ ''اور جناب پلیز کال پر ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور۔۔۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میری کال ٹریس نہیں ہو سکتی اور ہاں یہ انسپکٹر پاشا کب کام آئے گا؟'' حقی نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔ ''اسے کھوڈالرز گننا آسان ہیں لیکن ڈالر دینے والوں سے مخالفت مول لینا موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔''

''او جناب وہ آپ کا ہی وفادار ہے'' دوسری طرف سے وضاحت کی گئی۔ ''اس نے افسرانِ بالا کا اعتماد حاصل کر رکھا ہے، اور یہی اعتماد آپ کے اور ہمارے بہت کام آرہا ہے۔ میں اپنے سورسز استعمال کر کے پاشا کو مدرسے کی طرف بھجواتا ہوں۔''

مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد کال منقطع گئی۔

امید کی کرن نے حقی کو مطمئن کر دیا تھا۔ فوزیہ آہستگی سے واپس پلٹ گئی۔ دوسری طرف سے کیا باتیں ہوئیں یہ تو وہ نہیں سن پائی لیکن حقی کی باتوں نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور اپنے پرسنل سیل فون سے ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''ان کا کیا کرنا ہے؟'' دوسرے کمرے میں قدوس حقی سے استفسار کر رہا تھا۔ اس کا واضح اشارہ ارشی اور اس کے ساتھیوں کی طرف تھا۔

''یہ اب ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہاں سے نکلتے ہی انہیں ٹھکانے لگا دینا۔'' حقی نے سفاک لہجے میں پھنکار کر کہا۔ ''اب نیا نیٹ ورک اور نئے لوگ درکار ہوں گے۔''

''جی بہتر۔'' اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اسی لمحے اس کی سماعتوں سے فوزیہ کی آواز ٹکرائی۔

''ہیلو یہ میرا نیو نمبر ہے۔ میں حقی اور قدوس کے ساتھ ہوں ہم اس وقت۔۔۔''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی۔ قدوس پستول نکال کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نال کا رخ فوزیہ کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک سماعت شکن دھماکے کے ساتھ فوزیہ کی چیخ بلند ہوئی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے نیچے گرا اور بند ہو گیا۔

ان میں سے صرف کاشف کے پاس پستول تھا۔ جبکہ قیصر اور ارشی نہتے تھے، اور قدوس کو گھور رہے تھے۔ فوزیہ دیوار کے ساتھ کھڑی نیچے پڑے سیل فون کو گھور رہی تھی۔ گولی اس کے پاس سے ہوتی ہوئی آگے گزر گئی تھی۔ سامنے پختہ دیوار میں شگاف نظر آرہا تھا۔ حقی بوکھلایا ہوا کمرے میں پہنچا اور بولا۔

''کیا ہوا؟''

اس کے ہاتھ میں خطرناک پستول کی مہیب نال کا رخ ان چاروں کی طرف تھا۔

''حقی صاحب یہ کسی کو کال کر کے انفارمیشن دے رہی تھی۔'' قدوس آہستگی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے غرایا۔

''مجھے اس پر کئی دنوں سے شبہ تھا۔'' حقی نے لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا ''اور یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے، یقیناً سب اس کا کیا دھرا ہے۔''

اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور لبلبی دبا دی۔ اسی لمحے فوزیہ ہوا میں اچھلی، لیکن وہ گولی کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں تھی۔ سرسراتی ہوئی گولی اس کے پہلو میں اتر گئی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ نیچے گری۔ اس کا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بیہوش ہو گئی۔ کاشف اور قیصر اچانک متحرک ہوئے۔ قدوس کی چلائی ہوئی گولی کاشف کے سر میں اتر گئی۔ اک بھیانک چیخ کے ساتھ وہ پشت کے بل پیچھے گرا اور فوراً بے جان ہو گیا۔ ارشی کی فلک شگاف چیخیں ماحول کو لرزہ براندام کر رہی تھیں۔ قیصر ساکت ہو گیا تھا جبکہ فوزیہ بدستور بیہوش پڑی تھی۔

قیصر حقی کے پستول کی زد میں بے بس کھڑا کاشف کی لاش کو گھور رہا تھا۔

''اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی'' حقی نے مکروہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔'' یہاں سے نکلتے ہی ہم موت کا ایسا بازار سجائیں گے کہ تمہارے ملک کی بنیادیں تک ہل جائیں گی۔''

''حقی... یہاں سے نکلو گے تو ایسا کرو گے ناں...''

قیصر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''تم نے بہت خون بہالیا۔اب تمہیں مہلت نہیں دی جائیگی۔''

''ٹھیک ہے اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے''

وہ پھنکار کر بولا۔''میں تب تک تمہیں زندہ رکھوں گا،جب تک تمہیں جہان پور اور احمد مارکیٹ جیسے اور مناظر نہ دکھالوں۔''

کچھ دیر بعد قدوس نے پیراشوٹ کی مضبوط رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے دست و پا کر دیا۔

فوزیہ کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔اسے باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ وہ دم بہ دم موت کی سرحد عبور کر رہی تھی۔ارشی پر سکتہ سا طاری تھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کاشف کی لاش کو دیکھے جا رہی تھی۔قدوس نے اسے بے ہوش کر کے دوسرے کمرے میں یخ بستہ فرش پر پھینک دیا۔محافظ کے خفیہ مجاہد پاشا کے پہنچتے ہی وہاں سے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

☆☆☆

نور اور حور کیلئے محمد حیات کی مرگ ناگہانی قیامت سے کم نہیں تھی۔نور کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔تکفین سے لے کر تدفین تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میت کو گھورتی رہی تھی۔اس کی آنکھوں کے سوتے گویا خشک ہو گئے تھے۔پتھرائی ہوئی آنکھوں میں کرب و ملال اور حیرت و بے یقینی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔حور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔اس کی دلخراش چیخوں نے ہر دل کو دہلا کے رکھ دیا۔انسپکٹر اور دیگر سرکاری افسران نے بھی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔شام تک مہمان رخصت ہو گئے۔چند ایک قریبی اعزا رک گئے تھے۔نور بدستور چپ چاپ اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹی غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔مرد کے بغیر گھر کی حالت کیا ہوتی ہے انہیں پہلے دن ہی اندازہ ہو گیا تھا،لیکن وقت بڑے بڑے زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔یہ خود ہی زخم دیتا ہے خود ہی مسیحائی کرتا ہے۔یہی قدرت اور فطرت کا قانون ہے۔سانحہ صدمہ جیسا بھی ہو جتنا بھی بڑا ہو۔حوصلہ نہ بھی ہو تو حوصلہ رکھنا پڑتا ہے۔اللہ جتنا بڑا دکھ دیتا ہے اس سے زیادہ حوصلہ بھی دیتا ہے۔

حور نے آہستگی سے ماں کے کمرے میں قدم رکھا۔وہ حزن و ملال کی تصویر بنی چھت کو گھور رہی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا اماں'' وہ ماں کے سینے پر لیٹتے ہوئے بھرائی آواز میں بولی۔''ایک ہی پل میں ہم چھت سے محروم ہو گئے۔'' اس نے نمناک نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

وہ پتھرائی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔اچانک اس کے خشک لب متحرک ہوئے۔وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی،لیکن لفظ اس کی دسترس میں نہیں تھے۔اس کا جسم لرز رہا تھا۔بے ساختہ اس کا دایاں ہاتھ متحرک ہوا۔وہ اپنی نحیف انگلیاں حور کے بالوں میں پھیرنے لگی۔چشم خیال میں محمد حیات اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔وہ سرتاپا سفید کفن میں ملبوس تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کفن خون آلود ہو گیا۔

''نور...'' اس نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔''میں نے حق کے راستے میں جان دی ہے۔تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میرے کردار اور فرض کے دامن پر کوئی بدنما داغ نہیں ہے،جو میرے بعد تمہارے اور حور کے لئے ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔''

اس کی پلکوں کے بند ٹوٹ گئے۔دشت کرب جل تھل ہونے لگا۔اس کے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں میں پھیل رہے تھے۔

''محمد حیات ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟''

اس نے کفن میں ملبوس اپنے سامنے کھڑے ہوئے محمد حیات سے کہا۔''ضمیر جاگا اور تم ابدی نیند سو گئے۔میں نے تو اپنے حصے کا جیون جی لیا،لیکن حور کا کیا ہو گا؟''

''نور یہ اللہ کے فیصلے ہیں،وہ اپنے بندے کو تنہا و بے آسرا نہیں چھوڑتا۔اس نے یقیناً حور کیلئے بھی سوچ رکھا ہے

ہوگا وہی جو لوحِ محفوظ پر ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔'' محمد حیات نے آہستگی سے کہا۔

اس کی تصویر اوجھل ہونے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ چشمِ تصور کے پردے سے غائب ہوگیا۔ حور ماں کے سینے پر پڑی رو رہی تھی۔ اچانک ایک سماعت شکن چیخ کے ساتھ نور اٹھی۔ اس نے بیٹی کو بانہوں کے حلقے میں لے لیا، اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے قرار سا آ گیا۔ اس کے دل کا بوجھ اتر گیا تھا۔

''حور میری بچی۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولی۔

''ہمیں دکھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں تو فخر کرنا چاہیے کہ ہم ایک شہید کی بیوی اور بیٹی ہیں۔''

نور نے برستی ہوئی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور ماں سے لپٹ گئی۔

ایک دو دن بعد مہمان الوداع ہوئے تو زندگی کا پہاڑ ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اللہ بہترین مسبب الاسباب ہے۔ ایک ٹاپ ٹین بدنام زمانہ اور انتہائی مطلوب مجرم اچھو گجر کے ہاتھوں مارے جانے پر حکومت نے محمد حیات کو دس لاکھ نقد انعام اور تمغۂ جرات بھی دیا۔ اس کے علاوہ اس کے واجبات بھی ادا کر دیے گئے۔ انسپکٹر پاشا نے اس کارروائی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اکرام بھٹی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ محمد حیات کو اپنے ہاتھوں سے مارنے میں پاشا کی کیا مصلحت یا مفاد تھا، تاہم فی الوقت وہ خاموش تھا۔ فطرتاً وہ ایک شریف اور نیک آدمی تھا۔ زندگی کی پینتالیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ دو بیٹے ایک بیٹی بیوی، خوبصورت گھر اچھی نوکری، زندگی اچھی بسر ہو رہی تھی۔ پاشا کا کردار اسے کھٹکتا تھا، لیکن اسے اپنی نوکری بچانی تھی۔ ہر کوئی اپنے تحفظات اور مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ زرینہ کو پاشا کے کہنے پر وہ اپنے گھر لے گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اچھو کے قبضے میں تھی۔ اس نے واپس اپنے ماں باپ کے گھر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اچھو گجر کی سرکوبی نے پاشا کو اور بھی معتبر اور مقبول کر دیا تھا، لیکن اکرام بھٹی مطمئن نہیں تھا۔ سونے کی بالیوں کے پس منظر میں اسے ان گنت لاشیں اور انسانی اجسام کے بکھرے ہوئے اعضا نظر آ رہے تھے۔ چشمِ تصور میں وہ سانحۂ جہان پور اور احمد مارکیٹ کے خونی مناظر دیکھ کر سر تا پا لرز جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زبان بندی میں ہی عافیت ہے ورنہ محمد حیات کی طرح اسے بھی ملکِ عدم بھیج دیا جاتا۔ کئی دن وہ ضبط سے کام لیتا رہا۔ احساس کے کچوکوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ اس نے انسانیت کو پس پشت رکھنے کی اپنی سی تمام کوشش کر ڈالی، لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ضمیر زندہ ہو تو احساس کو مرنے نہیں دیتا۔ وہ کشمکش کی سرحد پر پس و پیش میں مبتلا تھا۔

''کل کسی بلاسٹ یا خودکش حملے میں میرے بیوی بچے بھی مر سکتے ہیں۔'' اس نے سوچا اور اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ''نہیں مجھے ان کو بچانا ہوگا۔ پاشا یقیناً غدارِ وطن ہے۔ بھیڑ کی کھال میں چھپا بھیڑیا ہے۔ انسان نما درندہ ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔''

وہ ایک دم تہیہ کر کے اپنے بستر سے اٹھا۔ فجر کی اذان نے اس کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے پاس والی چارپائی پر محوِ خواب اپنی بیوی عابدہ کو دیکھا۔ اس کے بچے اپنے اپنے کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔ حرماں نصیب زرینہ بھی اس کی بیٹی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔

''حی الالفلاح۔'' موذن کی آواز میں داورِ محشر کا پیغام اس کے احساس پر حاوی ہو رہا تھا۔

'' چلے آؤ فلاح کی طرف'' اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے چارپائی کو چھوڑ دیا۔

''فلاح کا راستہ تو یہی ہے کہ انسانیت کی خدمت کی جائے۔ حق کا ساتھ دیا جائے۔ باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی اپنی سی کوشش تو کی جائے۔''

اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ سوچوں کے گھمسان میں اس نے یخ بستہ پانی سے وضو کیا، اور بارگاہِ ربوبیت میں سجدہ ریز ہوگیا۔

نماز اور دعا کے بعد وہ بہت دیر تک جائے نماز پر بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا وجود جذبوں اور ولولوں سے

بھر گیا۔ موت کا خوف کسی کنج میں جا کر روپوش ہو گیا۔

''اکرام ۔۔۔ زندگی جتنی بھی طویل ہو انجام موت ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''جب اللہ فلاح کے راستے پر بلا رہا ہے، تو دیر کیوں کر رہے ہو۔ اتنی دیر نہ کرو کہ جہان پور اور احمد مارکیٹ کے معصوم لوگوں کا خون تمہارے دامن کو داغدار کر دے۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی بیوی بچے بھی جاگ گئے تھے۔ دو بیٹے بالترتیب نویں دسویں کلاس میں تھے، جبکہ اس کی بیٹی فرح فرسٹ ایئر کا ایگزام دے رہی تھی۔ اسے ان بچوں کو بچانا تھا۔ آزمائش کا راستہ سہل نہیں ہوتا، لیکن اس کا اجر بہت عظیم ہوتا ہے۔

''محمد حیات ۔۔۔ یار تم تو سرخرو ٹھہرے۔''

اس نے انجہانی دوست کو مخاطب کیا۔ ''تم نے حق کا پرچار کیا اور جان دے دی۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ پاشا نے تمہیں کیوں مارا۔''

لرزتے بدن کے ساتھ وہ دوبارہ محوِ دعا ہو گیا۔

''میرے اللہ مجھے استقامت عطا کرنا۔ میں وقت کے یزیدوں کے سامنے سینہ سپر ہونے جا رہا ہوں۔ مجھے کربلا والوں سا عزم و حوصلہ بخش دو۔ جنہوں نے قلیل تعداد میں کثیر دشمن کا مقابلہ کیا اور انہیں شکستِ فاش سے دوچار کر دیا۔''

سپیدہ سحر کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد بچے اسکول چلے گئے۔ اس نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔ غم کی تصویر زرینہ کو حسرتناک نظروں سے دیکھا اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ محمد حیات کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نور اور حور ضبط کے باوجود اندر سے ٹوٹ رہی تھیں۔ اس گھر کی ایک ایک چیز سے، ایک ایک اینٹ سے محمد حیات کی یادیں وابستہ تھیں، لیکن اس تلخ و سفاک حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ اب وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اپنے فرض پر قربان ہوا تھا اور اکرام بھٹی پر قرض چڑھا گیا تھا۔ اب اسے یہ قرض چکانا تھا اور وہ اس کیلئے تیار تھا۔ نور اور حور اسے مل کر آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ دل کے بستر پر سویا ہوا حزن و ملال کروٹ لے کر بیدار ہو گیا۔

''حور بیٹی مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے''

اس نے اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھی ہوئی حور کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ نور کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ ''لیکن تمہیں حوصلے سے کام لینا ہو گا ہم صرف محمد حیات کے ہی نہیں بلکہ سیکڑوں معصوم لوگوں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔''

اس نے تڑپ کر اسے دیکھا، اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کک کیا کہہ رہے ہو اکرام چاچا۔ ابا تو ڈاکوؤں سے مقابلے میں شہید ہوا ہے۔''

''وہ شہید ہی ہوا ہے حور بیٹی'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اسے ڈاکوؤں نے نہیں مارا۔''

اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ساری کہانی سن چکی تھی۔ خلاف توقع اس نے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''چاچا میں تمہارے ساتھ ہوں'' اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے بے گناہ باپ اور دیگر معصوم لوگوں کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گی۔''

دروازے پر ہلکی سی چاپ نے انہیں متوجہ کیا۔ نور چائے کے دو کپ ہاتھ میں پکڑے دروازے میں کھڑی انہیں گھور رہی تھی۔ اس نے سب سن لیا تھا۔ چائے رکھ کر وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اکرام بھائی ہم اتنے طاقتور لوگوں کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ جو ہوا یہ ہمارے نصیب کا لکھا تھا۔ ہم پاشا جیسے شیطان صفت لوگوں سے ٹکر نہیں لے سکتے۔''

''نہیں اماں۔'' حور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''ہم باطل کا مقابلہ کریں گے۔ تم بس دعا کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

کچھ دیر کی بحث و گفتگو کے بعد وہ لائحہ عمل تیار کر چکے تھے۔ جس کا پہلا مرحلہ ایس پی زوار شاہ سے مل کر اسے سب کچھ بتانا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اکرام بھٹی کے ساتھ

ایک آٹو میں بیٹھی ایس پی آفس کی طرف جارہی تھی۔حق کے پرچار کیلئے وہ باطل کے مقابل سینہ سپر ہوچکے تھے۔

......☆☆☆......

وہ تہہ خانے میں کمرے کے یخ بستہ فرش پر بے دست وپا پڑا فوزیہ کو دیکھ رہا تھا۔اس کے پہلو سے خون کا اخراج اب بھی جاری تھا۔سرخ گاڑھا خون فرش پر پھیل کر جم رہا تھا۔اس کا سرخ وسفید رنگ لٹھے کی طرح ہورہا تھا۔لمحہ بہ لمحہ وہ زندگی کی بازی ہار رہی تھی۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔اس نے رسیوں میں جکڑے اپنے ہاتھ پاؤں پر نظر ڈالی،اور کسمسا کر رہ گیا۔پیراشوٹ کی رسیاں اس کی کلائیوں اور پنڈلیوں میں پیوست ہورہی تھیں۔وہ بہت زورآزمائی کرچکا تھا،لیکن نتیجہ صفر برآمد ہوا۔رسیوں کو مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔وہ اس کے سامنے بے حس وحرکت پڑی قطرہ قطرہ مررہی تھی۔اس کے سینے کے زیروبم سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہورہا تھا،لیکن اس کی سانسیں ڈوب رہی تھیں۔حقی اور قدوس اپنے کمرے میں یہاں سے نکلنے کی تیاری کررہے تھے۔انہوں نے بہت خطرناک لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ارشی کو مخصوص طریقے سے بیہوش کردیا گیا تھا۔

''یہاں سے نکلتے وقت اتنا بارود بچھا دینا کہ اس مدرسے کا نام ونشان تک نہ رہے'' اس نے قدوس کی طرف دیکھتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔''ہم کوئی نشان کوئی سراغ نہیں چھوڑیں گے،ورنہ ہماری بقا کی کشتی میں سوراخ ہوجائے گا۔''

''جی ضرور ایسا ہی ہوگا'' قدوس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔''لیکن مسئلہ تو یہاں سے نکلنے کا ہے جناب۔''

''اس کی فکر مت کرو'' اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔''ماہانہ لاکھوں ڈالر کھانے والے،آج وفاداری کا ثبوت دینے کی سرتوڑ کوشش کریں گے۔پاشا کے آتے ہی راستہ صاف ہوجائے گا۔''

لیکن وہ نادانستگی میں غلطی کرچکے تھے۔کاشف کی لاش کے پاس فوزیہ کا سیل فون قیصر کی نظر میں تھا۔قدوس افراتفری میں سیل فون اٹھانا بھول گیا تھا۔وقت بہت کم تھا۔دھیرے دھیرے موت کے سائے گہرے ہونے لگے۔

''ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہوگا'' قیصر نے زیرلب کہا اور اپنے پابندِ رسن وجود کو گھسیٹتا ہوا بے سدھ فوزیہ کی طرف بڑھنے لگا۔پورے فرش پر کاشف اور فوزیہ کا خون جم کر احتجاج کررہا تھا۔چند لمحوں بعد وہ نیم بے ہوش فوزیہ کے قریب پہنچ گیا۔اسے کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ ایسے عالم میں اسے کیسے ہوش میں لایا جائے۔

اس نے فوزیہ کے پہلو کے زخم کا جائزہ لیا۔زخم زیادہ گہرا نہیں تھا،تاہم خون کا اخراج اب بھی جاری تھا۔

بمشکل اس نے اپنے لبوں سے اس کی گردن کو چھوا۔زندگی کی رمق تھی لیکن ماند پڑرہی تھی۔

''میرے اللہ میری مدد فرما۔''

اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔عجیب صورتِ حال تھی۔معاً اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔وہ بدقت سیدھا ہوکر بیٹھا اور دوسری طرف گھوم گیا۔اب اس کے ہاتھ فوزیہ کو چھوسکتے تھے۔وہ بندھے ہاتھوں سے اسے آہستگی سے جھنجوڑنے لگا،لیکن اس کا بے سدھ وجود متحرک نہیں ہوا۔وہ کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔دوسرے کمرے سے کھسر پھسر کی آوازیں آرہی تھیں۔وہ لوگ سیل فون پر کسی سے بات کررہے تھے۔کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے ہوئے مرنا بہتر تھا۔اس نے اپنی کوشش تیز کردی،لیکن فوزیہ کے بے حس وحرکت وجود نے حرکت نہیں کی۔وہ دوبارہ اس کی طرف گھوم گیا۔

''فوزیہ!'' اس نے لب اس کے کان کے قریب کرکے اسے آہستگی سے پکارا۔''تمہیں اللہ کا واسطہ ہوش میں آجاؤ۔مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے جھنجلا کر کہا اور کمرے میں کاشف کے نیفے میں اڑسے ہوئے خون آلودہ پستول کو دیکھنے لگا۔بے بسی کا احساس فزوں تر ہورہا تھا۔اس کے سامنے سیل فون اور پستول پڑا تھا۔دشمن کچھ دیر کے لئے غافل تھا اور یہ چند لمحے ان کی زندگی کی ضمانت تھے۔وطنِ عزیز کی سالمیت وسلامتی کیلئے

یہ چند لمحے بہت اہم تھے۔اس نے بدقت تمام فوزیہ کے یخ بستہ ہاتھ کو لبوں سے چھوا۔زندگی کی حرارت ماند پڑ رہی تھ۔سانسوں کا تسلسل ٹوٹ رہا تھا۔اس تسلسل کا قائم رہنا ازحد ضروری تھا۔اچانک اسے کسی مووی میں دیکھا ہوا ایک منظر یاد آ گیا۔ایک جھٹکے سے وہ اس کے اوپر جھکا اور اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیے۔وہ اسے تیزی سے آکسیجن دینے لگا۔اس کی یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔وہ کسمسانے لگی۔اس نے سانسوں کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا۔وہ مسلسل اسے سانسوں کی حرارت دے رہا تھا۔چند ہی لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔وہ ذرا پیچھے ہٹ کر اسے پرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔وہ دھیرے دھیرے کراہ رہی تھی۔اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہونے لگیں۔وہ فوراً متحرک ہوا اور اس کے اوپر ڈھے سا گیا۔اس نے دوبارہ اس کے لبوں پر اپنے لب رکھے،اور اس کی ڈوبتی ہوئی سانسیں بحال کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔یہ عمل کارگر ثابت ہوا۔وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے پلکیں جھپکانے لگی۔

اس نے اپنے پہلو کے زخم پر ہاتھ رکھا اور کراہ اٹھی۔

''فوزیہ....''اس نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

''جلدی کرو ذرا ہمت سے کام لو۔میرے ہاتھ کھول دو وقت بہت کم ہے۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن درد کی شدت نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔وہ بے دم ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

''قے قے...قیس قیصر...''اس نے بمشکل کہا اور اسے بوجھل پلکوں سے دیکھنے لگی''مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ تمہاری رسیاں کھولوں''اس نے یہ چند الفاظ بڑی مشکل سے ادا کیے۔

''میرے ہاتھ بے جان ہو رہے ہیں۔میں مر رہی ہوں''

''نہیں''وہ جلدی سے بولا۔''تمہیں ہمت سے کام لینا ہو گا۔اپنے وطن کیلئے،اپنے لئے،اپنی قوم کے لئے۔''

وہ بمشکل اپنے دونوں ہاتھ اس کی بندھی ہوئی کلائیوں تک لائی۔اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔جسم کپکپا رہا تھا سردی اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔اس نے انتہائی کوشش کے بعد پیراشوٹ کی رسیوں کو پکڑا۔گانٹھیں بہت مضبوط تھیں،اس نے اس کے ہاتھ کھینچ کر اپنے منہ کے قریب کر لیے اور دانتوں سے گانٹھیں کھولنے لگی۔یہ حربہ کامیاب رہا۔چند لمحوں بعد قیصر کے ہاتھ آزاد تھے۔وہ برق رفتاری سے متحرک ہو گیا۔اس نے جلدی سے اپنے پاؤں آزاد کیے اور دوبارہ بیہوش ہوتی ہوئی فوزیہ کو دیکھنے لگا۔اس کی پلکیں اس کی آنکھوں کے در بند ہو رہے تھے۔انتہائی سرعت سے اس نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ہلکی سی کراہ کے ساتھ اس نے آنکھیں کھول دیں۔وہ اسے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میری فکر چھوڑو۔تم یہاں سے نکل جاؤ۔میں نہیں بچ پاؤں گی۔''

''ایسا مت کہو۔تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔''

اس نے بے ساختہ اسے باہوں میں بھینچ لیا۔وہ کراہ اٹھی۔اس کے پہلو کا زخم احتجاج کر رہا تھا۔اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔اسے بیڈ پر ایک چادر پڑی نظر آئی۔اس نے چادر کو پھاڑ کر لمبی سی پٹی بنائی اور اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر باندھ دیا۔چند لمحوں بعد خون کا اخراج رک گیا۔وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھی،لیکن سردی سے اس کا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔درد بدستور اسی طرح تھا۔اس نے بقیہ چادر اس کے جسم پر ڈال دی۔اس نے کاشف کی لاش کے پاس پڑا ہوا پستول اور سیل فون اٹھایا۔گرین بٹن دباتے ہی سیل فون اون ہوا لیکن فوراً ہی بند ہو گیا۔اس نے سیل فون جیب میں رکھا،اور پستول ہاتھ میں پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

فوزیہ اسے پرامید نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پاشا نفری کے ساتھ مدرسے میں داخل ہو گیا تھا۔میڈیا والوں کو فی الوقت دور رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔مدرسے کے گیٹ پر لوگوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔

پاشا حقی سے مسلسل رابطے میں تھا۔اسے تہہ خانے کی لوکیشن سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔وہ اپنے دو اہلکاروں کے ساتھ لکڑیوں کے اسٹور کی طرف بڑھ رہا تھا۔کچھ دیر بعد لکڑیاں باہر نکال دی گئیں۔لکڑی کا تختہ ہٹا کر وہ

سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔
ارشی حقی کے کمرے میں فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔قدوس اور حقی سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔
اسی لمحے قیصر پستول تانے کمرے میں داخل ہوا۔
"تم دونوں میرے نشانے پر ہو" اس نے گونج دار آواز میں کہا۔
وہ دونوں چونک کر اسے گھورنے لگے۔
اس سے پہلے کہ قدوس نیفے سے پستول نکالتا۔قیصر کی چلائی ہوئی گولی اس کی پیشانی میں اتر گئی۔
وہ مختصر سی چیخ کے ساتھ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا اور فوراً ساکت ہوگیا۔
ظلم بربریت اور سفاکیت کا ایک باب بند ہو چکا تھا۔
اسی لمحے ارشی تیزی سے اٹھی۔اس نے زوردار ٹھوکر حقی کے پیٹ میں ماری، لیکن وہ اس سے بھی زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔قیصر کو دوبارہ گولی چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا، کیونکہ حقی اور اس کے بیچ میں ارشی حائل تھی۔حقی نے تیزی سے خطرناک پستول نکالا، اور ارشی کے پیٹ پر رکھ دیا۔اسی لمحے پاشا پستول تانے اندر داخل ہوگیا۔
"خبردار کوئی حرکت نہ کرنا۔تم پولیس کی حراست میں ہو۔"
اس نے حقی اور قیصر کو گھورتے ہوئے کہا۔
"یہ بہت خطرناک لوگ ہیں انسپکٹر صاحب" قیصر نے پستول نیچے کرتے ہوئے کہا۔
"یہ یہودی ہے، اس نے حقی کی طرف اشارہ کیا، اور یہ جو مر گیا ہے یہ ہندو تھا۔اس کا نام ارجن ہے، اور آپ کے سامنے کھڑا ہوا یہ حقی دراصل جیک وارمر ہے۔"
"اور تم ان کے ساتھی ہو" پاشا نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
"تم سب پولیس کی حراست میں ہو۔یو آر انڈر اریسٹ۔"
چند لمحوں بعد مزید دو اہلکار کمرے میں داخل ہوئے۔حقی ارشی اور قیصر کو ہتھکڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔فوزیہ کو اٹھا کر باہر لے جایا جا رہا تھا، جو کہ دوبارہ بے ہوش ہوگئی تھی۔کچھ دیر بعد وہ تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔
قیصر کو پولیس موبائل میں بٹھا دیا گیا، جبکہ حقی منظر سے غائب تھا۔

☆☆☆......

چالیس سالہ خوبرو ایس پی زوار شاہ کا بیک گراؤنڈ بہت مضبوط تھا۔وہ گزشتہ ایک سال سے ضلع جہان پور میں تعینات تھا۔اس دوران اس نے جرائم کے خاتمے اور ٹاپ ٹین کریمنلز کی سرکوبی کے سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش اس کا نام سن کر دہل جاتے تھے۔وہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر تھا۔رشوت اور سفارش سے اسے چڑ تھی، یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر بااثر افراد اس سے نالاں رہتے تھے۔خاندانی لحاظ سے وہ ایک بااثر اور بہت بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔محکمہ پولیس میں وہ جذبہ خدمت انسانیت کے تحت شامل ہوا تھا، اور وہ اپنے فرائض کے سلسلے میں انتہائی محتاط اور ذمہ دار ثابت ہوا۔غربا کی دادرسی، مساکین کی مدد اور بے سہارا لوگوں کی خدمت اس کی اولین ترجیح تھی۔چند سال قبل اس کی شادی ہوئی تھی لیکن ابھی تک وہ نعمت اولاد سے محروم تھا۔اس کی جواں سال خوبرو بیوی مہوش اس کے ساتھ ہی رہتی تھی، جبکہ اس کے والدین اور دیگر بہن بھائی اپنے آبائی گاؤں فیض پور میں تھے۔اس وقت وہ ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، جب ایک اہلکار نے انسپکٹر پاشا کی آمد کی اطلاع دی۔
"اسے اندر بھیج دو" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔
چند لمحوں بعد پاشا سیلوٹ کرنے کے بعد اس کی اجازت سے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔زوار شاہ کو پاشا کے وسیع تعلقات کا اندازہ تھا، لیکن وہ اس بات سے قطعاً مرعوب نہیں تھا، کیونکہ پاشا انتہائی ذمہ دار اور ایکٹو آفیسر ثابت ہو رہا تھا۔اس نے افسران بالا کی نظروں میں اپنا کردار بہت مضبوط اور بے داغ بنا رکھا تھا۔جس میں وہ کامیاب بھی تھا۔
رسمی علیک سلیک کے بعد وہ تازہ کارروائیوں سے

متعلق گفتگو کرنے لگے۔

''اچھو گجر کی موت امن کا پیش خیمہ ہے۔ بلاشبہ تمہاری ہمت و جوان مردی قابلِ داد ہے پاشا''

زوار شاہ نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن بقول تمہارے اس میں محمد حیات کی بے جگری بھی اہم جزو ہے۔''

''جی سر۔'' وہ مودب لہجے میں بولا۔ ''محمد حیات نے بہادری کا مظاہرہ کیا تب ہی یہ معرکہ کامیابی سے ہمکنار ہوا۔''

''لیکن آج میں تم سے ایک اہم بات کرنے جا رہا ہوں پاشا''

اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''مدرسہ رہبرِ انسانیت میں جو کچھ ہوا، اور اس سے پہلے سانحہ جہان پور اور احمد مارکیٹ میں خودکش حملہ بہت بڑی کارروائیاں ہیں۔'' پاشا کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا لیکن اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔ ''اس سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے؟''

''سر۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولانا حقی کو اوپر سے آرڈر پر چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ اس کی گرفتاری سے ملک بھر میں فرقہ وارانہ فساد ہڑتالوں اور ریلیوں کا خدشہ تھا۔ فی الحال وہ منظر سے غائب ہے'' وہ اسے صورتِ حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ دوسرے تینوں مجرم قیصر ارشی اور فوزیہ پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔ فوزیہ بمشکل جانبر ہوئی ہے۔ اس کے والد مظہر زمان وسیع تعلقات کی ڈوریاں ہلا رہے ہیں لیکن سر میں انہیں کوئی لچک یا موقع نہیں دوں گا۔''

''ویری گڈ۔۔۔ لیکن حقی جہاں بھی ہے اسے فوراً ڈھونڈو وہ انتہائی مشکوک کردار ہے۔ مدرسے میں کھیلی گئی خون کی ہولی نے عوام کو مشتعل و مغموم اور افسرانِ بالا کو ہماری جانب متوجہ کر دیا ہے'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''طرح طرح کے سوال اٹھ رہے ہیں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ کیپٹن ارباز شیر خان کا خفیہ ادارہ، محافظ، تحقیق کر رہا ہے۔ ٹھٹھہ اور مدرسہ رہبرِ انسانیت میں انہوں نے ہی اٹیک کیا تھا۔ نتائج تمہارے سامنے ہیں۔''

''حیرت انگیز سر۔'' وہ پہلے سے ہی باخبر تھا تاہم اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ''اچھی بات ہے سر۔ ہم ان کے ساتھ کاندھا ملا کر چلیں گے اور شر پسند عناصر کو کچل کے رکھ دیں گے۔''

''ایک اور اطلاع بھی ہے میرے پاس۔'' زوار شاہ نے آہستگی سے کہا۔

''جہان پور کے بڑے چرچ کا پادری ڈیوڈ جونسن بھی مشکوک ہے۔ پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک غیر ملکی لڑکی کو بھی دیکھا گیا ہے اور اس کی آمد کے فوراً بعد ہی پے در پے خونی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جن میں امجد عالم چٹھہ کی ٹارگٹ کلنگ، اس کے مجمعے میں خودکش حملہ اور موبائل مارکیٹ میں بم بلاسٹ قابلِ ذکر ہیں۔ فی الوقت وہ لڑکی منظر سے غائب ہے۔ پہلی ہی فرصت میں ڈیوڈ کو اٹھا کر پوچھ تاچھ کرو۔''

''اوکے سر لیکن ڈیوڈ کی گرفتاری پر اس کی عیسائی برادری کا ردِعمل شدید ہوگا۔ ریلیاں اور احتجاجی جلوس بھی نکالے جائیں گے۔''

اس نے امکانات ظاہر کیے۔ ان گنت ان دیکھے خدشات اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ وہ ڈیوڈ کا نمک خوار اور سہولت کار تھا۔ ڈیوڈ جانسن جو کہ درحقیقت اسرائیلی ایجنٹ ڈین نیلسن تھا، اور اس کے ساتھ دیکھی جانے والی لڑکی کیتھی برنارڈ تھی۔ جس نے امجد عالم کی ٹارگٹ کلنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

''تم شاید کوئی خاص بات سوچ رہے ہو۔'' ایس پی نے اسے گہری سوچ میں مستغرق دیکھ کر استفسار کیا۔

''جی سر۔'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ''حالات بہت مخدوش اور گمبھیر ہیں۔ میں ڈیوڈ کے بارے میں سوچ رہا ہوں بہ ظاہر تو وہ ایک بے ضرر سا آدمی ہے۔''

''بہ ظاہر بہت کچھ بے ضرر لگتا ہے، لیکن کبھی کبھی بھیڑ کی کھال سے بھیڑیا بھی برآمد ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی اور ذہن چوکس رکھو۔ ان حالات میں کچھ بھی ممکن ہے۔'' اس نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہدایات جاری کیں۔ چند لمحوں بعد میٹنگ برخاست ہو چکی تھی۔

''او کے پاشا گیارہ بج رہے ہیں ساڑھے گیارہ بجے آئی جی صاحب کے ساتھ میٹنگ ہے۔ میں یہ تمام گفتگو وہاں دہراؤں گا۔تم اپنا کام جاری رکھو۔وش یو گڈ لک۔'' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے ہلکی سی دستک کے بعد ایک اہلکار اندر داخل ہوا۔

''سر۔۔۔اے ایس آئی اکرام بھٹی آپ سے ارجنٹ ملنا چاہتا ہے اس کے ساتھ محمد حیات شہید کی بیٹی بھی ہے۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

یکا یک پاشا کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔اس کے چہرے پر کئی رنگ آرہے تھے۔اس نے وز دیدہ نظروں سے زوار شاہ کی طرف دیکھا، جو کہ ایک بار پھر ریسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔

''میرے پاس صرف بیس منٹ ہیں اور میں نے آئی جی سے ملنا ہے۔انہیں یہاں عزت سے بٹھاؤ۔ میں ٹھیک دو بجے ان سے ملتا ہوں۔''

اس نے عجلت میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

پاشا کو کچھ قرار آ گیا تھا، لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اکرام بھٹی اور حور پری آخر ایس پی سے کیا بات کرنے آئے ہیں۔وسوسے اس کے ذہن پر دستک رہے تھے۔

''تمہارا بھی کچھ سوچنا پڑے گا اکرام بھٹی۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا ایس پی کے پیچھے باہر نکل گیا۔دفتر کے سامنے راہداری میں اکرام اور حور ایس پی سے سلام دعا کر رہے تھے۔حور کے حسن نے پاشا کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا، لیکن یہ حسن اس کے کیرئیر اور نوکری کیلئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔

''پاشا انہیں میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں واپس آ کر ان سے ملتا ہوں۔''

اس نے اسے ہدایات دیں اور اپنے اسپیشل کمانڈوز کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ایس پی کی ہدایت پر ان دونوں کو ایس پی آفس میں بٹھا دیا گیا۔یقیناً ایس پی سمجھ رہا تھا کہ معاملہ انتہائی اہم ہے اور یہی بات پاشا کو مضطرب و خوفزدہ کر رہی تھی۔وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے اکرام بھٹی کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے اکرام؟'' ایسی کیا ایمرجنسی پڑ گئی کہ تم اس لڑکی کو لے کر شاہ صاحب سے ملنے پہنچ گئے؟''

اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''پاشا صاحب۔۔۔یہ خود ہی سر۔۔۔سے ملنا چاہتی تھی۔میں تو اسے لیکر آیا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تمہارا لہجہ تمہاری تاویل کی نفی کر رہا ہے بھٹی۔''

اس نے ذو معنی لہجے میں کہا۔

''آپ کو کیا وہم ہو رہا ہے انسپکٹر صاحب۔۔۔؟''

اچانک حور نے کٹیلے لہجے میں کہا۔''ہم ایس پی صاحب سے ملنے آئے ہیں، اور ان سے کوئی بھی مل سکتا ہے۔اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

''اکرام۔۔۔اسے سمجھاؤ کہ بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے اور مجھے کوئی وہم کیوں ہونے لگا۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

''دو منٹ باہر آؤ اکرام''

اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اکرام بھٹی الجھی ہوئی نگاہوں سے حور کو دیکھتا ہوا آفس سے باہر نکل آیا۔حور کے من میں وسوسے اٹھ رہے تھے، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر باطل کے مقابل سینہ سپر ہو چکی تھی۔

''اکرام بھٹی۔۔۔تمہارا ضمیر اگر جاگ گیا ہے تو یاد رکھو تمہاری گھر واپسی تک تمہاری پوری فیملی ابدی نیند سو چکی ہوگی۔میری طاقت کا اندازہ تو تم کر ہی سکتے ہو'' اس نے راہداری میں اپنے سامنے کھڑے اکرام سے سفاک لہجے میں کہا۔''میں تمہیں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں کہ اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ پچھتانے کیلئے تمہیں ایک لمحہ بھی نہیں ملے گا۔میری ایک کال تمہیں بے اولاد اور رنڈوا کر دیگی۔'' وہ اسے قہرناک نظروں سے گھورتا ہوا رخصت ہوگیا۔

اس کی حالت۔۔۔کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، جیسی ہو رہی تھی۔دل کا پرندہ سینے کے قفس میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔لرزیدہ بدن کے ساتھ وہ حور کے سامنے

آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے چاچا، تم ٹھیک تو ہوناں؟"

وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں حور بیٹا۔ بس دل میں تکلیف سی ہو رہی ہے۔ تمہیں شاید پتہ نہیں میں دل کا مریض بھی ہوں۔ چلو پتر۔۔۔ ایس پی صاحب سے کل مل لیں گے۔"

اس نے حور کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سچ بتاؤ چاچا اصل بات کیا ہے؟ کہیں اس کمینے پاشا نے تو۔۔۔؟"

"ایک دم وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ تیورا کر نیچے گرا اور بیہوش ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پاشا نے کچھ ایسا ضرور کہا ہے جو اکرام بھٹی حواس باختہ اور خوفزدہ ہو گیا ہے۔ پولیس اہلکاروں نے فوراً اسے قریبی اسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کے دل پر شدید اٹیک ہوا تھا لیکن بروقت طبی امداد نے اسے بچا لیا تھا۔ حور کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔ اس نے اسپتال میں دیوار گیر کلاک پر وقت دیکھا۔ دو بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ اس نے اکیلے ہی ایس پی زوار شاہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ الوداعی نظروں سے اکرام بھٹی کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

......☆☆☆......

اس بار میٹنگ کا اہتمام شہر سے دور ہاشم لنگڑیال کے فارم ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ مذکورہ فارم ہاؤس شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر مین روڈ کے عین ساتھ واقع تھا۔ فارم ہاؤس سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہاشم لنگڑیال کا گاؤں تھا۔ مختصر سا فارم ہاؤس انتہائی خوبصورت اور جدید نقشے کے مطابق تیار کیا گیا تھا تین کمرے کوریڈور باتھ روم اور کچن کی سہولت بھی تھی۔ یہاں ہاشم کے مخصوص مہمان آتے تھے۔ ہر کمرا مکمل فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وسطی کمرے میں ایک بڑی سی ٹیبل کے اردگرد چار کرسیوں پر وہ تینوں براجمان تھے۔ کیتھی برنارڈ نے حلیہ تبدیل کر لیا تھا۔ اب اس نے سنہرے بال سیاہ کر لیے تھے۔ لینزز کی مدد سے اس کی آنکھیں بھی سیاہ ہو چکی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت کو نہایت مہارت سے گندمی رنگت میں تبدیل کر دیا گیا۔

سادہ سی بلیک شلوار قمیص میں وہ ایک عام سی دیہاتی لڑکی لگ رہی تھی۔ لیکن اس حلیے میں بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ مولانا حقی سفید شلوار قمیض اور بلیک واسکٹ میں ملبوس مختصری مونچھوں کے ساتھ ایک معزز آدمی نظر آ رہا تھا۔ جبکہ بگ باس ڈین نیلسن بھی شلوار قمیض میں ایک عام سادہ سا آدمی لگ رہا تھا۔ وہ تینوں میک اپ کے ماہر تھے۔ ضرورت کا ہر سامان ان کے پاس موجود تھا۔ ٹیبل پر ان کے سامنے ایک بریف کیس پڑا ہوا تھا۔ جس میں ان تمام لوگوں کی غیر اخلاقی ویڈیوز کی سی ڈیز تھیں جو کہ ان کے ساتھ کام کر رہے تھے، جن میں ارشی قیصر اور فوزیہ کی ماں سونیا زمان کے علاوہ ان گنت لوگوں کی کمزوریاں تھیں۔

ان تینوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی کے تاثرات واضح محسوس ہو رہے تھے۔ فارم ہاؤس میں ہاشم کے گن مین اور باورچی کے سوا تیسرا کوئی آدمی نہیں تھا۔ نصف ایکڑ پر مشتمل یہ فارم ہاؤس انتہائی خوبصورت تھا۔ صحن میں مخصوص گھاس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ پختہ چاردیواری پر مختلف انواع اقسام کے پھولوں کی گھنی بیلوں نے دیواروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کوریڈور کے سامنے جدید ماڈل لینڈ کروزر کھڑی تھی، جو کہ ہاشم کی ذاتی ملکیت تھی، لیکن فی الوقت وہ ڈین نیلسن کے استعمال میں تھی۔ گاڑی میں جدید ترین اور خطرناک اسلحے کا گویا ذخیرہ تھا۔ جن میں اے کے سینتالیس، کے ٹو سنائپر گن۔ بریٹا پستول۔ نشہ آور سپرے اور وہ مخصوص دوا جو کہ کسی کو بھی پلانے سے اس کے حواس مختل ہو جاتے ہیں، اور وہ تنویمی عمل کی حالت میں اشاروں پر ناچنے لگتا ہے۔

"لگتا ہے ہاشم لیٹ ہے۔" کیتھی اپنے سامنے والے کرسی پر براجمان ڈین نیلسن سے مخاطب تھی۔

"ہمم دراصل آج کل حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے ہیں کہ اس کا محتاط اور ہم سے لاتعلق رہنا ضروری ہو گیا ہے۔"

بگ باس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''ہم یہاں محفوظ ہیں اور مزید کچھ دن یہاں رہنا مجبوری ہی نہیں ضروری بھی ہے۔پولیس اور آرمی ہماری تاک میں ہے ذرا سی غلطی اور کوتاہی ہمیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں دے گی۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں سر''حقی نے تائیدی لہجے میں کہا۔

''گزشتہ چند دنوں میں کئی ایسے واقعات ہوچکے ہیں کہ پولیس اور آرمی کو متحرک ہونا پڑا ہے۔مدرسے کا واقعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔اگر پاشا کا تعاون نہ ہوتا تو میں بھی فوزیہ اور قیصر کے ساتھ پولیس کی تحویل میں ہوتا۔''

''جو کام نہ ہوا اس پر تبصرہ نہ کیا کرو جیک۔''نیلسن نے قدرے ناگواری سے کہا۔''اور یہ تو ابھی شروعات ہے۔دیکھتے جاؤ میں اس ملک میں موت کا ایسا بازار سجاؤں گا کہ لوگ مدتوں یاد رکھیں گے۔''

''سر ڈیوڈ جونسن کی حیثیت سے آپ مشکوک لوگوں کی لسٹ میں ہیں۔''حقی نے کہا۔

''ڈیوڈ جونسن مر گیا ہے،اور ڈین نیلسن کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔بس ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔نئے نیٹ ورک کیلئے نئے لوگوں کو ٹریس کرو۔اس کام میں کیتھی تمہاری معاونت کریگی۔''

اس نے کیتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو کہ کرسی سے اٹھ کر واش روم کی طرف جارہی تھی۔

اس نے زیرلب مسکرا کر سر کو تفہیمی جنبش دی اور اٹیچ باتھ کا دروازہ کھول کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔وہ دونوں چند لمحے بند دروازے کو گھورتے رہے نیلسن کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''سر۔۔۔یہ تعاون تو کرتی ہے لیکن رعب بہت جھاڑتی ہے،اور من مانی بھی کرتی ہے۔اس کے پر بہت مضبوط ہیں۔''

''احمق ہو تم''وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مکارانہ لہجے میں بولا۔

''اس کے بھی۔۔۔۔پر کاٹ کر اس بریف کیس میں رکھ دو''

اس نے ٹیبل پر پڑے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

''اوکے سر یہ،پر۔۔۔میں ابھی اور اسی وقت کاٹ دیتا ہوں۔''

اس نے مکروہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔اس کا رخ گاڑی کی طرف تھا جس میں وہ مخصوص دوا پڑی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ فریش ہوکر نیلسن کے سامنے بیٹھی تھی۔وہ اسے گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔اسی لمحے حقی کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔جس میں مشروب کے تین گلاس نظر آرہے تھے۔

اس نے نیلسن کے سامنے ایک گلاس رکھا،اور دوسرا گلاس کیتھی کے سامنے رکھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اپنا گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگایا۔

وہ مشروب کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے گہری سوچ میں مستغرق تھی۔پہلے گھونٹ پر مشروب کا تلخ سا ذائقہ اس نے محسوس کیا۔وہ ایک تربیت یافتہ اور تیز طرار ایجنٹ تھی ،اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھیوں کی نیت میں فتور آچکا ہے،لیکن اس نے شربت کا گلاس واپس نہیں رکھا۔وہ کسی ردعمل کا اظہار کیے بغیر شربت پیتی رہی حتیٰ کہ اس نے ختم کردیا۔

وہ دونوں اسے چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔وہ کرسی سے اٹھی۔اس نے ان دونوں کو مخمور نظروں سے دیکھا۔اس کے جسم میں عجیب سی حرارت سرایت کررہی تھی۔دوسرے ہی لمحے وہ واش روم میں داخل ہوگئی۔اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر خود کو دیکھا۔زیرلب مسکرائی اور اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔اس نے دو قطرے اپنے منہ میں ٹپکائے۔چند لمحوں بعد اس کے بپھرے ہوئے جذبات اعتدال پر آچکے تھے۔اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور آہستگی سے چلتی ہوئی واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''دشمن کو نقصان پہنچانا ہو،سلطنتوں کو فتح کرنا ہو تو آپس میں اتفاق اور نیک نیتی ضروری ہے''

وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولی۔''ہم بہت خاص مشن پر ہیں اور تم اپنی بدخصلتی کے

ہاتھوں مجبور ہو۔گویا سچ کہا جاتا ہے کہ یہودی کسی سے بھی مخلص نہیں ہوتے۔آج کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔آئندہ محتاط رہنا۔ورنہ میں وہ لوہے کا چنا ہوں جو تمہارے دانت بھی توڑ سکتا ہے۔''

اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ان دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا،اور کمرے سے باہر نکل گئی۔وہ ایک دوسرے کو خجل سی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھنے لگے۔

اسی طرح کی ایک میٹنگ محافظ سینٹر کے آفس میں بھی ہو رہی تھی۔کیپٹن ارباز کے سامنے والی کرسی پر کرنل وہاب صدیقی براجمان تھے۔دروازے پر غازی خان مستعد کھڑا تھا۔

''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کیپٹن ارباز کہ مدرسہ رہبرِ انسانیت میں خونریزی کے بعد آپ کا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا تھا۔'' کرنل نے کھردرے لہجے میں کہا۔''کیونکہ آپ نے دشمن کو قابو کرنے کی بجائے انہیں مشتعل کر دیا،جس سے انہوں نے معصوم بچوں اور مولوی صاحب پر فائرنگ کر دی۔بہر حال آپ ایک محب وطن اور دردمند انسان ہیں۔مجھے آپ کے فرائض سے شکایت نہیں۔آئندہ محتاط رہیے گا ورنہ بات اگر اوپر چلی گئی تو میں بھی کچھ نہیں کر پاؤں گا۔''

''لیس سر'' وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''مجھ احساس ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔''

''اٹس اوکے یہ بات دل پر نہ رکھیں۔آپ نے گزشتہ کچھ دنوں میں بہت اہم معرکے سرانجام دیے ہیں،یہی وجہ ہے کہ مجھے خود یہاں آنا پڑا ہے۔'' اس بار وہ قدرے نرم لہجے میں بولے۔

''یہ بات بھی کھل چکی ہے کہ حقی اور ڈیوڈ نیلسن مذہبی راہنما نہیں ،دہشت گرد ہیں۔وہ دشمن تنظیموں کے آلہ کار ہیں۔انہیں ہر حال میں ڈھونڈنا ہوگا۔قیصر فوزیہ اور ارشی کو بھی اپنی حراست میں لے کر ان سے پوچھ تاچھ کریں۔''

''سر۔۔۔قیصر فوزیہ اور ارشی ہمارے لیے کام کر رہے ہیں۔انہیں پولیس کی نگرانی میں بھی خطرہ ہے۔اگر آپ اجازت دیں تو انہیں محافظ سینٹر میں منتقل کر دیا جائے۔''

''او۔۔۔گڈ وہ بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔انہیں اپنی تحویل میں لے لیں،اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جب آپ لوگوں کو مدرسے کے تہہ خانے کا پتہ نہیں چل سکا تو انسپکٹر پاشا نے کیسے ڈھونڈ لیا۔اس سے بھی پوچھ تاچھ کریں۔''

کرنل نے اہم پوائنٹ نوٹ کیا تھا۔مزید فورس اسلحہ یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ میجر عنایت سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ہمیں ہر حال میں یہودیت کا یہ نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔حقی کا تربیتی کیمپ بھی توجہ کا حامل ہے۔

''سر۔۔۔تربیتی کیمپ خالی ہو چکا ہے اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

کیپٹن نے اٹھتے ہوئے کہا کیونکہ کرنل بھی کرسی سے اٹھ چکا تھا۔چند لمحوں بعد وہ رخصت ہو گیا۔

''غازی خان۔۔۔''

کیپٹن نے بلند آواز میں کہا۔''تیار ہو جاؤ ہم اسپتال جا رہے ہیں۔سب سے پہلے فوزیہ کو لے کر آنا ہے۔اور پھر ارشی اور قیصر کو بھی پاشا کی تحویل سے چھڑا کر یہاں لانا ہے۔''

''لیس سر'' غازی خان نے مستعد لہجے میں کہا۔

''سر۔اس کیلئے بہتر ہے کہ پاشا کی بجائے ایس پی زوار شاہ سے رابطہ کریں۔وہ انتہائی ایمان دار اور فرض شناس آفیسر ہیں۔''

چند لمحوں بعد کیپٹن ارباز شیر خان ایس پی زوار شاہ کا پرسنل نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆☆☆

آٹو رکشے میں بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی اس کی چھٹی حس نے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔رکشے والا ایک خوبرو جواں سال لڑکی کو دیکھتے ہی خوش ہو گیا تھا۔اس نے بنا بحث کیے ایس پی آفس جانے کی ہامی بھر لی اور چند ہی لمحوں بعد رکشہ اسپتال کی حدود سے نکل رہا تھا۔

''کتنی دیر لگے گی؟'' حور نے خاصی بلند آواز میں پوچھا۔

''بی بی پونے گھنٹے کا سفر ہے اور راستے سے پٹرول بھی ڈلوانا ہے۔'' آٹو والا بھی جواباً چلا کر بولا۔

کچھ دیر بعد وہ اسپتال والی سڑک سے نکل کر قدرے بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہ بنا سوچے سمجھے اسپتال سے نکل آئی تھی۔ اکرام بھٹی اب خطرے سے باہر تھا اور دوائیوں کے زیر اثر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پاشا نے اسے ایسا کچھ کہا ہے کہ فوراً ہی اس کے اعصاب جواب دے گئے اور حملہ سید ھا دل پر ہوا تھا۔ اب اسے پچھتاوے کے ساتھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا، کیونکہ ایک بلیک کلر ہنڈا سوک اسپتال سے مسلسل ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھاری مونچھوں اور کھردرے نقوش والا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا، جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بھی اسی کے جیسا ایک آدمی براجمان تھا۔ جس کی خطرناک نظریں آٹو پر مرکوز تھیں۔ حور نے متعدد مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کار مسلسل ان کے پیچھے آ رہی تھی۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے، لیکن یہ محض تعاقب نہیں تھا۔ ممکن ہے متعاقب لوگ اسے جان سے مارنا چاہتے ہوں، یا اغوا کرنا چاہتے ہوں۔ یہ سوچ کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ آٹو والا شیشے میں اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ اس کی اضطرابی کیفیت اور خوف کا اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ تیس پینتیس سالہ ایک دیہاتی ٹائپ آدمی تھا۔ حور کے بار ہا کار کو دیکھنے پر وہ سمجھ گیا کہ جو بھی معاملہ ہے متعاقب کار میں ہے۔ اس نے ریس بڑھائی اور آٹو ہوا سے باتیں کرنے لگا، لیکن جتنا بھی تیز رفتار ہوا تو رکشہ ہنڈا سوک کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔

اچانک اس نے آٹو ایک پٹرول پمپ کی طرف موڑ دیا۔ موٹر سائیکلوں اور کاروں کی مختصر سی قطار کے پیچھے اس نے آٹو روک دیا۔

''بی بی یہ کون لوگ ہیں جو ہمارا پیچھا کر رہے ہیں؟''
اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر آہستگی سے پوچھا۔

ہنڈا سوک ان کے عین پیچھے آ کر رک گئی۔

''یہ۔۔۔ یہ دشمن ہیں یہ مجھے مار دیں گے'' اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ''تم جلدی کرو یہاں سے نکلو''

وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ اس کے پاس سیل فون نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اسے ایس پی زوار شاہ کا سیل نمبر معلوم نہیں تھا۔

''بی بی میرے پاس موبائل فون ہے۔ آپ چاہیں تو کسی کو کال کر سکتی ہیں۔ پولیس کو یا۔۔۔''

''پولیس ہی تو پیچھے پڑی ہوئی ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''کیوں آپ نے کوئی جرم کیا ہے؟'' رکشے والا اسے تشکیک آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اسی لیے تو ایس پی سے ملنے جا رہی ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ فیول بھروا کر وہاں سے نکل چکے تھے۔ ہنڈا سوک بدستور ان کے عقب میں چلی آ رہی تھی۔ آٹو والا متفکر تھا، اور خوفزدہ بھی، اس نے اپنا نام امین بتایا تھا۔ مزید پانچ منٹ کے بعد ٹریفک کا ہجوم کم ہو گیا۔ اب متعاقب کار کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ گویا وہ فیصلہ کن انداز میں حملے کیلئے آٹو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ سڑک کے دائیں جانب ایک عظیم الشان پلازے پر پڑی۔ اس کی بلڈنگ میں متعدد دکانوں کی قطار میں اسے ایک بینک نظر آیا۔ جس کے سامنے ایک باوردی گن مین ٹہل رہا تھا۔ اس نے رسک لینے کا فیصلہ کیا، لیکن عمل درآمد سے پہلے ہی جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ آٹو کو عقب سے کار نے زوردار ٹکر ماری۔ امین اس افتاد کیلئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ آٹو رکشہ ایک شدید جھٹکے کے بعد بے قابو ہوا اور اس کا رخ بینک کی طرف ہو گیا۔ سامنے سیکورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے آٹو زور کے ساتھ اس سے ٹکرا گیا۔ وہ اچھل کر کئی فٹ پیچھے پشت کے بل نیچے گرا۔ آٹو بند ہو کر رک گیا۔ وہ چیختی ہوئی نیچے اتری اور بینک کی طرف بھاگی۔ امین اس کے پیچھے تھا۔ اسی لمحے عقب سے فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ اس نے ایک دلخراش چیخ سنی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اسے نہیں خبر تھی کہ کار سے کی گئی فائرنگ سے امین شدید زخمی ہو گیا ہے۔ لوگ جدھر منہ آیا ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس نے برق رفتاری سے بینک کا دروازہ کھولا، اور اندر گھس گئی۔ بینک اسٹاف صورت حال سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اچانک فائرنگ کی آواز دوبارہ گونجی،

اور بینک کے شیشے کا دروازہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔اسی لمحے ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی، لیکن یہ دوسری گن سے ہو رہی تھی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے پار دیکھا۔کار کی عقبی سیٹ والا آدمی کار کے دروازے کے پاس گر کر لہو میں لت پت ہو چکا تھا۔اس پر جوابی فائرنگ بینک کے سیکورٹی گارڈ نے کی تھی۔کار غرائی اور تیزی سے سڑک کی طرف بڑھتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بینک کا گارڈ زخمی تھا، لیکن اس نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی تھی۔امین زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔اس کی فوری طبی امداد کے لئے ایمبولینس کو فون کر دیا گیا تھا۔بینک منیجر نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی اور اب وہ خوف کی شدت سے کانپتی ہوئی حور کی طرف بڑھ رہا تھا۔وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

''تم ٹھیک ہوناں؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ خود کو سنبھال چکی تھی اور فرش سے اٹھ رہی تھی۔

''کون تھے یہ لوگ؟'' بینک منیجر نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''پپ پتہ نہیں'' وہ ہکلاتے ہوئے بمشکل بولی۔

''یہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔میں نہیں جانتی یہ کون ہیں۔آپ پلیز ایس. پی صاحب سے میری بات کروا دیں۔''

باہر لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔پانی کا آدھا گلاس پینے کے بعد اس کے حواس کچھ بہتر ہوئے تھے۔چند لمحوں بعد ایس پی زوار شاہ اس سے بات کر رہے تھے۔

''سر۔۔۔میں اکرام بھٹی کے ساتھ آپ کے آفس میں آج صبح آئی تھی۔'' اس نے من وعن سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''او کے۔۔۔معاملہ بہت سیریس ہے۔تم یہیں رکو اور گھبرانے کی ضرورت نہیں میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

ایس پی نے حوصلہ افزا لہجے میں اس سے بات کر کے کال منقطع کر دی۔ٹھیک دس منٹ بعد وہ بہ نفسِ نفیس بینک میں پہنچ گئے۔انہوں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔دیگر عملے کو ضروری ہدایات دیں اور حور کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''سر۔۔۔!اس نے کچھ کہنے کیلئے لب کھولے لیکن انہوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔آپ اطمینان رکھیں۔آپ سے آفس میں جا کر تفصیل سے بات ہو گی۔''

وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دوسری طرف اسپتال میں اکرام بھٹی کو ہوش آ گیا تھا، لیکن وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔حور کو غائب پا کر اسے تشویش ہوئی تھی۔

''ہوسکتا ہے وہ گھر چلی گئی ہو۔'' اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسپتال کے اس مختصر سے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز وہ پاشا کی بابت سوچ رہا تھا۔

''تم کچھ بھی کر لو پاشا اب میں تمہیں بے نقاب کر کے ہی رہوں گا۔'' اس نے سوچا اور ڈرپ اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی ڈرپ کو دیکھنے لگا جو کہ قریب الاختتام تھی۔ ہلکے پیلے رنگ کا محلول قطرہ قطرہ اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔اسی لمحے ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ایک ادھیڑ عمر نرس زیرلب مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔اس کے نقوش کھردرے اور آنکھیں بے تاثر تھیں۔

''آپ کو ہوش آ گیا۔کیسے ہیں آپ؟'' وہ اس کی نبض دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ایک دو مرتبہ اس نے غیر ارادی طور پر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

''جی سسٹر، میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔''گڈ۔۔۔آپ بہت جلد ہر تکلیف سے آزاد ہو جائیں گے۔''

اس نے سفید اپر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈسپوزیبل سرنج نکالی۔جس میں سبز رنگ کا گاڑھا سا محلول نظر آ رہا تھا۔

(ان شاء اللہ اگلا حصہ اگلے شمارے میں)



مقدر کا لکھا

خلیل جبار

ایک ایسے سزا یافتہ جن کی کہانی جو ایک حسین لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی میں مشکلات کا باعث بنا تا چلا جاتا پھر اس کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انسان اگر ہمت کرے تو تقدیر کا لکھا بھی ٹال سکتا ہے

نائمہ جب سو کر اٹھی اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے لحاف پر کوئی بھاری چیز آ کر گری ہو۔ اس نے غور سے لحاف کو دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کبھی کوئی بڑی چھپکلی نظر آ جاتی جو اس کی طرف بڑھ رہی ہوتی تھی مگر جیسے ہی وہ قریب آتی اچانک سے غائب ہو جاتی۔ کبھی اس کا لحاف وزنی ہو جاتا تھا اور یہ سب کچھ جبھی ہوتا تھا جب وہ کمرے میں اکیلی ہوتی تھی۔

اس گھر میں نائمہ کو شادی ہو کر آئے ہوئے بامشکل چھ ماہ ہوئے تھے' ابتدا میں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا' اب دو ماہ سے اس کے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک پیپل کا گھنا درخت بھی تھا اس کے پاس جاتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے خوف آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس درخت میں آسیب ہو' نائمہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ درخت کی قریب نہ جائے' کبھی کسی کام سے اسے صحن میں جانا بھی ہوتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ دیکھنے والا نظر بھی نہیں آتا تھا' دیکھنے والے کی آنکھیں اسے اپنے جسم پر چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ نائمہ نے اپنی ساس شہناز سے اس بارے میں پوچھا بھی مگر انہوں نے اس کی بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

''امی میں نے اپنی آنکھوں سے چھپکلی کو غائب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔'' وہ انہیں یقین دلاتی۔

''نائمہ بیٹی مجھے یہ بتاؤ کہ چھپکلی کوئی بڑا جانور ہوتا ہے۔''

''نہیں۔''

''چھپکلی ہر گھر میں ہوتی ہے' یہ ایک چھوٹا سا جانور ہے جب چاہے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے' کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے کھانے کی چیز میں گر گئی ہے مگر خوب تلاش کرنے پر بھی کھانے میں نہیں ملتی' ایسا ہوتا ہے نا۔''

''ہاں کبھی کپڑے پر گر جانے پر ایسا لگتا ہے کہ چھپکلی کپڑوں کے اندر گھس گئی ہے مگر تلاش کرنے پر کپڑوں کے اندر سے برآمد نہیں ہوتی۔''

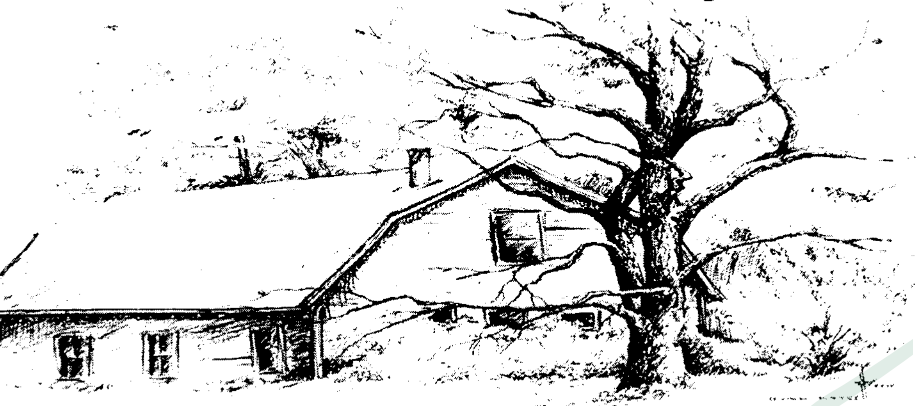
''ہاں یہ انسان کا وہم ہوتا ہے' کبھی تم نے سنا کسی چھپکلی نے انسان کو کاٹا ہے۔''

''نہیں۔''

''پھر اس بے ضرر جانور سے خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔'' شہناز نے کہا۔

''نہ جانے کیوں چھپکلی کو دیکھ کر ہر خاتون کو خوف آتا ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

''میری بیٹی تم بے خوف ہو کر اس گھر میں زندگی گزارو تمہیں کچھ نہیں ہوگا' مجھے دیکھو میری زندگی اسی گھر میں گزر گئی' میں بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی' ایک بیٹے کے سہارے اپنی جوانی اسی گھر میں گزار دی' کسی مائی کے لال کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ مجھے آ کر تنگ کرے۔'' شہناز بیگم



نے کہا۔

''ہاں امی محلے کے سب ہی لوگ آپ کی ہمت اور بھری جوانی میں بیوہ ہو کر اکیلے زندگی گزار دینے پر داد دیتے ہیں۔ ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔''

''میں جب بھری جوانی میں بیوہ ہوئی نوجوان مجھے ہوس بھری نگاہوں سے ضرور دیکھتے تھے مگر کسی کی مجال نہیں تھی کہ جو مجھ سے کسی قسم کی بدتمیزی کر سکیں۔ میں بھی مجبور تھی اگر میں جوانی میں شادی کر لیتی تو میرا بیٹا کاشف دربدر ہو جاتا۔'' شہناز کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

''وہ کیوں دربدر ہو جاتا۔'' نائمہ نے پوچھا۔

''بیٹا پرائی اولاد کو کون پالتا ہے۔ سب کو اپنی اولاد ہی اچھی لگتی ہے' میں نے بچپن میں اپنے رشتہ داروں میں یہ دیکھا تھا کہ دو تین لڑکیاں بیوہ ہوئی تھیں۔ ان کی جوانی کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے ان کی شادی دوسری جگہ کر دی۔ ان کے بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا' جس پر ایک نے اپنے دونوں بیٹوں کو یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔ دوسری کا میاں اس کے بچوں پر تشدد کرتا تھا۔ ایک دن وہ مسلسل تشدد سے تنگ آ کر گھر سے ایسے فرار ہوئے کہ پھر کبھی لوٹ کر گھر نہیں آئے۔ نا جانے وہ اب کس حال میں ہوں گے' ایک کے بچے کبھی باپ کے گھر' کبھی نانی کے گھر رہتے' ایک بے اولاد جوڑے نے ان بچوں پر ترس کھا کر اپنی اولاد بنا کر رکھ لیا۔ یہ سب واقعات میرے ذہن میں تھے اس لیے میں نے دکھ تکلیف برداشت کی مگر دوسری شادی نہیں کی۔'' شہناز بیگم نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

''امی آپ نے جوانی میں دکھ تکلیف اٹھائیں جس کا آج ثمر مل رہا ہے۔''

''ہاں بیٹی یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میری محنت اور تربیت رائیگاں نہیں گئی۔'' شہناز نے کہا۔

نائمہ تیزی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے' وہ دوپہر میں دو بجے سوئی تھی' اب جاگنے پر اس کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ اسے بدحواسی کی حالت میں اپنے جانب آتا دیکھ کر شہناز بھی گھبرا گئی۔

''کیا ہوا نائمہ بیٹی اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''امی میرا لحاف وزنی ہو گیا تھا' ایسا لگ رہا تھا کہ اچانک سے کوئی وزن آ کر گرا ہے۔ پر دیکھنے پر کچھ بھی نظر نہ آیا۔'' شہناز کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا۔

''تم چائے بناؤ میں کمرے میں جا کر دیکھتی ہوں۔'' شہناز نے کہا۔

نائمہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ چائے تیار کر کے جب شہناز کے کمرے میں گئی' اس کی حالت ہی مختلف تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے' جیسے انہیں کسی نے پکڑ کر بری طرح سے کھینچا ہو' چہرے پر انگلیاں چھپی ہوئی تھیں' انگلیوں کے نشان بظاہر ہلکے تھے مگر صاف نظر آ رہے تھے۔

''کیا ہوا امی؟''

''کک...... کچھ بھی...... نہیں۔'' وہ بوکھلائے ہوئے

بولیں۔

"یہ آپ کی حالت کیسی ہو رہی ہے بال بے ترتیب اور......"

"ارے بھئی بیڈ کے نیچے جھانکنے اور دیگر جگہوں پر جھک کر دیکھنے سے بال بے ترتیب ہو گئے ہیں۔"

"گال پر بھی انگلیاں چھپی ہوئی ہیں۔"

"نہیں، نہیں میرے گالوں پر کون انگلیاں لگائے گا' میرا رنگ سفید ہے نا اس لیے چہرے پر کہیں بھی زور سے ہاتھ لگنے یا کوئی چیز مس ہونی سے بھی جلد پر نشان پڑ جاتے ہیں۔" شہناز نے وضاحت کی۔

"امی ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔"

"میں تم سے کیا چھپاؤں گی گھر میں کوئی آیا بھی نہیں ہے۔"

"ہاں کوئی آیا بھی نہیں ہے اس لیے میں سوچ میں پڑ گئی ہوں۔"

"تم فضول میں کچھ مت سوچو خوامخواہ وقت ہی ضائع ہوگا۔" شہناز نے کہا۔

"نائمہ کو اپنی ساس کی یہ حالت دیکھ کر سخت تشویش ہو گئی تھی پھر بھی وہ خاموش رہی۔ اسے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ گڑبڑ ضرور ہے۔

رات کمرے میں حبس تھا' نائمہ سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی' اس نے اپنے شوہر کاشف پر ایک نظر ڈالی وہ گہری نیند میں تھا۔ نائمہ نے اس کی نیند خراب کرنے کی بجائے خود ہی کچھ دیر کمرے سے باہر چہل قدمی کی غرض سے چلی گئی۔ صحن میں اسے درخت کے نیچے' بچھی چارپائی پر شہناز لیٹی ہوئی نظر آئی' اسے دیکھ کر نائمہ کی ہمت بندھی' وہ ساس کی جانب بڑھی اس کے قدموں کی آہٹ پر ایسا لگا کہ جیسے چارپائی پر کوئی اور بھی تھا جو تیزی سے درخت پر چلا گیا ہو اور ساس اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے نائمہ تم باہر کیوں آ گئی ہو' کیا طبیعت گھبرا رہی تھی کمرے کے اندر۔"

"ہاں امی کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔"

"چلو اچھا ہے تم باہر آ گئی' میرا دل بھی گھبرا رہا تھا اس لیے میں بھی باہر تازہ ہوا کھانے آ گئی تھی۔" شہناز نے کہا۔

"امی آپ کے پاس کون تھا؟"

"میرے پاس...... میرے پاس کون ہوگا...... کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کوئی تھا جو تیزی سے درخت پر گیا ہے۔"

"نائمہ بیٹی یہاں کوئی بھی نہیں ہے تم خود درخت پر دیکھ لو۔ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔" شہناز بیگم نے کہا۔

نائمہ نے درخت پر غور سے دیکھا چاند کی روشنی اس قدر تیز تھی۔ درخت کی شاخوں کو بغور دیکھا جا سکتا تھا۔ درخت پر واقعی کوئی نہیں تھا۔ نائمہ کو سخت حیرت ہو رہی تھی اس نے خود اپنی آنکھوں سے کسی شخص کو درخت پر تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب درخت پر کوئی بھی شخص نہیں تھا۔

"میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟" شہناز بیگم نے کہا۔

نائمہ گم صم کچھ دیر ساس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر واپس کمرے میں چلی گئی۔ گڑبڑ ضرور ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے ہو سکتا ہے وقت آنے پر ظاہر ہو جائے' یہ باتیں سوچتے ہوئے اسے نیند آ گئی۔

اس بات کو گزرے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ نائمہ دوپہر میں کمرے کی صفائی کر رہی تھی' اچانک اس کی نظر درخت پر پڑی' ایک بڑا سا کالا سانپ درخت سے اترا' اس کا رخ کمرے کی طرف تھا' سانپ کو دیکھ کر خوف کے مارے اس پر کپکپی طاری ہو گئی' سانپ کمرے میں آ سکتا تھا' وہ سانپ سے بچاؤ کے لیے ترکیب سوچنے لگی۔ سانپ کا رخ تبدیل ہو کر ساس شہناز بیگم کے کمرے کی طرف ہو گیا تھا۔ اس وقت شہناز بیگم کمرے میں آرام کر رہی تھیں' خوف کے مارے نائمہ کمرے سے باہر نہیں آ سکی' شہناز کے کمرے میں سانپ کے جانے کے باوجود ابھی تک اس کی ساس کے چیخنے چلانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی' وقت گزرنے پر اس کا خوف کم ہو کے تجسس کا رخ اختیار کر گیا وہ دبے قدموں ساس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سانپ بھی کمرے کے دروازے کے نیچے سے اندر داخل ہوا تھا۔ جب دروازے

پر پہنچی کمرے کی اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

''امی اس وقت کس سے باتیں کررہی ہیں۔ باہر سے کوئی آیا بھی نہیں ہے پھر یہ کس سے باتیں کررہی ہیں۔'' نائمہ نے خود کلامی کی۔

کمرے کے اندر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے شہناز کسی کو ڈانٹ رہی ہوں' نائمہ نے ہمت کرکے دروازے پر دستک دے دی۔ دستک دینے پر کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی اور شہناز نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

''امی اندر کمرے میں کون ہے؟'' نائمہ نے پوچھا۔

''اندر کوئی بھی نہیں ہے تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟''

''امی میں نے درخت سے ایک کالا سانپ کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور جب میں دروازے پر پہنچی تو ایسا لگا کہ آپ کسی کو ڈانٹ رہی ہیں۔'' نائمہ نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی' اندر کچھ نہیں ہے تم خود اندر آکر دیکھ لو اور میں سوتے میں کسی کو کیسے ڈانٹ سکتی ہوں۔'' شہناز بیگم نے کہا۔

اس نے کہنے کو یہ بات کہہ دی تھی لیکن اس کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہورہی تھی' نائمہ اپنے خوف کو کم کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی' اس نے ایک ایک چیز کو دیکھ لیا' کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سانپ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ ایک موٹی کالی چھپکلی ضرور نظر آئی تھی جو چھت سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کی نظر نائمہ پر ہی تھی۔ نائمہ حیران و پریشان تھی اس نے اپنی آنکھوں سے سانپ کو کمرے میں جاتا دیکھا تھا اور ساس کی کسی سے بات چیت کی آواز بھی سنی تھی۔

''میری بیٹی نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا شروع کردیے ہیں۔'' شہناز نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

رات میں جب نائمہ نے اپنے شوہر کاشف کو یہ دونوں واقعات سنائے وہ زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔

''امی جان نے بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے جاگتے میں خواب دیکھنا شروع کردیے ہیں۔''

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' وہ بولی۔

''تم بات ہی ایسی کررہی ہو' جب رات میں تم نے درخت پر دیکھا کہ کوئی نہیں ہے دن کے اجالے میں امی جان کے کمرے کی ایک ایک جگہ دیکھ ڈالی۔ پھر بھی تمہیں کچھ نظر نہیں آیا یہ سب کیا ہے؟''

''یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

''صاف ظاہر ہے کہ تمہیں اپنی آنکھوں کے ٹیسٹ کے ساتھ کانوں کا بھی علاج کرانا پڑے گا۔'' کاشف نے کہا۔

کاشف بات ٹھیک کررہا تھا جس طرح کے اس کے ساتھ واقعات پیش آرہے تھے' ہر شخص اسے اپنے علاج کا مشورہ دے گا' نائمہ کاشف کی بات پر یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ کچھ وقت گزرنے پر سب کچھ اس پر عیاں ہوجائے گا۔

دو ہفتے گزر گئے' ان دو ہفتوں میں پھر کوئی پراسرار واقعہ پیش نہ آیا' مگر وہ دیکھ رہی تھی شہناز گم صم رہنے لگی تھی' نائمہ نے ساس کو ٹٹولنے کی کوشش بھی کی اس نے بات کو ٹال دیا۔

وہ بدھ کا دن تھا' دوپہر کا کھانا نائمہ نے اپنی ساس شہناز کے ساتھ کھایا اور اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چل دی' وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی چیخ مار کر واپس باہر آگئی۔ وہ کالا سانپ کنڈلی مارے اس کے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا نائمہ بیٹی؟'' شہناز بیگم تیزی سے اس کے پاس آئی۔

''آ...... امی...... وہ...... وہ اندر کالا سانپ...... میرے بیڈ پر......''

سانپ کا سن کر ساس شہناز کے چہرے پر ایک رنگ آکر چلا گیا۔ اس نے کمرے میں جھانکا وہاں واقعی ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

''نائمہ تم کمرے کے اندر مت آنا آج میں اس سے دو دو ہاتھ کرہی لوں۔'' یہ کہتے ہوئے شہناز کمرے میں داخل ہوگئی اور دروازہ بھی اندر سے لاک کرلیا۔

''امی...... امی......'' نائمہ اپنی ساس کو روکتی ہی رہ گئی۔

کچھ دیر تک شہناز کے تیز بولنے کی آواز آتی رہی پھر

اس کی کئی چیخیں سنائی دیں۔
چیخیں سن کر نائمہ نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔اس کے دروازہ پیٹنے پر ساس نے دروازہ کھول دیا' شہناز کے چہرے پر انگلیوں کے نشانات تھے' ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بھاری ہاتھ نے زوردار تھپڑ گال پر لگائے ہیں۔ اس کے ہونٹوں سے خون بھی رس رہا تھا۔سانپ بھی کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا' البتہ ایک چھپکلی ضرور چھت سے چپکی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا امی یہ آپ کی کیا حالت ہوگئی ہے اور وہ سانپ کہاں گیا؟'' نائمہ نے پوچھا۔

''تم میرے کمرے میں آؤ۔'' شہناز نے ہونٹوں سے رستا خون صاف کرتے ہوئے کہا۔نائمہ ساس کے پیچھے چل دی۔

''نائمہ بیٹی وہ بہت گستاخ ہوگیا ہے' اس کا علاج کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔''

''کس کا امی؟''

''اس سانپ کا وہ جو چاہتا ہے ایسا میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔''

''امی اسے کس طرح پکڑیں وہ اچانک نظروں سے غائب ہوجاتا ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

''وہ سانپ نہیں ہے اس لیے غائب ہوجاتا ہے۔''

''کیا وہ سانپ نہیں ہے۔''

''ہاں وہ سانپ نہیں ہے' وہ جنات کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے' اس میں اب ایسی طاقت آ گئی ہے وہ ہر قسم کے جانور اور انسانوں کا روپ بدل سکتا ہے۔''

''یہ سب آپ کیسے جانتی ہیں؟''

''بچپن میں اسے میں سانپ ہی سمجھتی تھی۔شادی کے بعد اس کا راز مجھ پر آشکار ہوا تھا۔'' شہناز نے کہا۔

''کیا یہ آپ کے بچپن سے اس گھر میں ہے' پھر بھی آپ نے اس درخت کو نہیں کٹوایا جس میں اس کا بسیرا ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو میرے والد نے اس درخت کو کٹوانے کی کوشش نہیں کی ہوگی انہوں نے بھرپور کوشش کی تھی۔'' شہناز نے کہا۔

''بھرپور کوشش کرنے پر بھی درخت نہیں کٹ سکا۔'' نائمہ چونکی۔

''ہاں میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ جب یہ خبیث سانپ نظر آنے لگا تھا' یہ کسی کو کہتا کچھ نہیں تھا' اکثر میں کمرے میں سو رہی ہوتی تھی' یہ آ جاتا اور ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں سے میری صورت نظر آتی رہے' جب کمرے میں امی یا ابو آتے یہ فوراً سے چھپ جاتا' کبھی وہ اسے دیکھ بھی لیتے تھے ابو کو میری فکر ہوئی کہ کہیں یہ کسی دن مجھے ڈس نہ لے' اس لیے ایک سانپ پکڑنے والے کو بلا کر لے آئے' سانپ پکڑنے والا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔سپیرے نے صحن میں بیٹھ کر سانپ کو پکڑنے کے لیے بین بجانی شروع کر دی۔ اس کے بین بجانے پر سانپ درخت پر سے نیچے اتر آیا' وہ سخت غصے میں دکھائی دے رہا تھا' وہ اچھل کر سپیرے کی گردن میں پھندا بن گیا' سپیرے کا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں باہر ابل آئیں' سپیرا تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا' ابو بھی اس کے پیچھے لپکے' سپیرے کے کچھ دور جانے پر سانپ سپیرے کی گردن سے ایسے غائب ہوا کہ جیسے تھا ہی نہیں' خوف زدہ سپیرے نے سانپ کے غائب ہوجانے پر سکون کا سانس لیا۔

''یہ سانپ نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہے۔'' سپیرا بولا۔

''ہمیں اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔'' ابو نے پوچھا۔

''کسی عامل سے ملاقات کرو' جنات سے وہی چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔'' سپیرے نے بتایا۔

''تمہارا خیال ہے کہ یہ سانپ نہیں کوئی جن ہے۔'' ابو گھبرائے ہوئے بولے۔

''ہاں سانپ کا ٹھکانہ زمین پر ہوتا ہے' جنات کا بسیرا درختوں پر ہوتا ہے' اور عامل حضرات کو جنات سے نپٹنا خوب آتا ہے۔'' سپیرا بولا۔

ابو کے ایک واقف کار عامل تھے جب ان سے ذکر کیا وہ بولے۔

''عبدالرحمان اس کا ایک یہ علاج ہے اس درخت کو کٹوا دو ورنہ یہ جن یہاں سے نہیں جائے گا۔''

ابو ایک درخت کاٹنے والے کو لے آئے۔ اس نے

جیسے ہی درخت کے نچلے حصے پر کلہاڑی سے وار کیا' وہاں سے خون نکلنا شروع ہوگیا۔ خون دیکھ کر درخت کاٹنے والے شخص پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور اس نے درخت کاٹنی سے معذوری ظاہر کردی۔ ابو بھی خون دیکھ کر ایک لمحے کو خوف زدہ ہوگئے تھے۔ دو ہفتے گزرنے پر جب ان کا خون کم ہوا وہ دوسرے درخت کاٹنے والے کو لے آئے۔ اس نے جب کلہاڑی کا وار درخت کے نچلے حصے پر کرنا چاہا اسے ایک چکر آیا اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا اور اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ بدن ایسے تپنے لگا جیسے بخار آ گیا ہو۔ وہ درخت کاٹنے والا ہوشیار اور تیز آدمی تھا۔ معاملہ سمجھ گیا' اور درخت کاٹنے سے معذرت کرلی۔ غرض ابو مختلف درخت کاٹنے والوں کو لائے' ہر کسی کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور درخت کاٹنے سے معذوری ظاہر کردیتا' ابو عامل سے دوبارہ ملے اور ساری صورت حال سے انہیں آگاہ کیا۔ وہ بھی کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔

''وہ جن بہت ہی خطرناک ہے' تم میرے پاس آنا میں تمہیں ایک نقش بنا کردوں گا' وہ نقش تم درخت پر باندھ دینا اور پھر درخت کاٹنے والے کو بلا کر لے آنا درخت کاٹنے والے کا جن کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

ابو کے عامل کے پاس جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی' ابو کی غیر موجودگی میں سانپ امی جان کے کمرے میں آیا اور اس نے انسانی زبان میں دھمکی دی کہ اگر ابو اس درخت کو کٹوانے کی ضد سے باز آجائیں ورنہ وہ گاڑی کے نیچے کچلے جائیں گے اور ان کی لاش کی حالت ایسی ہوجائے گی کہ شناخت بھی نہ ہوسکے گی۔ ابو نے جب عامل کی بات امی جان کو بتائی وہ رونے لگیں۔

''نازلی تم کیوں رو رہی ہو؟''

''میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں' سانپ نے مجھے انسانی آواز میں دھمکی دی ہے کہ اس درخت کو کاٹنے پر وہ تمہیں گاڑی کے نیچے لے جا کر کچل دے گا' تم اس درخت کو کٹوانے کا خیال دل سے نکال دو۔''

ابو نے بہت سمجھایا امی کی ایک ہی ضد تھی کہ اس درخت کو نہ کٹوائیں' مجبوراً ابو کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس طرح یہ سانپ ہمارے گھر میں رہا' وہ کسی کو بھی کچھ نہیں کہتا تھا' اس لیے ابو نے درخت کاٹنے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

میں جب جوان ہوئی' میری شادی کے لیے رشتے آنے لگے' قاسم کا میرے لیے رشتہ آیا وہ گھر والوں کو اچھا لگا اس لیے میری بات پکی کردی گئی' حیرت کی بات ہے ان دنوں سانپ غائب ہوگیا تھا' کسی کو بھی نظر نہیں آرہا تھا' میری شادی قاسم سے ہوگئی' میں شادی کے تین ماہ بعد گھر لوٹی تھی' میں بہت خوش تھی کہ قاسم کی شکل میں اچھا شوہر مل گیا ہی' میں دوپہر میں آرام کررہی تھی کہ یہ سانپ اچانک سے نمودار ہوا' یہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا' وہ پہلی بار مجھ سے انسانی زبان میں مخاطب ہوا۔

''شہناز تو شادی کرکے بہت خوش ہورہی ہے' میں یہاں نہیں تھا' اس لیے تیری شادی ہوگئی' مجھے میرے خاندان والوں نے اپنے قبیلے میں کچھ دن کے لیے بلالیا تھا' مجھے اگر پتا ہوتا تو کبھی نہ جاتا اور رشتے کے لیے آنے والوں کو ایسا سبق سکھاتا کہ وہ پلٹ کر یہاں نہ آتے۔'' وہ کچھ دیر کو رکا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا' میری اتنی ہمت نہ ہورہی تھی کہ اس سے کچھ کہہ سکوں اور بس خوف زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

''میں یہ کسی صورت میں برداشت نہیں کروں گا کہ تم کسی اور کی ہو جاؤ۔ تم میری ہو اور میری بن کر رہوگی' تمہارے باپ کو میں دیکھ لوں گا' اس نے اپنے لیے بہت برا کرلیا' اب تم دیکھنا تمہارا باپ تمہاری خوشیاں دیکھنے کو بچے گا اور نہ تمہارا شوہر قاسم۔''

''تم کون ہوتے ہو ایسا کرنے والے؟'' مجھے اس کی بات پر غصہ آگیا اور میں خوف زدہ حالت میں اس سے بولی۔

''یہ آنے والا وقت تمہیں بتائے گا کہ میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے غصے سے کمرے سے نکل گیا۔

''میں اسے دیکھتی رہ گئی۔''

شام میں ابو کو سانپ کی بات بتائی انہیں بھی غصہ آگیا اور وہ اسی وقت باہر گئے اور نا جانے کس سے کلہاڑی مانگ کر لے آئے اور آتے ہی درخت پر کلہاڑی چلانی شروع کردی' ابھی مشکل سے دو تین کلہاڑی کے وار کیے ہوں گے

کہ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے' ان کی یہ حالت دیکھ کر ہمارے ہاتھ پیر پھول گئے' امی نے پڑوس سے نظام بھائی اور کریم بھائی کو آوازیں دیں' وہ ابو کو ہسپتال لے کر دوڑے۔ ابو کو اٹیک ہوا تھا' اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ گئے تھے۔ انہیں اسپتال لے جانا بے سود ثابت ہوا' چند لمحوں میں گھر ماتم کدہ بن گیا' لیکن ہمارے رونے دھونے سے وہ واپس نہیں آسکتے تھے۔ جو ہماری قسمت میں لکھا تھا وہ ہو گیا تھا' وقت کے ساتھ ہمارے دکھ میں بھی کمی آتی چلی گئی اور ہم سب کچھ بھول کر اپنی مصروفیات میں مگن ہو گئے تھے۔

میرا بیٹا کاشف جب پیدا ہوا میں بہت خوش ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وارث دے دیا ہے جب میں امی کے گھر آئی' امی بہت خوش ہوئیں' وہ اپنے نواسے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھیں' میں چند دن امی جان کے گھر رہ کر اپنے سسرال جانے لگی تو اس رات یہ سانپ میرے کمرے میں آ گیا' میں سوئی ہوئی تھی' کمرے میں سانپ کی پھنکار سن کر میں سوتے سے جاگ گئی' میں نے دیکھا کہ کوئی نوجوان دروازے کے پاس کھڑا ہے' میں نے فوراً سے لائٹ آن کر دی' وہ نوجوان دیکھنے میں بہت خوبصورت تھا' میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ نوجوان میرے کمرے میں کیسے آ گیا' وہ مجھے دیکھ کر مسلسل مسکرا رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وہی کالا سانپ ہوں جو اس درخت پر رہتا ہوں۔''

''تم انسانی شکل میں کیسے آ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جنات قوم میں سے ہوں' میں بہت شریر تھا' میری شرارتوں کی بدولت مجھے سزا کے طور پر قبیلے سے نکال کر سانپ کی شکل میں اس درخت پر پھینک دیا گیا۔ مجھ میں وہ تمام طاقتیں تھیں جو ایک جن میں ہوتی ہیں مگر میں اس جگہ سے سانپ کے روپ سے نہیں نکل سکتا تھا' جب تک میری سزا پوری نہ ہو جائے' میری سزا تمہاری شادی سے چند ماہ قبل ختم ہو چکی تھی' اس لیے میں گھر والوں سے ملنے چلا گیا تھا مگر میرا دل وہاں نہیں لگا' کیونکہ میرے دل میں تم بسی ہو' اس لیے اپنے قبیلے کو چھوڑ کر واپس چلا آیا' یہاں آنے پر انکشاف ہوا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے' میں نے تمہارے باپ سے اپنا انتقام لے لیا ہے' اور تم چاہتی ہو کہ تمہارا شوہر سلامت رہے تو اپنے شوہر سے طلاق لے لو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' وہ بولا۔

''میں اپنے شوہر کے بیٹے کی ماں ہوں میں کس طرح سے طلاق لے لوں' مجھے کون اپنائے گا۔''

''میں تمہیں اپناؤں گا تم کیوں ڈرتی ہو۔''

''میں انسان ہوں اور تم جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہو ہمارا ملن کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔''

''دیکھو میں کتنا خوبصورت نوجوان ہوں اور تمہارا شوہر کا مجھ سے کسی بھی طور پر مقابلہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولا۔

''مجھے پتا ہے جنات مختلف روپ بدل کر وقتی طور پر خوبصورت بن جاتے ہیں۔''

''ہاں ایسا ہوتا ہے وقتی طور پر جنات مختلف روپ بدل لیتے ہیں تم میرا یقین کرو میں جس روپ میں تمہارے سامنے آیا ہوں میرا یہی روپ ہے تم جس کی قسم کھانے کو کہو میں وہ قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں' یہ میرا ہی روپ ہے۔'' وہ بولا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تمہارا یہ روپ اصلی ہے یا نقلی میں اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ہو جاؤں۔'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر وہ غصے میں آ گیا' اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میں تمہیں اس کا مزا چکھا دوں گا' میرا نام شمروز جن ہے۔''

''کیا کرو گے مجھے مارو گے۔'' میں بھی غصے میں آ گئی۔

''میں تمہیں کیسے مار سکتا ہوں تمہاری خاطر میں اپنا قبیلہ چھوڑ کر آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سانپ میں تبدیل ہو کر کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے پر میں سوچ میں پڑ گئی' وہ مجھے دھمکی دے گیا ہے نا جانے وہ کیا کرے' دوسرے دن میں سسرال چلی گئی' وہاں جا کر بھی میرے ذہن میں جب دھمکی آتی میں لرز کر رہ جاتی' حقیقت یہ ہے کہ میں بہت خوفزدہ تھی میں نے امی کو بھی سانپ کی دھمکی کا نہیں بتایا تھا کہ خواہ مخواہ وہ پریشان

ہوں گی مجھے وہ خبر مل گئی جس کا خدشہ تھا۔ میرے شوہر قاسم کا موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ میں بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ میں نے سسرال میں عدت کے دن جیسے تیسے گزارے اور پھر میکے آ گئی۔ میرے بیوہ ہونے کا امی کو بہت دکھ تھا۔ اسی سبب وہ آئے دن بیمار رہنے لگی تھیں۔

سانپ بہت خوش تھا' وہ کئی بار میرے کمرے میں آ کر کہہ چکا تھا کہ میرے انکار پر اس نے مجھے بیوہ بنایا ہے' اب بھی وقت ہے میری بن جا' عیش کرے گی' میں نے اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر دیا۔

ایک دن میں سو رہی تھی' عصر میں ابھی کچھ وقت تھا' مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے' میری آنکھ کھل گئی میں نے دیکھا وہ شمروز جن تھا جو کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تت..... تم......''

''میرا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں دیکھنے آؤں اس لیے چلا آیا۔'' وہ مسکرایا۔

''تم میرے کمرے سے دفعہ ہو جاؤ۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کیوں دفعہ ہو جاؤں۔''

''میں تمہاری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی' پھر تم نے میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے کی؟''

''کمرے میں آنے کے لیے جرأت کی ضرورت نہیں ہوتی' میرا دل چاہا اور میں آ گیا۔'' شمروز جن نے کہا۔

''تم یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''لیکن میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں اور اب وہ وقت آنے والا ہے جب تمہیں میری ضرورت پڑے گی اور تم میری صورت بھی دیکھو گی۔''

''مجھے تم سے شدید نفرت ہوگئی ہے تم میرے باپ کے قاتل ہو تم نے میرے شوہر کو مارا ہے' تم نہ ہوتے تو میں بھی بھری جوانی میں بیوہ نہ ہوتی۔''

''میرے لیے ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا' اب تمہیں میرا بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ایسا ہو گا اور یہ وقت بتائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

میرے والد کے انتقال کے بعد ویسے ہی عزیز رشتے دار اس لیے دور ہوگئے تھے کہ انہیں ہماری مدد نہ کرنی پڑ جائے امی جان ویسے ہی خوددار خاتون تھیں انہیں بھی یہ گوارا نہ تھا کہ انہیں کسی کا دست سوال ہونا پڑے۔ وہ مختلف گھروں میں جا کر کام کرنے لگیں تھیں وہاں سے جو پیسے ملتے تھے وہ دونوں ماں بیٹی کے لیے بہت تھے۔ امی جان کے مسلسل بیمار رہنے پر ان کی یہ ڈیوٹی میں نے سنبھالتی ہوئے مختلف گھروں میں جا کر کام کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن امی جان بھی چل بسیں۔ ان کے جانے پر مجھے احساس ہوا وہ میرا کتنا بڑا سہارا تھیں۔ میں خود کو تنہا اور بے آسرا تصور کرنے لگی تھی۔ میرے سسرال والوں نے قاسم کی وفات کے بعد مجھ سے ایسے تعلق توڑ لیا جیسے میرا کبھی ان سے کوئی رشتہ ناطہ ہی نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں قاسم کی امانت کاشف کو پال رہی ہوں۔

امی جان کے انتقال پر میں جب بھی گھر سے باہر کام کو جاتی تھی مردوں کی بھوکی اور ہوس زدہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا' اکثر منچلے جملے بھی کس دیتے تھے' میں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی تھی۔ رات کے وقت اکیلے میں اپنی قسمت پر اشک بہاتی کہ یہ دن بھی دیکھنا تھے۔ میں محلے کے لوگوں کی ہوس بھری نظروں سے خوف زدہ تھی۔ اس لیے میں سونے سے پہلے اچھی طرح کمرے کے دروازے کو کنڈی لگا کر سوتی تھی' ایک رات میں کمرے کے دروازے کو کنڈی لگانے والی تھی کہ اچانک محلے کا بدمعاش غلام آ گیا۔ وہ گھر کی دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

''تم..... تم کیوں آئے ہو؟'' میں غصے سے چیخی۔

''آہستہ میری بلبل میں پیاسا ہوں اپنی پیاس بجھانے آیا ہوں' پیاس بجھتے ہی ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہروں گا۔'' وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''تم جاتے ہو یا محلے والوں کو اکٹھا کر لوں۔''

''شوق سے کر لو' میں کہہ دوں گا تم نے مجھے بلایا ہے اور اب اپنی قیمت اتنی بتا رہی ہو کہ میں اس وقت نہیں دے سکتا

تم نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے لوگوں کو بلایا ہے۔''
''تم بہت کمینے ہو' دیکھو میں کہتی ہوں شرافت سے چلے جاؤ۔''
''میں شرافت سے چلا جاؤں' میں شریف کہاں ہوں جو ایسا کروں۔'' وہ زور سے ہنسا۔ اس کے منہ سے زور کا بدبو کا بھپکا نکلا' میں نے نفرت سے دوسری طرف منہ کرلیا۔
''میری بلبل اس طرح مجھ سے منہ نہ موڑ میں تیرا چاہنے والا ہوں' اپنی پیاس بجھا کر چلا جاؤں گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔
''میں پیچھے ہٹ رہی تھی اور وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرا ہاتھ پکڑلیا۔
''تو کیا سمجھتی ہے میں بہت کمزور ہوں' مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اگر کسی مرد کا ایک بار ہاتھ پکڑلوں تو اسے چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے' پھر تو ایک نازک پھول کی مانند ہے مجھ سے زیادہ نہ الجھ اور خاموشی سے خود کو میرے حوالے کردے۔''
''ایسا میں ہرگز نہیں کروں گی۔'' میں نے نفرت سے غلامو کو دیکھا۔
''پھر مجھے یہ کام طاقت کے زور پر کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک جھٹکا دے کر بیڈ پر پھینک دیا۔
میں نے جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی اس نے مجھے دوبارہ بیڈ پر لٹادیا' میں حواس باختہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی' فرار کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو میں منت سماجت پر اتر آئی اور اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
''اللہ کے لیے میری حالت پر رحم کھاؤ میں پہلے ہی حالات کی ماری ہوئی ہوں مجھے مزید دکھی مت کرو۔''
''تمہیں کون کہہ رہا ہے دکھی ہونے کو مجھ سے دوستی کرلو پھر دیکھنا اس محلے میں کسی کی مجال نہیں جو تجھ پر میلی نگاہ ڈالے۔''
''خدا کے لیے اس وقت تم چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔
''میں کون سا یہاں بسنے آیا ہوں' پیاسا ہوں کنویں کے پاس اپنی پیاس بجھانے آیا ہوں' پیاس بجھنے پر چلا جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف بڑھا۔

اچانک ثمروز جن کالے سانپ کی صورت میں نمودار ہوا اور وہ غلاموں کے گلے میں پھندا بن کر لگ گیا۔ غلاموں کی آنکھیں شدت تکلیف سے باہر کو ابلنے لگیں۔ وہ چیخنا چاہ رہا تھا مگر چیخ نہیں پارہا تھا۔ میرے منہ سے خودبخود الفاظ نکلنے لگے۔
''بول اب ادھر کا رخ کرے گا۔''
''نہ...... نہیں......'' اس کے منہ سے بامشکل یہ الفاظ نکلے۔
''زندگی چاہتا ہے تو پھر مرغا بن جا۔'' میرے منہ سے جیسے ہی یہ الفاظ نکلے وہ مرغا بن گیا۔
تھوڑی دیر گزرنے پر پھر میرے منہ سے الفاظ نکلے۔
''زمین پر سات بار اپنی ناک رگڑ کر توبہ کرلے کہ پھر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرے گا۔''
''میری توبہ میں پھر ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔'' غلامو نے سات بار زمین پر ناک رگڑ کر کہا۔
''ٹھیک پھر یہاں سے دفع ہوجا۔'' میرے منہ سے الفاظ نکلے۔
سانپ اس کے گلے سے الگ ہوگیا تھا اس لیے غلامو ایسا بھاگا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔
غلامو کے جانے پر ناگ پھر سے اپنی اصلی صورت میں آگیا۔
''کیا تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ آواز ہی دے لو۔ اگر میں نہیں آتا تو غلاموں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔'' وہ بولا۔ میں خاموش رہی' مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔
''میرا شکریہ ہی ادا کردو۔''
میں پھر بھی خاموش رہی وہ مسکراتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔
میں اس کا کیسے شکریہ ادا کرتی' میرے والد اور شوہر کی ہلاکت میں اس کا ہاتھ تھا' یہ بھی ممکن تھا کہ میری والدہ کو بھی اس نے ہی ہلاک کیا ہو اور ظاہر نہیں کررہا ہو' والدہ کے انتقال سے میں اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی' اپنے بھی غیر ہوگئے تھے' ایسے میں یہ ہمدرد بن کر میرے قریب آنا چاہ رہا تھا' مگر میں کسی بھی صورت میں اسے اپنے قریب نہیں

آنے دوں گی' میں نے کمرے کے دروازے کو اچھی طرح سے بند کر کے سوگئی۔

میں سوچ رہی تھی کہ غلاموں کی جو بے عزتی ہوئی ہے اس سے میری پریشانی ٹل گئی ہے مگر ایسا نہیں تھا' مردوں کے اس معاشرے میں تنہا عورت کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے' میں نواز علی کے گھر میں کام کرتی تھی' میں دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہیں میرے بدن کا اس طرح طواف کرتی ہیں کہ اس میں ہوس ہوتی ہے۔ شروع میں' میں نے اسے اپنا وہم جانا تھا لیکن اتوار کے دن مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ بیگم نواز علی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ صبح ناشتہ کر کے دوبارہ سوگئی تھیں۔ چھٹی والے دن للن کے بچے دیر سے اٹھتے تھے' صبح دس بجے کا وقت تھا میں کچن میں برتن دھو رہی تھی' ایسے میں نواز علی کچن میں چلا آیا۔

''ارے صاحب جی اگر چائے بنوانی تھی تو مجھے آواز دے لیتے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے چائے کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔'' نواز علی نے کہا۔

''میری ضرورت۔'' میں چونکی۔

''ہاں جان من جب سے تم ہمارے گھر میں کام کرنے آئی ہو میرے دل کا چین اڑ گیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر جو میری حالت ہوتی ہے میں بیان نہیں کرسکتا۔''

''آپ اپنے رتبے کا خیال کریں میں کہاں اور آپ کہاں۔'' میں نے کہا۔

''جب کسی سے پیار ہوجائے تو پھر یہ مقام و مرتبہ نہیں دیکھا جاتا۔'' نواز علی نے کہا۔

''آپ کو کس سے پیار ہوگیا ہے؟''

''سب جانتے ہوئے بھی تم کیوں بھولی بن رہی ہو مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے اور میں......''

''مجھ سے ہوا ہے یا میرے جسم سے پیار ہوگیا ہے۔'' میں نے کہا۔ میری اس بات پر وہ چونکا اور پھر بولا۔

''میری جان تمہارا جسم ہی ایسا ہے کہ اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگانے کے لیے کافی ہے۔''

''اپنے ایمان کو مت ڈگمگاؤ' ورنہ بی بی آپ کا دماغ درست کر کے رکھ دیں گی۔''

''اس کی تم پرواہ مت کرو۔ اسے میں نے نیند کی گولی دے کر سلا دیا ہے۔ وہ شام سے پہلے بیدار نہیں ہوگی۔'' نواز علی نے کہا۔

''بی بی کو تم نے نیند کی گولی دے دی ہے بچوں کو نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ میں یہاں کام کرنے آتی ہوں جسم فروشی میرا پیشہ نہیں ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا ہوں۔'' نواز علی نے غصے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں تمہاری عزت کررہی ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بدتمیزی پر اتر آؤ' میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ میں شور مچادوں گی' پھر تمہاری اپنے بچوں میں دو ٹکے کی بھی عزت نہیں رہے گی۔''

''جو چڑیا میرے قابو میں نہ آئے میں اس کے ساتھ ایسا کرتا ہوں وہ خود بخود میرے اشاروں پر چلنے لگتی ہے۔''

''میں ایسی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ وقت بتائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

نواز علی کے کچن سے جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا اس نے مجھے دھمکی دی تھی وہ کچھ بھی کرسکتا تھا اس لیے میں نے بی بی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔ دوسرے دن میں نے پورا واقعہ بی بی کو سنا دیا' میری بات سن کر وہ افسردہ سی ہوگئیں۔

''شہناز میرے شوہر نواز علی کا چال چلن ابتدا سے ہی اچھا نہیں رہا ہے' یہ ہر آنے والی ماسی پر ڈورے ڈالتا ہے۔ اس لیے میں نے تمہاری والدہ کو اپنے یہاں کام پر رکھا تھا' ان کے انتقال پر تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی میں نے تمہیں رکھ لیا۔ تم گھبراؤ نہیں میں کچھ کرتی ہوں۔'' وہ بولیں۔

اب یہ ہوا کہ میں جس وقت ہوتی نواز علی گھر پر نہیں ہوتا تھا' میں نے سکون کا سانس لیا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں جہاں بھی جاتی تھی کاشف کو ضرور ساتھ لے کر جاتی اور چھوڑتی بھی تو کس کے پاس اس لیے یہ میری مجبوری تھی اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھنا۔ میں ایک دن دوپہر میں کاشف کو چھاتی سے لگائے آرہی تھی ابھی گھر آیا نہیں تھا کہ دو موٹر سائیکل سواروں نے میرا راستہ روک لیا۔ اس وقت دوپہر میں گلی میں سناٹا ہوا کرتا تھا' میرا

راستہ روکے جانے پر میں گھبرا گئی' میں خوف زدہ حالت میں ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کوئی نظر آ جائے اور میں مدد کو پکاروں۔

''کیا ادھر ادھر دیکھ رہی ہو تمہاری مدد کو یہاں کوئی نہیں آئے گا۔'' ایک نوجوان بولا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''ہم جو چاہتے ہیں اس کے لیے تم آسانی سے مان جاؤ گی تو ہم خاموشی سے چلے جائیں گے ورنہ ہم پھر زبردستی پر اتر آئیں گے۔'' دوسرا نوجوان بولا۔

''ہمیں اس بچے کو اغوا کرنے کا معقول معاوضہ ملا ہے اس لیے ہمیں اب یہ تمہارا بچہ چاہیے۔''

''میں ایک غریب بیوہ عورت ہوں مجھ سے میرا بچہ مت چھینو۔''

''یہ بچہ تمہیں دوبارہ مل جائے گا اس کی فکر مت کرو۔'' تیسرا بولا۔

''جب مجھے میرا بچہ واپس ملنا ہے تو پھر اسے کیوں اغوا کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کسی کو اس بچے کے عوض تم سے کچھ ڈیمانڈ منوانی ہے ویسے تم اس کی خواہش پوری کر نہیں رہی...... یہ بچہ جانے پر تم ضرور اس کی ڈیمانڈ پوری کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔'' پہلا نوجوان بولا۔

''میں کوئی بھی غلط ڈیمانڈ پوری نہیں کروں گی چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' میں نے کہا۔

میں انہیں باتوں میں لگا کر ان کا وقت ضائع کرنا چاہ رہی تھی یہ ممکن تھا کہ گلی سے کوئی نہ کوئی آدمی نکل آئے اور یہ اسے دیکھ کر بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوں۔

''مائیں اپنی جانیں ضرور قربان کر دیتی ہیں لیکن بچوں کی خاطر وہ مجبور ہو کر سامنے والے کی ڈیمانڈ پوری کر دینے پر مجبور ہوتی ہیں تم بھی اپنے بیٹے کی خاطر ایسا کرو گی۔'' دوسرا نوجوان ہنستے ہوئے بولا۔

''کس نے تمہیں میرا بیٹا اغوا کرنے کا معاوضہ دیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اتنی کچی گولیاں ہم نے نہیں کھیلی ہیں کہ اس کا نام بتا دیں اور تم جا کر پولیس میں رپورٹ لکھوا دو۔'' تیسرا نوجوان بولا۔

''تمہیں ویسے ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے اس شخص کا نام بتانا پڑے گا' اس لیے ابھی بتا دو۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' میں سمجھی کہ وہ مشورہ کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس شخص کا نام بتائیں یا نہیں مگر میرا خیال غلط تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف آئے اور کاشف کو چھین کر مجھے زور سے دھکا دیا میں گلی میں گر پڑی' اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی وہ کاشف کو لے کر رفو چکر ہو گئے۔ میں روتی پیٹتی رہ گئی میرے شور کرنے پر گلی اور گھروں سے نکل کر کئی لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے ہمدردی کر کے چلے گئے اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ اس دنیا میں کاشف ہی میرا سب کچھ تھا مجھے لوگوں نے مشورہ دیا کہ میں تھانے رپورٹ لکھوا دوں میں کس کے خلاف رپٹ لکھواتی۔ ایک امید تھی کہ رپورٹ نہ لکھوانے پر کہ جس نے بھی بچہ اغوا کروایا ہے وہ مجھ سے ضرور رابطہ کرے گا' اس کے رابطہ کرنے پر کاشف مجھے دوبارہ مل سکتا تھا۔ پھر ایک ہفتہ بیت گیا۔ کاشف کو اغوا کرنے والوں نے مجھ سے کسی قسم کا بھی رابطہ نہ کیا' مجھے مایوسی ہونے لگی تھی کہ پتا نہیں کاشف مجھے دوبارہ ملے گا بھی یا نہیں' ایک دن میں صبح تیار ہو کر کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلنے والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی' میں لپک کر دروازے پر گئی۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا' وہاں کوئی بھی نہیں تھا' میں نے مایوس ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ بے اختیار میری نظر نیچے گئی وہاں ایک لفافہ پڑا تھا' میں نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ لفافہ دھڑکتے دل کے ساتھ چاک کیا' خط میں مختصر سی تحریر تھی۔

''تمہارا بچہ زندہ ہے اس کی زندگی کی سلامتی چاہتی ہو تو جیسا ہم کہیں ویسا کرو' پولیس کو اطلاع کرنے پر تمہارے بچے کو ہم موت کی نیند سلا دیں گے۔ ہماری اگلی ہدایت تک پانچ لاکھ روپے کا انتظام رکھنا۔ وہ رقم تمہیں کہاں اور کب پہنچانی ہے وہ ہم اگلے خط میں لکھ دیں گے۔''

ان ظالم لوگوں نے جتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا' اتنی رقم میں نے زندگی میں بھی نہیں دیکھی پھر کس طرح سے اتنی رقم انہیں دیتی۔ میں افسردہ ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ ناگ سے مدد لے لوں پھر یہ سوچ کر اس خیال کو مسترد کر دیا کہ پھر وہ اپنی من مانیاں تیز کر دے گا اور میں کسی طور پر ناگ

کی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ وہ خط دیکھ کر بیٹے سے ملنے کی تڑپ پھر سے بیدار ہوگئی تھی، پانچ لاکھ کی جو شرط لگادی یہ میرا کڑا امتحان تھا۔ میں پولیس کو بھی اس خط کی رپورٹ نہیں دے سکتی تھی بیٹے کی زندگی کا سوال تھا، میری عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ میں بیٹے کی اطلاع ملنے پر خوشی کے مارے بیڈ سے اٹھتی مگر دوسرے لمحے پھر بیڈ پر بیٹھ جاتی کہ میں اتنی رقم لاؤں گی کہاں سے، پیسوں کی خاطر میرے بیٹے کو اغوا کیا ہے پھر وہ کس طرح اتنی آسانی سے اسے اس کے حوالے کردیں گے۔ سوچتے سوچتے جب میرا ذہن تھک گیا میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا، وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔

میں بی بی بیگم علی نواز کے گھر جب کام کرنے گئی وہ میرے چہرے سے بھانپ گئی کہ ضرور کوئی بات ہے۔ ان کے اصرار پر مجھے سب کچھ بتانا پڑا۔ ہزار، دو ہزار روپے کی بات ہوتی تو وہ ضرور میری مدد کردیتیں۔ پانچ لاکھ روپے کی رقم معمولی نہیں تھی۔ اس لیے وہ میری بات سن کر سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ انہیں سوچتا دیکھ کر میں پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔

خط کو آئے تین دن گزر جانے پر بھی میرے بیٹے کو اغوا کرنے والوں نے مجھ سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگلے دن میں بی بی صاحبہ کے گھر کام کرکے نکل رہی تھی کہ راستے میں علی نواز مل گیا اور میری جیسے ہی اس کی نظروں سے نظریں ملیں وہ لپک کر میرے پاس آ گیا۔

”شہناز میں نے سنا ہے کہ تمہارے بیٹے کو جن لوگوں نے اغوا کیا ہے وہ پانچ لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کررہے ہیں۔“ وہ بھولے پن سے بولا۔

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟“

”مجھے کیا سوچنا ہے میں نے اتنی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھی، میں کس طرح ان کا مطالبہ پورا کرسکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم کہو تو میں رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش کروں۔“ علی نواز نے کہا۔

”تمہاری اس ہمدردی کا بہت، بہت شکریہ۔“ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے اشک صاف کیے۔

”تم یہ سوچ رہی ہوگی کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے ادا کروگی، ارے تم سے کون کم بخت رقم مانگے گا بس تم ہاں کردو میں پانچ لاکھ کی رقم خود لے کر ان کے پاس جاؤں گا اور تمہارے بچے کو آزاد کرا کے لے آؤں گا۔“ وہ بولا۔

”اس مفاد پرستی کے دور میں کون ہے جو اتنی بڑی رقم خرچ کرڈالے۔“ میری بات پر وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”تم نے ٹھیک سوچا ہے میں تم سے جو چاہتا ہوں وہ تم اچھی طرح جانتی ہو میں تم سے دوستی کرنے کو اتنی بڑی رقم قربان کردینا چاہتا ہوں بولو مجھ سے دوستی کروگی۔“

”نہیں......“ میں غصے سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

”میری بات مان لو ورنہ زندگی بھر کے لیے اپنے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“ وہ بولا۔

میں نے اس کی سنی ان سنی کردی۔ علی نواز کی بات نے میری تن بدن میں آگ لگادی تھی وہ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھ رہا تھا کہ پانچ لاکھ روپے کی خاطر اپنی عصمت گنوادوں گی۔ بیڈ پر لیٹے ہوئے میں بار بار غصے سے کروٹیں بدل رہی تھی، میرے ذہن میں علی نواز کی باتیں ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، علی نواز پر مجھے غصہ اس قدر تھا کہ میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر میں مجبور تھی۔ مجھے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑجاتا اس لیے میں خاموشی اختیار کرکے چلی آئی تھی۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ سانپ انسانی شکل میں موجود تھا۔

”کیا ہوا اس قدر غصے میں کیوں ہو؟“ وہ بولا۔

”تمہیں اس سے مطلب؟“ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا اور مجھے یہ بھی پتا ہے تم اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہو اور اسے پانے کی کوشش میں ہو اور وہ میری مدد کے بغیر ممکن نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم کیا کرلوگے؟“

”تم حکم کرو، پھر دیکھو بچے کو اغوا کرنے والا سر کے بل یہاں آئے گا اور بچے کو تمہاری گود میں ڈال جائے گا۔“ وہ

بولا۔
"ٹھیک ہے لادو میرے بیٹے کو۔" میں نے کہا۔
میری بات پر شمروز جن چلا گیا' ابھی اسے گئے مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا' باہر دروازے پر دستک ہوئی میں دوڑ کر دروازے پر گئی اور دروازہ کھول دیا۔
باہر علی نواز بچے کو گود میں لیے کھڑا تھا۔ اس نے بچے کو مجھے تھمایا اور میرے پیروں پر گر پڑا۔
"میری بہن مجھے معاف کردو' میں نے اپنی نفسانی خواہش کے آگے مجبور ہو کر بچے کو اغوا کرا کے اچھا نہیں کیا' میں اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوں اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا پھر کبھی نہیں ہوگا۔"
میرا بیٹا میرے پاس آ گیا تھا اس لیے میں اپنے گھر کے آگے تماشہ نہیں بنوانا چاہتی تھی اس لیے علی نواز کو معاف کرتے ہوئے چلے جانے کو کہا۔ معافی مل جانے پر وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ میں کاشف کو چومتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔
"اب تو خوش ہونا۔" شمروز جن مجھے دیکھ کر بولا۔
"ہاں میرا بیٹا مجھے مل گیا۔" میں نے کاشف کو پیار کرتے ہوئے کہا۔
تنہا عورت معاشرے میں کس طرح جیتی ہے یہ بات اب مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔ لوگوں کی ہوس بھری نگاہیں مجھے چبھتی تھیں' اور پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک دن میں کاشف کے ساتھ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک شمروز جن انسانی شکل میں میرے پاس آیا اور اس نے کاشف کو اپنی ہاتھوں میں اٹھالیا' اسے دیکھ کر میرے دل میں جو اس کے لیے نفرت تھی وہ عود آئی۔
"اسے کیوں اٹھایا...... چھوڑ دو۔"
"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اس سے بہت محبت ہے۔" وہ بولا۔
"بیٹے سے ماں کو بہت محبت ہونا فطری سی بات ہے۔" میں نے کہا۔
"خوبصورت عورت کو دیکھ کر مرد بھی نہیں رہ سکتا......"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔
"میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔"
"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"
"ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا اگر پیار سے نہیں تو پھر زبردستی ہوگا۔"
"میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں۔"
"اس نفرت کو محبت میں بدل لو ورنہ......"
"ورنہ کیا؟"
"ورنہ میں اس بچے کو ہمیشہ کے لیے اس کے باپ کے پاس پہنچادوں۔"
"تم ایسا نہیں کرو گے۔"
"مجھے ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ میں ایسا ابھی اور اسی وقت کر سکتا ہوں' بولو تم مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں۔ جلدی بولو ورنہ میں ابھی اور اسی وقت بچے کی جان لے لوں گا۔" وہ غصے سے بولا۔
کاشف کی جان لینے کی دھمکی پر میں تڑپ اٹھی اور اس کی منت سماجت کر کے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کسی طور پر بھی تیار نہ تھا۔ وہ ہر حالت میں ہاں سننا چاہ رہا تھا۔
"میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو' تم جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہو میں کیسے تم سے شادی کر سکتی ہوں' اور محلے والے میرے کردار کے بارے میں کیا سوچیں گے۔" میں نے کہا۔
"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں تم اس لیے خوف زدہ ہو کہ تمہارے بچے ہونے پر محلے والے تمہارے کردار پر شک کریں گے۔"
"ہاں' مجھے کاشف کے جوان ہونے تک اس محلے میں رہنا ہے۔"
"ہم دونوں ایک سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔"
"کیسا سمجھوتا؟" میں چونکی۔
"تم میری بن جاؤ اور تمہارے کوئی بچہ نہیں ہوگا یہ میرا تم سے وعدہ ہے' دیکھو تم اس پوزیشن میں ہو کہ تمہیں کوئی سہارا مل جائے میں تمہارا مضبوط سہارا بن جاؤں گا' پھر کسی کی مجال نہیں کہ محلے یا باہر کا تم پر بری نگاہ ڈال سکے گا' تم نے کسی انسان سے شادی کر بھی لی تو وہ تمہارے بیٹے کو اپنے بچوں جیسا پیار نہیں دے گا وہ اس کی خواہشات پوری نہیں

کرے گا اور تم یہ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہو گی مجھ سے نکاح کرنے پر تم جو چاہو گی وہ ہوگا' کاشف کو اعلیٰ تعلیم دلا کر بڑا آدمی بنانا جو رقم تمہیں چاہیے وہ میں تمہیں لا کر دوں گا۔ مجھ سے تمہارے نکاح کرنے کا ہمارے قبیلے کے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' سوائے ہمارے چند بزرگوں کے۔'' شمروز جن بولا۔

''اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔''

''تم اچھی طرح سوچ لو مگر جواب مجھے ہاں میں چاہیے ورنہ تم کاشف سے محروم ہو جاؤ گی۔'' اس نے کاشف کو مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' میں سہارے کی غرض سے کسی آدمی سے شادی کر بھی لوں تو یہ ظالم میرے کاشف اور ہونے والے شوہر کو جان سے مار دے گا اور سوچتے سوچتے مجھے یہی خیال آیا کہ اس کی بات مان لینی چاہیے اس میں میری بھلائی ہے کبھی کبھی اپنے فائدے کے لیے دشمن سے بھی ہاتھ ملا لیا جاتا ہے۔ جنات قبیلے سے اس کے چند بزرگ آئے اور میرا اس سے نکاح پڑھوا دیا گیا' مجھے اس سے شدید نفرت ہونے کے باوجود اس کی شریک حیات بن گئی' نکاح ہو جانے پر اس نے شوہر کی طرح میرا ہر طرح سے خیال رکھا اور اپنے وعدے پر بھی قائم رہا لیکن اب جب سے تم آئی ہو وہ وعدہ خلافی پر اتر آیا ہے اس نے مجھے طلاق دے دی ہے اور مجھے آئے دن کاشف کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔''

''شمروز جن کیا چاہتا ہے؟'' نائمہ نے پوچھا۔

''اس کی تم پر بری نظر ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں تمہارا نکاح اس سے کرا دوں کیونکہ تم اسے پسند آ گئی ہو۔''

''آپ کا سابقہ شوہر ہونے کے ناطے وہ میرا سسر ہوا' کیا اس کو رشتے ناطوں کا بھی خیال نہیں ہے۔''

''اس نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔''

''پھر آپ نے اس سے کیا کہا؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں میں ابھی تک اسے سمجھا رہی ہوں اور بس۔'' ساس نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ اسے کچھ دن اور سمجھاؤ۔'' نائمہ نے کہا۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''مجھے کچھ سوچنے دو' اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔'' نائمہ نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

جمعرات کے دن جب نائمہ نے ساس کو ساتھ چلنے کو کہا وہ چونکی۔

''کہاں جانا ہے؟''

''بس آپ کی کسی سے ملاقات کرانی ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

''بہو کے کہنے پر ساس شہناز بیگم کو باہر جانا پڑا' جب رکشہ ایک مزار کے پاس رکا وہ چونکی۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟''

''آپ مجھ پر اعتماد کریں یہاں آنے والوں کو فیض ہی ملتا ہے۔'' نائمہ نے کہا۔

وہ دونوں مزار کے احاطہ میں ایک جگہ بیٹھ گئیں۔ نائمہ وہاں بیٹھی کچھ وظائف پڑھتی رہی' ایک گھنٹہ گزر جانے پر وہ ساس کو لے کر گھر آ گئی۔

رات بڑی پُرسکون گزری' صبح بیدار ہونے پر ساس نے بتایا کہ ناگ نے اس کے مزار پر جانے پر بہت غصہ کیا ہے۔

''بس غصہ ہی کیا ہے نا؟''

''ہاں غصہ ہی کیا ہے پہلے ہاتھ اٹھا لیتا تھا مگر وہ دور دور سے جو منہ میں آ رہا تھا بول رہا تھا اور دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ نائمہ بیٹی مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''امی جان کچھ نہیں ہوگا' جن حالات میں آپ نے اس سے سمجھوتہ کیا اس وقت حالات کچھ اور تھے اب اور ہیں' وہ ہم لوگوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ ہے اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' نائمہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''بس بیٹی اس سے ڈر لگا رہتا ہے کہیں وہ نقصان نہ پہنچا دے۔''

''امی جان بے فکر رہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

پہلی' دوسری' تیسری اور چوتھی جمعرات گزر چکی تھیں۔ شمروز جن ساس شہناز پر ہر جمعرات کو مزار پر جانے پر غصہ ضرور ہوتا تھا' مگر اس نے تشدد نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا

اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی' شہناز بھی اب مطمئن ہوگئی تھی اور اس نے ناگ سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ پانچویں جمعرات کو نائمہ بہت خوش تھی اس نے ساس سے کہا۔

''دیکھو امی یہ ناگ کیسا بکری بن کر رہ گیا ہے' نا ہی کسی قسم کا نقصان پہنچاتا ہے اور نہ ہی آپ پر اس نے تشدد کیا ہے۔''

''ہاں بیٹی تم ٹھیک کہہ رہی ہو واقعی اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا اب یہ دھمکی بھی دیتا ہے تو بڑے دبے دبے لفظوں میں دیتا ہے ایسا لگتا ہے اسے کسی قسم کا خوف بیٹھ گیا ہے۔'' ساس نے کہا۔

''امی آپ نے اسے بہت ڈھیل دے دی تھی اس لیے وہ شیر ہوکر اپنی من مانی کرنے لگا تھا۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' نائمہ نے کہا۔

''میں بہت مجبور ہوگئی تھی۔ شوہر اور پھر والدہ کے انتقال کے بعد مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔''

''مشکل وقت میں اللہ والوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے' ہم جس بزرگ کے مزار پر جارہے ہیں وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں' ان کے در پر آنے والوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔''

''ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری بھی مرادیں پوری ہوں گی۔'' ساس نے کہا۔

مزار پر صاحب بابا کے عقیدت مند آرہے تھے اور کچھ بیٹھ کر چلے جارہے تھے' دونوں ساس بہو بھی حاضری کی نیت سے مزار کے ایک کونے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں' اچانک انہیں ایک بزرگ نظر آئے جو ایک جانب بیٹھے تھے۔ انہوں نے اشارے سے دونوں کو پاس بلایا۔

''تم بہت پریشان ہو۔'' بزرگ نے ان کے پاس آنے پر کہا۔

''ہاں بابا۔'' ساس نے کہا۔

''وہ مردود اب اپنی من مانی نہیں کرسکے گا' اسے اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔''

''بابا ایسا ہوجائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔''

''میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرنا' سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''بابا ہم ایسا ہی کریں گے۔'' نائمہ نے کہا۔

بزرگ نے چند وظائف پڑھنے کو بتائے اور پھر کہا۔ ان وظائف کی مدد سے اس کی عقل ٹھکانے آجائے گی' اور ہاں تمہاری ساتویں جمعرات کو وہ جن گھر میں خوب ہنگامہ کرکے تمہیں مزار پر آنی سے روکنے کی کوشش کرے گا' دھمکیاں بھی دے گا مگر تم اس کی بالکل بھی پروا نہیں کرنا اور جمعرات کو لازمی حاضری دینے کو آنا جب حاضری دے کر گھر جاؤ گی تو تم دیکھنا کس طرح وہ جن تمہارے پاؤں پڑ کر معافیاں مانگ کر رخصت ہوتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا ہم آپ کی ہر بات پر آنکھ بند کرکے عمل کریں گے۔'' نائمہ نے کہا۔

گھر پہنچنے پر شمروز جن نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا مگر زیادہ غصہ نہیں کیا۔ ساس اور بہو نے بزرگ کے کہنے پر وظائف باقاعدگی سے پڑھنا شروع کردیئے تھے اور پھر آخری جمعرات بھی آگئی' جب ساس اور بہو مزار پر جانے کو تیار ہوئیں شمروز جن ان کے سامنے آگیا۔

''تم دونوں کہاں جارہی ہو؟'' وہ غصہ سے بولا۔

''تم کون ہوتے ہو ہم سے یہ پوچھنے والے۔'' نائمہ نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

''میں تم دونوں کو جلا کر بھسم کردوں گا' تم خود کو کیا سمجھتی ہو۔'' وہ بولا۔

''میری ساس تم سے ڈرتی رہیں اور تم اسے ڈراتے رہے' میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں میں نہیں آنے والی۔ ہمت ہے تو ہمیں جلا کر دکھاؤ۔'' نائمہ نے غصے سے کہا۔

''بہت اکڑ ہے میں تیری اکڑ نکال کر ہی دم لوں گا۔'' شمروز جن نے کہا۔

''چل ہٹ ہمارے راستے سے۔'' نائمہ نے غصے سے کہا۔

شمروز جن نے غصے سے انہیں ایسے دیکھا جیسے ابھی جلا کر بھسم کردے گا۔ ساس ایک لمحے کو ڈر سی گئی اور نائمہ کے پیچھے چھپ گئی۔

''امی جان اس سے بالکل ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' صرف دھمکیاں ہی دے سکتا ہے۔'' نائمہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

شمروز جن کو نائمہ سے بالکل بھی اس طرح کی دلیری کی امید نہ تھی۔ اس لیے تھوڑا نرم پڑ گیا۔

''میں تمہیں مزار پر جانے سے نہیں روک رہا' بس اس جمعرات کو نہیں جاؤ' اگلی جمعرات کو چلی جانا۔''

''کیوں کیا آج تمہاری ماں کا چہلم ہے جو آج نہیں جائیں۔'' نائمہ نے کہا۔

شمروز حیرت سے نائمہ کو دیکھ رہا تھا کہ یہ کس قدر بہادر ہے ورنہ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ ڈر کر کمرے میں دبک جاتی۔ شہناز اشارے سے نائمہ کو نرم لہجہ اپنانے کو کہہ رہی تھی مگر وہ کسی بھی صورت میں شمروز جن کے سامنے دبنا نہیں چاہ رہی تھی۔

''تجھے خود پر گھمنڈ ہے' میں ابھی تیرا گھمنڈ نکالتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شمروز نے کچھ پڑھ کر ان دونوں پر پھونکا۔

ان دونوں کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ وہ خود ہی ایک جھٹکے سے دور جا گرا۔ نائمہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

وہ دونوں ناگ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ شمروز جن ان دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔

مزار پر بابا نظر نہیں آ رہے تھے کچھ دیر گزرنے پر وہ نظر آ گئے۔ وہ دونوں بابا کے پاس گئیں اور ادب سے انہیں سلام کیا۔ بابا انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

''اس مردود نے تمہیں یہاں آنے سے روکا ہوگا۔''

''بابا کوشش اس نے کی تھی مگر ناکام رہا۔'' نائمہ نے کہا۔

''اس کے جھٹکے سے دور جا گرنے پر عقل ٹھکانے آ گئی ہوگی۔''

''ہاں بابا ایسا ہی ہوا تھا۔'' شہناز نے کہا۔

''میری بیٹیوں تم بے فکر ہو جاؤ' وہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے' اس کے علاوہ بھی کبھی پریشانی ہو' یہاں چلی آنا' اور ہاں یہ پانی کی بوتل ہے اس پانی کو مکان کے چاروں کونوں میں چھڑک دینا اور باقی جو بچے وہ صحن میں جو درخت ہے اس کی جڑوں پر ڈال دینا۔'' بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بابا سے پانی کی بوتل لے کر گھر چلی آئیں' پانی کا گھر میں چھڑکنا تھا کہ شمروز بے چین ہو گیا اور اس نے دونوں سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔

''خدا کے لیے اس پانی کو درخت کی جڑوں پر مت ڈالنا' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا' تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔'' وہ بولا۔

''ایسا ناممکن ہے' بابا نے جو مجھے کہا ہے وہ کرنا پڑے گا۔''

''دیکھو نائمہ تم مجھ سے جو مانگو گی میں وہ دینے کو تیار ہوں' بولو تمہیں کیا چاہیے۔'' نائمہ نے شمروز کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بچا ہوا پانی درخت کی جڑوں پر ڈال دیا۔

''تم نے یہ اچھا نہیں کیا نائمہ میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں' پھر کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے شمروز جن غائب ہو گیا' اس کے جانے کے بعد شہناز اور نائمہ نے سکھ کا سانس لیا۔

''دیکھ لیا امی کتنی آسانی سے اس منحوس سے جان چھوٹ گئی۔''

''ہاں نائمہ بیٹی تم نے بہت بہادری کا کام کیا ہے' یہ کام مردوں کے کرنے کے ہوتے ہیں جو تم نے کیا ہے۔''

''امی یہ جنات ایسے قابو نہیں آتے بلکہ اور زیادہ تنگ کرتے ہیں' ان کو پڑھائی سے قابو کیا جاتا ہے' میں اس طرح کے چند واقعات دیکھ چکی ہوں' ہمارے رشتے داروں میں چند لوگوں کو تنگ کر رہے تھے اور پھر وہ صاحب مزار کے آستانے پر حاضری دینے سے وہ جنات بھاگ گئے تھے۔'' نائمہ نے بتایا۔

''ہاں بیٹی میں بھی گھر سے نکل کر تھوڑی کوشش کر لیتی تو اس طرح پریشان نہ ہوتی۔ بس جو مقدر میں لکھا تھا وہ ہو کر رہا۔''

''امی انسان اگر ہمت کرے تو مقدر کا لکھا بھی ٹل سکتا ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے۔'' نائمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

شہناز بھی جواب میں مسکرا دیں۔



عشق وشق

مہتاب خان

اتفاقات بھی زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں کچھ اتفاقات تو بڑے حسین اور رنگین ہوتے ہیں جبکہ بعض اتنے سنگین اور خوف ناک ثابت ہوتے ہیں کہ انسان ان کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

نئے دور کی نسل کا المیہ جو سوچے سمجھے بغیر سمندر میں چھلانگ لگا دیتی ہے

وہ اتوار کا دن تھا' چھٹی ہونے کی وجہ سے علی رضا دیر تک سوتا رہا تھا۔ پروفیسر جاوید انصاری صاب اس کے کمرے میں آئے تو وہ لمبی تانے سو رہا تھا۔

پینتالیس پچاس سالہ پروفیسر صاحب بڑے خوش مزاج اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شہر کی ایک مشہور پرائیویٹ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ علی رضا کا تعلق پنجاب کے کسی دور دراز گاؤں سے تھا جہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے سہولیات میسر نہیں تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہی وہ کراچی آیا تھا اور شروع میں اس نے اپنے گاؤں کے کچھ دوستوں کے ساتھ رہائش اختیار کی تھی۔ کچھ عرصے پہلے ہی وہ پروفیسر صاحب کے اس بنگلے میں شفٹ ہوا تھا۔

جاوید انصاری صاحب کا یہ بنگلہ گلشن اقبال میں واقع تھا۔ یہ مکان تین منزلہ تھا' گراؤنڈ فلور میں جاوید صاحب نے کوچنگ سینٹر کھولا ہوا تھا جو بہت منافع بخش چل رہا تھا۔ علی رضا ان کا ایک ہونہار اسٹوڈنٹ تھا علی اور ایک دو اور ٹیچرز یہاں قرب وجوار سے آنے والے طالب علموں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔

جب انہیں علی کی رہائش کے مسائل کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے اسے اپنے گھر میں رہنے کی آفر دی تھی جو اس نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لی تھی۔ ویسے بھی پروفیسر صاحب اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہا کرتے تھے۔ ان کی بیوی چند سال پہلے مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھیں جبکہ ان کے دونوں بیٹے ملک سے باہر رہائش پذیر تھے۔

جاوید صاحب نے علی کا کندھا ہلا کر اٹھایا۔

''کب تک سوؤ گے یار اٹھو۔ بہت بھوک لگی ہے۔ آج ناشتہ باہر کریں گے۔'' وہ بادل نخواستہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر وال کلاک پر گئی۔ دن کے بارہ بجے تھے۔

''یہ کون سا ناشتے کا ٹائم ہے؟''

''تم تیار تو ہو لو جائے گا ناشتہ۔'' وہ بولے۔

علی عجلت میں تیار ہوا اور دونوں گھر سے نکل آئے۔ ان کی کار کا رخ ایک دو بلاک آگے ایک ریستوران کی جانب تھا جہاں کے کھانے بڑے لذیذ ہوا کرتے تھے۔

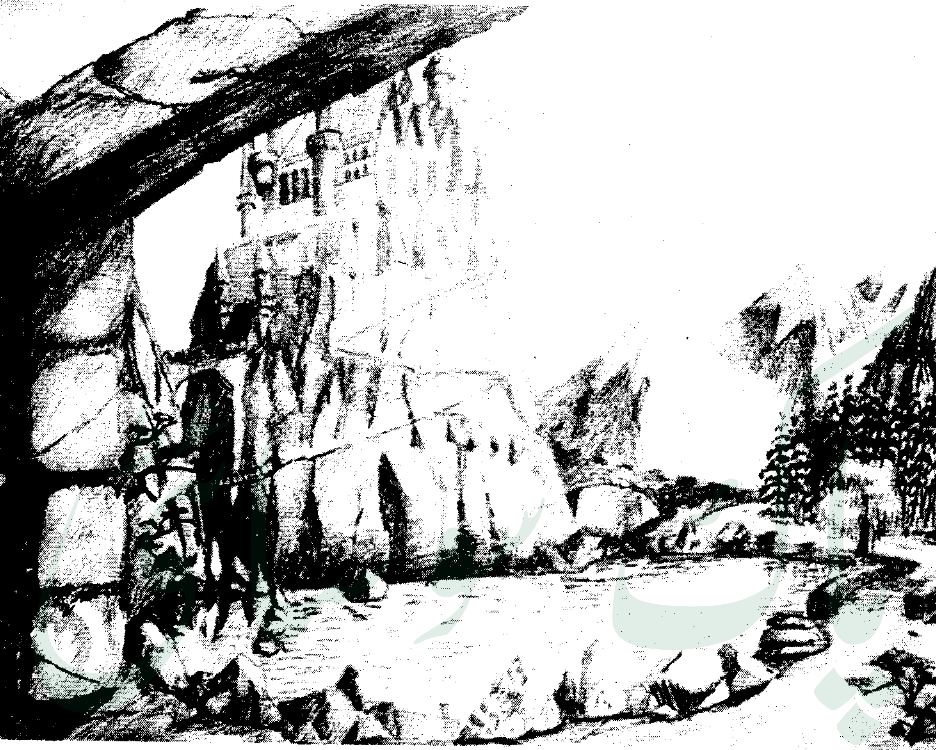
☆......☆......☆

اس پرانی لیکن طاقتور انجن والی کار میں تین افراد بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا' جبکہ پیچھے ایک تنومند شخص کے ساتھ ایک دبلا پتلا اٹھارہ انیس سالہ نوجوان لڑکا سہما بیٹھا تھا۔ اس ڈر کی وجہ وہ پستول تھا جو اس کی پسلیوں سے لگا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''چپکا بیٹھا رہ تجھے جلد پتا چل جائے گا۔'' ڈرائیونگ کرنے والے شخص نے سفاک لہجے میں کہا۔ لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بہت خوش نظر آ رہا تھا بولا۔

''استاد کو بتا دوں لڑکا ہم نے اٹھا لیا ہے۔''



''جیسی تیری مرضی۔'' ڈرائیور بولا۔

''کون ہو تم لوگ اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''اتنی جلدی کیا ہے آرام سے بیٹھو سب پتا چل جائے گا۔'' اس کے برابر بیٹھا ہوا شخص بولا۔

اس دوران کار ایک ٹریفک سگنل پر رکی اور اس شخص نے جیب سے موبائل نکالا' رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔

''ہاں استاد میں بات کر رہا ہوں' جی لڑکا ہم نے اٹھا لیا ہے۔'' ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ نوجوان نے اچانک کار کا دروازہ کھولا اور نیچے لڑھک گیا۔

''ارے......'' وہ تیزی سے چلایا۔

موبائل پر بات کرنے کے دوران اس کا پستول والا ہاتھ اس نوجوان کے پہلو سے ہٹ گیا تھا جس کا فائدہ لڑکے نے اٹھایا تھا۔

گزشتہ دس منٹ سے وہ نوجوان اتنی فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہا تھا کہ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ فرار کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ یہ حرکت اس نے اپنی جان پر کھیل کر کی تھی۔ اسی لمحے سگنل کھلا اور گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔

نوجوان نیچے اتر کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ فون کرنے والا فون سیٹ پر پھینک کر تیزی سے باہر لپکا' اس نے دیکھا نوجوان چلتی گاڑیوں کے درمیان تیزی سے روڈ کراس کر چکا تھا۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا ڈرائیور بھی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر ان کے پیچھے بھاگا...... عقب میں موجود گاڑیوں نے ہارن بجانے شروع کر دیئے تھے۔

سڑک کراس کرنے میں انہیں دیر لگی تھی اور جب تک

وہ اس کی طرف آتے نوجوان غائب ہو چکا تھا۔ وہ دونوں دیر تک پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتے رہے تھے' پھر مایوس ہو کر واپس پلٹ گئے۔ ان کے پیچھے گاڑیوں کا رش لگ گیا تھا۔

"تجھے فون کرنے کی بڑی جلدی تھی نا۔ کیا ضرورت تھی؟" ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ اب استاد کو تو ہی جواب دینا کال بھی کر دی چھپا بھی نہیں سکتے ورنہ بول دیتے کہ بندہ نہیں ملا۔" اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹا آس پاس ہی چکر لگاتے رہے مگر نوجوان نہیں ملا' مایوسی کے عالم میں وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اس دوران انہوں نے استاد کو کال کر کے نوجوان کے فرار ہونے کی اطلاع دی تھی اور جواب میں گالیاں بھی کھائی تھیں۔

ان بدمعاشوں کے روانہ ہو جانے کے بعد نوجوان نے ایک کار کی عقبی نشست سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ کار سے اترنے ہی والا تھا کہ صاحب کار کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ جلدی سے سیٹوں کے درمیان والی جگہ پر دبک گیا۔ ان بدمعاشوں کو چکما دے کر وہ اس کار میں گھس گیا تھا جو اسے جانی پہچانی لگی تھی۔ اتفاق سے وہ لاک نہیں تھی۔

علی اور جاوید انصاری ریسٹوران سے باہر آئے پیٹ بھرنے کے بعد جاوید صاحب کا موڈ خوشگوار تھا انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی کہا۔

"حد ہو گئی میں کار لاک کرنا کیسے بھول گیا؟" علی ان کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

انہوں نے پچھلی نشست پر رکھے اپنے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اچانک ان کی نظر وہاں نشستوں کے درمیان لیٹے ہوئے نوجوان پر پڑی جو انہیں دیکھ کر معصومیت سے مسکرایا تو بے ساختہ وہ بھی مسکرا دیئے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ وہ بغیر اجازت ان کی کار میں گھسا ہے۔ اس نوجوان کا چہرہ انہیں کچھ جانا پہچانا لگا تھا۔ وہ بوکھلا کے سیدھا ہو گیا۔ اسی وقت علی رضا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ وہ ان کے کوچنگ سینٹر میں ٹیوشن لینے کے لیے آنے والا انٹرمیڈیٹ کا طالب علم رامیس قریشی عرف راجو تھا۔ علی کار سے اتر کر پچھلی نشست پر آ گیا۔

"تم ہماری کار میں کیا کر رہے ہو...... راجو؟"

"دروازہ کھلا تھا اس لیے اندر آ گیا۔" راجو نے سادگی سے کہا۔ علی بھنا گیا۔

"لیکن تم اندر آئے کیوں؟"

"کوئی کسی کی کار میں بغیر اجازت کیوں آتا ہے؟ اس کی نیت ٹھیک نہیں لگی۔" جاوید صاحب نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میں بری نیت سے نہیں آیا تھا سر۔" راجو نے احتجاج کیا۔

"پھر تمہارا کیا مقصد تھا؟" علی نے کہا۔

"وہ...... میں اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے یہاں چھپ گیا تھا۔" راجو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تم اور دشمن...... ابھی تو تم ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئے اور دشمنیاں بھی پال رکھی ہیں...... واہ برخوردار۔" جاوید انصاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے کوئی دشمنی نہیں پالی۔" وہ برا مان کر بولا۔ "وہ خود میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے اغوا کیا تھا وہ مجھے پکڑ کر نہ جانے کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ سگنل پر گاڑی رکی تو میں ان کی کار سے بھاگ نکلا۔"

"کوئی کسی کو بلاوجہ نہیں پکڑتا' تم نے کچھ کیا ہوگا؟" علی نے استفسار کیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"میں گھر سے بھاگا ہوا ہوں۔" علی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"بھاگتی تو لڑکیاں ہیں لڑکے کب سے گھر سے بھاگنے لگے۔" راجو کا لہجہ دکھی ہو گیا۔

"اڑا لیں جی مذاق بہت مجبوری میں گھر سے بھاگا ہوں۔"

"لڑکیاں بھی یہی کہتی ہیں' جب پکڑی جاتی ہیں۔" ان دونوں کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"یار مجھے تو یہ بڑا معصوم اور سادہ لگ رہا ہے اسے گھر

لے چلتے ہیں' وہاں سکون سے بیٹھ کر اس کی کہانی سنیں گے۔''

''کیوں نا تمہیں تمہارے گھر لے چلیں۔ تمہارے گھر والوں سے جو بھی تمہارے اختلافات ہیں ہم ان کو سمجھا بجھا کر انہیں دور کر دیں گے۔'' علی نے کہا تو وہ اچھل پڑا۔

''ہرگز نہیں' میرے ابا مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ میرے ابا کو نہیں جانتے وہ قصائی ہیں۔''

''شرم آنی چاہیے تمہیں اپنے باپ کو قصائی کہہ رہے ہو۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں' وہ قصائی ہیں۔ میرا مطلب ہے ہم ذات کے قصائی ہیں۔''

''اوہ...... اچھا۔''

''مجھے جانے دیں گاڑی روکیں میں آپ کے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔''

''برخوردار اتنی جلدی بھی کیا ہے ممکن ہے ہم تمہارے کسی کام آ جائیں۔'' جاوید صاحب نے کہا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ راجو نے ان کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھا۔

''آپ ہماری مدد کریں گے؟'' علی چونکا۔

''ہماری...... تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' راجو بوکھلا گیا۔

''جی نہیں میں اکیلا ہوں۔''

''تم نے ہماری کا لفظ استعمال کیا ہے۔'' علی نے کہا۔

''غلطی سے کہہ دیا سر......'' وہ سر جھکائے بولا۔

لیکن ان دونوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دس منٹ بعد وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ علی لڑکے کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آیا تھا' کچھ دیر بعد جاوید انصاری بھی آ گئے تو علی راجو کے لیے چائے بنانے کچن میں آ گیا۔ اس دوران جاوید انصاری لڑکے سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ علی چائے اور دیگر لوازمات لیے کمرے میں آیا تو راجو نے کہا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ ناشتہ لینے تو نکلا تھا میں۔''

''ہاں بھئی راجو اب فرفر بتا دو کہ وہ لوگ تمہیں کیوں اغوا کر کے لے جا رہے تھے غلط بیانی کی تو ہم خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں آپ سے سچ بولوں گا۔ مگر میری ایک شرط ہے۔''

''کیا کہنے بھئی اب تمہاری شرط بھی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''یہ تو ہم سننے کے بعد فیصلہ کریں گے۔''

اس دوران راجو چائے اور لوازمات پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دبلے پتلے راجو نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری ٹرے چٹ کر لی تھی۔ اس کی جسامت سے قطع نظر اس کی خوراک بہت اچھی تھی۔ علی بہت ضبط کر رہا تھا جبکہ جاوید صاحب اس کی حالت دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے پی کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں جی پوچھیں جو پوچھنا ہے۔''

''ہمیں کچھ نہیں پوچھنا تمہیں بتانا ہے۔'' علی نے کہا۔

''شروع سے سناؤ۔''

''کہانی تو جی بڑی لمبی ہے۔''

''فکر مت کرو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔'' علی نے کہا۔

''رانو ہمارے محلے میں رہتی ہے۔ اس کا اصل نام رانی ہے۔ سب پیار سے اسے رانو کہتے ہیں۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی ہمارے محلے میں آئے تھے ان کا تعلق گجرنوالہ سے ہے اس کے ابا وہاں کے بڑے مشہور پہلوان ہیں۔'' علی نے کہا۔

''خیر ہو بھئی پہلوانوں کی بیٹی اور قصائیوں کا بیٹا۔ تم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کچھ ملاقاتیں ہوئیں جو محبت میں بدل گئیں۔ پھر تم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور ساری عمر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ اب آگے بتاؤ پھر کیا ہوا؟'' علی نے کہا تو راجو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''برخوردار اس عمر میں سب اس دشت کی سیاحی کرتے ہیں' خیر چھوڑو یہ بتاؤ تم دونوں گھر سے کب بھاگے؟'' جاوید انصاری جو بڑی دلچسپی سے باتیں سن رہے تھے بولے۔ راجو مزید دم بخود رہ گیا۔

''آپ یہ بھی جانتے ہیں؟''

''ہاں برخوردار اتنا تو جان لیتے ہیں۔'' جاوید انصاری نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''اب تم اصل کہانی کی طرف آؤ۔ تمہارے اور اس کے والد نہیں مانیں ہوں گے۔'' راجوان سے سخت متاثر ہو رہا تھا بولا۔

''آپ لوگ تو بہت ذہین ہیں۔''

''یہ بتاؤ کہ گھر سے بھاگنے کا پلان کس کا تھا؟'' علی نے پوچھا۔

''ہم دونوں تو جی کبھی ہمت نہیں کرتے مگر میرا ایک دوست ہے انور' اس نے کہا تھا بس یہی ایک صورت ہے تم دونوں کے ایک ہونے کی۔''

''یہ انور کون ہے اور تم اسے کب سے جانتے ہو؟'' جاوید صاحب نے پوچھا۔

''انور سے میری دوستی فیس بک پر ہوئی تھی۔''

''کیا......؟'' وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے۔

''یعنی تم پہلے سے اسے نہیں جانتے تھے؟''

''نہیں جی۔''

''کتنا عرصہ ہوا تمہاری دوستی کو؟''

''یہی کوئی دو تین مہینے۔''

''اور تم نے اس کی باتوں میں آ کر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا؟'' علی نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا پھر جاوید انصاری کو دیکھا۔ جن کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارے والد یا کسی اور کو انور کے بارے میں علم ہے؟'' جاوید صاحب نے پوچھا۔

''نہیں میں نے کسی کو نہیں بتایا کیونکہ انور نے مجھے منع کیا تھا۔''

''یعنی تمہارے گھر میں کوئی نہیں جانتا کہ تمہارا کوئی انور نام کا دوست بھی ہے۔'' اس بار علی نے سوال کیا۔

''جی۔''

''ٹھیک ہے اس کے بعد کیا ہوا؟'' علی نے کہا۔

''وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ محلے میں آتے جاتے اکثر ہمارا سامنا ہوتا تھا وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی' پھر ہمارے درمیان موبائل نمبرز کے تبادلے ہوئے' ہم موبائل اور فیس بک کے ذریعے رابطے میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ گھر والوں سے چھپ کر مجھ سے ملنے بھی آتی تھی۔ ایک ملاقات میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ برادری سے اس کے رشتے آ رہے ہیں اور اس کے گھر والے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تم نے اپنی امی ابا یا گھر والوں میں کسی کو بتایا تھا کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں نے ماں جی کو بتایا تھا۔ امی نے ابو سے بات کی تو ابا نے مجھے بہت مارا تھا' ابا نے کہا تھا کہ اس کا خیال دل سے نکال دوں۔''

''لیکن ظاہر ہے تم نے اس سے ملنا نہیں چھوڑا ورنہ نوبت یہاں تک کیوں آتی۔'' جاوید صاحب بولے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کب کیا تم دونوں نے اور وہ اتنی آسانی سے تمہارے ساتھ بھاگنے پر تیار کیسے ہوگئی؟''

''گھر سے بھاگنے کا سارا پلان انور نے ترتیب دیا تھا۔ وہ میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ میری اس سے ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ اسی نے مجھے حوصلہ دیا تھا۔'' علی رضا اور جاوید انصاری نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا' پھر علی نے انور کے بارے میں اس سے کئی سوالات کیے' ان کو پتا چلا کہ راجو انور کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ وہ اس کا اچھا دوست ہے۔ وہ اپنے لباس اور انداز سے بہت مہذب لگتا ہے۔ لیکن وہ کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے؟ اور اس سے اتنی ہمدردی کیوں دکھا رہا ہے؟ راجو کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ جاوید صاحب علی کو اس سے کچھ دور لے گئے اور بولے۔

''مجھے لگ رہا ہے انور نامی یہ شخص راجو کو بیوقوف بنا رہا ہے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' علی نے کہا۔ وہ اس کے پاس واپس آئے۔ وہ کیک کا بچا ہوا پیس کھانے میں مشغول تھا۔

''یار پریشانی میں تو آدمی کی بھوک پیاس مر جاتی ہے اور تم ہو کہ کھائے چلے جا رہے ہو۔'' علی جھلا کر بولا۔

''سر مجھے پریشانی میں بہت بھوک لگتی ہے۔'' علی نے ٹھنڈی سانس بھری' وہ اس نئی پود کے عاشق کو دیکھ کر حیران تھا جسے حالات کی سنگینی کا احساس تک نہیں تھا۔ جاوید

انصاری نے کہانی کو دوبارہ ٹریک پر لانے کے لیے کہا۔

''ٹھیک ہے جب انور نے تمہیں گھر سے بھاگنے کا مشورہ دیا پھر تم نے کیا کیا؟''

''انور نے کہا تھا اگر ہم دونوں گھر سے بھاگ کر شادی کرلیں تو ہمارے گھر والے مجبور ہوجائیں گے۔''

''گویا انور نے پہلے سے پلان بنایا ہوا تھا۔'' جاوید صاحب نے کہا۔ ''اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ بھاگ کر کہاں جانا ہے' ظاہر ہے تمہارے پاس تو کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔'' اس نے سر ہلایا۔

''جی یہ سب اسی نے بتایا تھا۔''

''اور تم اتنے احمق تھے کہ اس کی باتوں میں آگئے۔'' علی نے کہا۔

''میں احمق نہیں ہوں۔'' وہ برا مانتے ہوئے بولا۔

''انور میرا بہت اچھا دوست ہے۔'' علی کا ضبط جواب دے گیا۔

''دوست کے بچے اس نے تمہیں مروادیا۔ اب پولیس تمہیں اور رانو کو تلاش کررہی ہوگی۔ رانو کے اغوا کے الزام میں وہ تمہیں دھرلے گی۔''

''پولیس وہ کیوں تلاش کرے گی۔ رانو کے ابا پولیس میں رپورٹ نہیں کروائیں گے۔ لڑکی کے گھر والے ایسے معاملے میں رپورٹ نہیں کرواتے اور اپنے ابا کو میں جانتا ہوں وہ اس معاملے سے خود نمٹیں گے اور میری بوٹیاں بنادیں گے۔ مجھے صرف ابا کا ڈر ہے۔''

''تم دونوں کے ابا اس مسئلے میں پولیس کی مدد لے سکتے ہیں' تمہیں حالات کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔'' علی نے کہا۔ ''بہرحال پھر کیا ہوا؟'' راجو نے کہا۔

''میں نے گھر سے بھاگنے کا پلان رانو کو بتایا تو وہ حیرت انگیز طور پر جلدی مان گئی تھی اور راجو سے کہا تھا' ہمارے پاس بس یہی طریقہ ہے کہ گھر سے بھاگ کر شادی کرلیں۔''

''تو تم تیار ہو؟'' راجو نے کہا تھا۔

''ہاں ہم شادی کے بعد کہیں چھپ کر رہ لیں گے۔'' رانو نے جوش سے کہا تھا۔

کم عمری کا رومان ایسے ہی عقل خبط کردیا کرتا ہے۔ اس محبت نے اسے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی کہ گھر سے بھاگ کر وہ کہاں جائیں گے' کیا کریں گے اور کیسے زندگی گزاریں گے۔ راجو خوش ہوگیا کہ رانو اتنی آسانی سے مان گئی تھی اس نے انور کو بتایا جو اس کا راز دار اور پُر اعتماد دوست بن گیا تھا۔ سارا پلان انور نے اس کے گوش گزار کردیا تھا۔ جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگنے سے پہلے جتنا ہوسکے مال و دولت سمیٹ لیں۔ دونوں گھرانے دولت مند تھے۔ راجو کے باپ کی شہر میں کئی دکانیں تھیں جو بہت اچھی چلتی تھیں۔ وہ بینک میں اپنی دولت رکھنے کے قائل نہیں تھا اور اپنی تمام دولت گھر میں موجود تجوری میں رکھتا تھا۔ رانو بھی اپنے گھر سے زیورات اور رقم لانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ فرار سے ایک رات پہلے راجو نے تجوری میں سے دس لاکھ نکال کر ایک چرمی بیگ میں رکھ لیے تھے۔ جبکہ رانو بھی گھر کا تمام زیور جس کی مجموعی مالیت تقریباً بیس پچیس لاکھ تھی سمیٹ لائی تھی۔

''وہ رقم اور زیور کہاں ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''وہ تو انور نے ہم سے لے لیا تھا چوری چکاری کے ڈر سے۔'' علی نے سر پیٹ لیا اور سرد آہ بھر کے بولا۔

''خود انور کہاں ہے؟''

''فلیٹ میں۔'' راجو بولا۔

''کون سے فلیٹ میں؟''

''جہاں میں اور رانو رہ رہے ہیں۔ میں وہیں سے تو ناشتہ لینے نکلا تھا۔ میں حلوائی کی دکان سے حلوا پوری لے رہا تھا جب دو افراد نے پکڑ کر مجھے گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ وہ تو میں نے چالاکی دکھائی اور راستے میں بھاگ نکلا۔'' علی اور جاوید انصاری اس چالاک کی عقل پر ماتم کرنے لگے۔

گزشتہ روز وہ دونوں گھر سے فرار ہوکر اس فلیٹ پر پہنچے تھے جس کا انتظام انور نے کیا تھا۔ یہ فلیٹ حسن اسکوائر کے نزدیک واقع تھا۔ انور نے راجو کو پہلے ہی یہ فلیٹ دکھا دیا تھا۔

''انور تم دونوں کے ساتھ ہی ٹھہرا تھا۔'' جاوید صاحب نے دریافت کیا۔

''ہاں رات وہ ہمارے ساتھ رکا تھا۔ ایک کمرے میں' میں اور انور اور دوسرے کمرے میں رانو تھی۔ انور نے کہا تھا

صبح وہ ہمارا نکاح پڑھوا دے گا۔''

''وہ تمہارا اتنا ہی بے لوث دوست تھا تو تم دونوں سے رقم کیوں منگوائی تھی۔'' اچانک علی چونکا۔ ''یہ بتاؤ ناشتہ لینے وہ کیوں نہیں گیا' تم خود گئے تھے یا اس نے تمہیں بھیجا تھا؟''

''اس نے بھیجا تھا۔ اسے ایک دو فون کرنے تھے ہمارے نکاح کا بندوبست کرنے کے لیے۔''

''اور باہر نکلتے ہی ان دونوں نے تمہیں پکڑ لیا۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''جی وہ جب مجھے لے کر جا رہے تھے تو راستے میں ایک نے کسی کو فون کیا تھا اسے میرے بارے میں بتا رہا تھا۔'' علی' جاوید انصاری کو دور لے گیا۔

''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے ہم ایک مصیبت کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو اس سے جان چھڑائیں۔'' وہ بھی اب مضطرب نظر آ رہے تھے۔

''مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے راجو کو یہاں لا کر غلطی کی ہے۔ مجھے تو ان دونوں کے باپوں کا خونی تصادم ہوتا نظر آ رہا ہے' اگر ہم نے اس سے چھٹکارا نہیں پایا تو اس خون ریز تصادم میں ہم دو بے گناہ بھی مارے جائیں گے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے سامنے کی بات ہے انور فراڈ ہے' اس نے ان دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔'' علی نے کہا۔

''وہ فراڈ ہی نہیں بلکہ کسی اور چکر میں بھی ہے۔ ہم اس فلیٹ پر جائیں گے تو وہ اور لڑکی وہاں نہیں ملیں گے۔'' جاوید انصاری نے پُر سوچ انداز میں کہا تو علی چونکا۔

''آپ کا مطلب ہے وہ لڑکی کو لے جا چکا ہوگا۔''

''بالکل میرا اندازہ ہے وہ صرف رقم کے چکر میں نہیں ہے۔''

''لڑکی کو لے جا کر وہ کیا کرے گا۔'' علی نے کہا۔

''عجیب گھامڑ ہو یار لوگ لڑکیوں کا کیا کرتے ہیں؟ اور وہ شخص تو ویسے بھی بدمعاش ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ اس کام میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہمارا اس میں شامل ہونا کسی طور مناسب نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے اس لڑکی کی فکر ہے جو اس بے وقوف کی باتوں میں آ گئی۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی عزت خطرے میں ہے۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' جاوید انصاری نے کہا۔ وہ واپس آئے تو راجو فکرمند بیٹھا تھا۔

''تم ہم سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ ہم تمہارا نکاح نہیں پڑھوا سکتے' نہ ہی تمہیں یہاں پناہ دے سکتے ہیں۔'' علی نے کہا۔ راجو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے' ہمیں گھر سے بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔''

''تمہارے خیال میں جو لوگ تمہیں اغوا کرنا چاہتے تھے کس کے آدمی تھے؟'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔'' وہ بے چینی سے بولا۔ ''پلیز مجھے رانو کے پاس چھوڑ دیں۔'' پھر ہچکچا کر بولا۔ ''ہمیں ہمارے گھر واپس پہنچا دیں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو تمہاری رانو وہاں موجود ہوگی۔'' جاوید انصاری نے کہا۔ راجو اچھل پڑا۔

''کیا مطلب جی؟''

''بات یہ ہے......'' علی نے کہا۔ ''مجھے وہ شخص فراڈ لگ رہا ہے۔ اس نے تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر اسے صرف رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ کل رقم لے کر کسی بہانے وہاں سے کھسک جاتا' وہ یقیناً لڑکی کے چکر میں وہاں رہا ہوگا۔ اور آج اس نے تمہیں بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن تم بچ نکلے' مگر لڑکی کو وہ اب تک لے جا چکا ہوگا۔''

''مم...... مجھے جانا ہے۔'' راجو تیزی سے دروازے کی سمت بڑھا تو علی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ٹھہرو ہم بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔'' رانو کے حوالے سے فکر اس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی۔ اس نے غالباً اس معاملے میں اپنی عقل استعمال نہیں کی تھی۔

ایک تو وہ خاصا بے وقوف اور سادہ تھا' دوسرے گھر اور گھر کے باہر اس کی کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ انور اس کا واحد دوست بنا تھا جس پر وہ اندھا اعتماد کر بیٹھا تھا۔ اسے دنیا اور لوگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ بڑی

آسانی سے انور کی باتوں میں آ گیا تھا۔ لیکن اب وہ اس رخ پر سوچ رہا تھا' اسی لیے پریشان ہو گیا تھا۔

علی اور جاوید انصاری اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستے میں جاوید صاحب نے راجو سے انور کے بارے میں کئی سوالات کیے لیکن اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ راجو کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچے تو علی نے پوچھا۔

''وہ عمارت کہاں ہے؟''

''یہ اس طرف موڑ لیں۔'' راجو نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک تنگ گلی کے سامنے پہنچے' جہاں کار آگے نہیں جا سکتی تھی۔ راجو نے بتایا یہاں سے کچھ دور پیدل جانا ہوگا۔

یہاں تنگ گلیاں اور گندگی کے ڈھیر تھے۔ گلی کے کونے پر ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ وہ فلیٹ اس عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔

راجو نے بے تابی سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ دوبارہ دستک دینے جا رہا تھا کہ علی نے اسے روک دیا اور دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

راجو تیزی سے اندر گھسا...... فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اور خالی پڑا تھا۔ جیسا کہ ان دونوں کو توقع تھی۔ راجو کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے چھوٹے سے کچن اور باتھ روم میں بھی جھانک لیا۔ وہ بالکونی کی طرف جا رہا تھا کہ جاوید صاحب نے اسے روک لیا۔

''بس کرو برخوردار وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔'' راجو مشتعل ہو گیا۔

''وہ رانو کو کیسے لے جا سکتا ہے؟''

''اس نے نا صرف تمہیں لوٹا ہے بلکہ لڑکی کو بھی لے گیا ہے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں اسے قتل کر دوں گا۔'' راجو مشتعل ہو کر بولا۔

''لیکن قتل کرنے کے لیے اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔''

''میں اسے تلاش کر لوں گا۔''

''کیسے؟'' جاوید انصاری نے کہا تو راجو کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نئی پود کے یہ عاشق اپنی ناتجربہ کاری اور جذبات میں اپنی عقل استعمال کرنا نہیں جانتے۔ اسی وجہ سے دھوکے کھاتے ہیں۔ اس دھچکے نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''سر پلیز میری مدد کریں' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

''میں تمہاری صرف اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں اور تمہارے ابا کو سمجھا دوں۔ گھر جاؤ اور اپنے ابا کو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ اس کے بعد تمہارے بڑے اس معاملے کو خود سنبھال لیں گے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں سر وہ مجھے گھر میں قید کر دیں گے اور رانو کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔''

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پولیس اسٹیشن چلتے ہیں اور انور کے خلاف رپورٹ لکھواتے ہیں۔ پولیس خود انہیں تلاش کر لے گی اور جب پولیس کو پتہ چلے گا کہ وہ لڑکی کے ساتھ موٹی رقم اور زیورات بھی لے گیا ہے تو وہ شدومد سے اسے تلاش کرے گی۔'' علی نے کہا۔

''جب تک رانو کا کیا ہوگا؟'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''مجھے اب احساس ہو رہا ہے وہ بہت چالاک ہے۔''

''وہ چالاک نہیں ہے تم بے وقوف ہو۔'' علی نے کہا۔

راجو ذرا سی دیر میں کئی دن کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر علی کو اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ راجو سے اس کی کوئی بہت پرانی شناسائی نہیں تھی پھر اسے اس لڑکی کا بھی خیال آ رہا تھا جو گھر سے بھاگی تو راجو کے لیے تھی مگر ایک غلط آدمی کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ جو نہ جانے اس وقت کس حال میں ہوگی اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟

فلیٹ میں معمولی فرنیچر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو انور کی شخصیت پر روشنی ڈال سکتی۔ علی نے برابر والے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازے سے جھانکا۔

''باجی یہ برابر فلیٹ والے کہاں گئے ہیں؟''

''مجھے کیا پتا؟'' عورت نے بے رخی سے کہا۔

''آپ برابر میں رہتی ہیں یقیناً آتے جاتے انہیں دیکھا ہوگا۔''

''ہاں کچھ دیر پہلے ایک شخص گیا تھا اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔''

''کتنی دیر ہوئی ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''یہی کوئی ایک دو گھنٹے ہوئے ہیں۔''

''یہ گھر کب سے کرائے پر چڑھا ہے؟'' جاوید انصاری صاحب نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم میں تو دو دن سے انہیں دیکھ رہی ہوں۔ اس کے بارے میں مالک مکان ہی بتا سکتے ہیں۔''

''مالک مکان کون ہے؟''

''اسی بلڈنگ میں سب سے نیچے ان کا فلیٹ ہے اکرم صاحب نام ہے۔'' عورت نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

نیچے آتے ہوئے جاوید انصاری نے کہا۔

''یہ اکرم اتنی آسانی سے انور کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ اس کے لیے کوئی ترکیب لڑانی پڑے گی۔''

''کیسی ترکیب؟'' علی نے پوچھا۔

''تمہیں اداکاری کرنی ہوگی۔ آخر محبت بھی تو کی ہے۔'' انہوں نے راجو سے کہا۔

''کیا اداکاری کرنی ہے؟''

''ہم یہ ظاہر کریں گے جیسے ایجنسی سے ہمارا تعلق ہے اور تمہیں پکڑ کر تمہارے باقی ساتھیوں کو تلاش کررہے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' راجو نے کہا۔

کچھ دیر بعد علی نے اکرم کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا۔ اکرم خود باہر آیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا موٹی توند والا پستہ قد شخص تھا۔

''جی فرمایئے۔''

''اکرم تم ہو۔'' جاوید انصاری نے بارعب لہجے میں استفسار کیا۔ راجو کو انہوں نے گردن سے پکڑا ہوا تھا۔ جو سراسیمہ نظر آرہا تھا۔

''جی میں ہی ہوں۔'' وہ جاوید انصاری کے انداز تخاطب سے ڈر گیا۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' جاوید صاحب نے راجو کی طرف اشارہ کیا۔

''جی نہیں۔'' اکرم نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ اس شخص کا ساتھی ہے جسے تم نے اپنا فلیٹ کرائے پر دیا ہوا ہے۔'' وہ چونکا۔

''کون سا فلیٹ جناب۔''

''جو تیسرے فلور پر ہے یہ معاملہ بہت سنگین ہے تم نے اس شخص کو جانے بغیر کیسے اپنا فلیٹ کرائے پر دے دیا۔''

اس بار اکرم نامی شخص کا رنگ اڑ گیا۔

''کک...... کیا ہوا جناب؟''

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''ساتھ کیوں جناب' جو پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں۔ شیراز کو میں نے فلیٹ رضوان کریانہ اسٹور والے کی ضمانت پر دیا تھا۔ اس کا اسٹور مین روڈ پر ہے۔ شیراز اس کا پرانا جاننے والا ہے۔''

''شیراز نہیں اس کا نام انور ہے۔'' علی نے کہا۔

پھر اکرم نے شیراز کا جو حلیہ بتایا راجو نے سر ہلا کر اس کی تصدیق کردی۔

''اس کا مطلب ہے وہ نام بدل کر کارروائیاں کررہا ہے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔ آس پاس کے فلیٹوں میں ہل چل ہونے لگی تھی لوگ اپنے دروازوں سے جھانک رہے تھے۔

''میرا خیال ہے ہمیں اندر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔'' اکرم نے کہا۔ خود جاوید صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ انہیں اندر لے آیا۔

''معاملہ کیا ہے' جناب میں ایک شریف آدمی ہوں۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''تم شریف ہو مگر رابطے مجرموں سے رکھتے ہو اور انہیں پناہ بھی دیتے ہو۔'' اکرم بوکھلا گیا۔

''رضوان نے بتایا تھا کہ اس کے ایک جاننے والے کو رہائش کی ضرورت تھی' میرا یہ فلیٹ خالی تھا' اسی لیے میں نے اسے کرائے پر دے دیا۔''

''ہم نے اس کے ساتھی کو گرفتار کرلیا ہے۔'' علی نے راجو کی طرف اشارہ کیا ''اس کی نشاندہی پر ہم یہاں آئے ہیں لیکن دو گھنٹے پہلے اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ فرار ہوچکا

ہے۔''

''اگر وہ فرار ہو چکا ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب میں بال بچوں والا آدمی ہوں۔''

''اسی وجہ سے ہم تم سے شرافت کی زبان میں بات کر رہے ہیں۔ ورنہ تم اس وقت کسی نامعلوم مقام پر ہوتے اور تمہارے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کہاں ہو؟''

''اس کے بارے میں آپ کو رضوان ہی بہتر بتا سکتا ہے۔'' علی اور جاوید انصاری کے لیے اتنی معلومات کافی تھیں' اس سے زیادہ وہ کچھ جانتا بھی نہیں تھا۔ اکرم سے اس کا اصل نام معلوم ہو گیا تھا اور کسی رضوان سے اس کا تعلق بھی پتا چل گیا تھا۔

وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے جاوید انصاری نے اکرم کو وارننگ دی تھی کہ جو گفتگو ان کے درمیان ہوئی ہے اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ کسی سے اس کے بارے میں بات نہیں کرے گا۔ وہ باہر نکلے اور کار تک آئے۔

''اب اس رضوان کو دیکھنا پڑے گا۔'' جاوید صاحب نے کہا۔ ''شیراز اور رانو تک پہنچنے کا یہی ایک واحد ذریعہ ہے۔'' انہوں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

رانو بڑی خوبصورت تھی' تیکھے نقوش' خوبصورت لب بڑی بڑی آنکھیں' کھلتا ہوا گورا رنگ اور گھنی زلفیں' مجموعی طور پر وہ بڑی دلکش تھی۔ لیکن محبت میں اس کی عقل خبط ہو گئی تھی۔ اسے اپنے محلے میں رہنے والا راجو بہت اچھا لگا تھا جو اسی کا ہم عمر تھا' کالج آتے جاتے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ اس محبت میں دونوں گھرانوں کے تضادات کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ پھر یہ اچھا لگنا محبت میں بدل گیا۔ اسے معلوم تھا اس کا باپ اس کی شادی کبھی بھی راجو سے نہیں ہونے دے گا۔

وہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے پر تیار ہو گئی تھی۔ اس نے اس منصوبے پر بڑی احتیاط سے عمل کیا تھا۔ جس دن اسے گھر سے فرار ہونا تھا' اس نے اپنی ماں کا تمام زیور اپنے کالج بیگ میں رکھ لیا تھا اور کالج روانہ ہو گئی تھی لیکن وہ کالج نہیں گئی' راجو جو باہر اس کا منتظر تھا' وہ اسے لے کر اس فلیٹ میں آ گیا تھا۔ اس وقت رانو کو انور کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ اسے فلیٹ میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' اکیلے میں اس نے راجو سے پوچھا تھا۔

''یہ میرا دوست ہے اور ہماری مدد کر رہا ہے یہ جگہ بھی اسی کی ہے۔'' نہ جانے کیوں رانو کو وہ شخص بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا' پھر جن نظروں سے وہ اسے گھور رہا تھا' اسے وہ نظریں بھی ٹھیک نہیں لگی تھیں۔ لڑکیوں کی چھٹی حس اس معاملے میں بالکل درست فیصلہ کرتی ہے۔

راجو اس کا محبوب تھا لیکن ایسی نظروں سے تو کبھی راجو نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں کم عمری کی محبت کا شکار ضرور تھے مگر اس محبت میں کوئی آلودگی نہیں تھی۔ رانو نے موقع پا کر راجو سے سرگوشی میں کہا تھا۔

''مجھے یہ شخص اچھا نہیں لگ رہا۔'' مگر راجو اس سے متفق نہیں تھا۔

''رانو انور میرا بہت اچھا دوست ہے اور ہماری مدد کر رہا ہے۔ ہمارا نکاح کروا رہا ہے۔ نکاح کے بعد ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے۔'' راجو نے کہا تو رانو خاموش ہو گئی۔ راجو نے اس سے زیور لے کر انور کو دے دیئے۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا' اب اگر وہ یہ سب لے کر بھاگ گیا تو......''

''مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔'' راجو نے کہا۔ شام کو وہ آ گیا تھا۔

''سوری دوستو مجھے آنے میں دیر ہو گئی' رقم اور زیور میں نے محفوظ جگہ رکھ دیئے ہیں یہ علاقہ ٹھیک نہیں یہاں چوری چکاری کا خطرہ رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تم پریشان تو نہیں ہونا۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے۔'' راجو نے کہا لیکن رانو کا دل نہیں مان رہا تھا۔

رات وہ الگ کمرے میں سوئی تھی اور احتیاطاً اس نے اندر سے کنڈی بھی لگائی تھی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ وہ باہر آئی تو دیکھا دوسرا کمرہ خالی تھا۔ راجو اسے کہیں نظر نہیں آیا تو وہ گھبرا گئی۔ انور کچن میں چائے بنا رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر انور سے پوچھا۔

''راجو کہاں ہے؟''

''وہ ناشتا لینے گیا ہے۔'' اس نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''جب تک وہ ناشتہ لے کر آتا ہے تم چائے پی لو۔'' اس نے ایک کپ رانو کی طرف بڑھایا جسے رانو نے تھام لیا۔

اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کچھ دیر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر فون بند کر کے گھبرائے ہوئے لہجے میں رانو سے کہا۔

''جلدی چلو راجو نے تمہارے ابا کو باہر بازار میں دیکھا ہے۔ وہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم چادر سے منہ چھپا کر گھر سے نکلنا۔''

یہ سنتے ہی رانو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو کر رہ گئیں۔ وہ تیزی سے گھر سے نکل گئے تھے۔ پھر وہ کار میں بٹھا کر اسے یہاں لے آیا تھا اور راستے میں بتایا تھا کہ کچھ دیر بعد راجو بھی وہاں پہنچنے والا ہے۔

یہ تین چار کمروں کا ایک بڑا مکان تھا جو ابھی زیر تعمیر تھا۔ وہ راستوں سے ناواقف تھی اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ انور اسے کہاں لے آیا ہے' اس کمرے میں جہاں وہ بیٹھی تھی مختصر سا فرنیچر تھا جو ایک ڈبل بیڈ اور چند کرسیوں پر مشتمل تھا کمرے کے ایک کونے میں الماری بھی نصب تھی۔ وہ کافی دیر بیڈ پر بیٹھی راجو کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہیں آیا تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ انور سامنے کرسی پر بیٹھا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں سے اسے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

''راجو کہاں رہ گیا' وہ کب آئے گا؟'' اس نے پریشان ہو کر انور سے پوچھا تو وہ شیطانی انداز میں مسکرایا اور اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس کا انداز اتنا خوف ناک تھا کہ رانو سہم گئی۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر انور نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ وہ چیخی چلائی لیکن اس نے اثر نہیں لیا' اس نے اسے بیڈ پر دھکیلا۔

''لڑکی تم بے کار مزاحمت کر رہی ہو۔ یہاں دور دور تک تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔''

رانو رو رہی تھی' چلا رہی تھی مگر انور پر تو شیطان سوار تھا' اسی وقت انور کے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اسے چھوڑ کر دور چلا گیا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا' پھر کمرے سے نکل کر اس نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ رانو تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ انور کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''بھاگ گیا' کیسے؟ نکمے ہو تم سب' میں نے سوچا تھا ان دونوں کو یرغمال بنا کر ان کے والدین سے ٹھیک ٹھاک تاوان وصول کریں گے۔ خیر کوئی بات نہیں لڑکی میرے قبضے میں ہے۔ میرا اس پر دل آ گیا ہے' پہلے میں......'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

رضوان نامی دکان دار کے پاس جانے سے پہلے علی کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ انہیں اب اس معاملے سے دست بردار ہو جانا چاہیے اور معاملہ راجو کے والد کے سپرد کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اگلا مرحلہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ انور یا شیراز ایک خطرناک مجرم تھا' اس نے رانو کو اغوا کر کے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس قسم کے مجرم سے نمٹنا پولیس کا کام تھا۔ جاوید انصاری نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا لیکن راجو نے اس تجویز سے انکار کر دیا۔

''میں کسی صورت ابا کے پاس نہیں جاؤں گا۔''

''دیکھو یار وہ تمہارے ابا ہیں اور یقیناً اتنے ظالم نہیں ہوں گے جتنا تم ان کو سمجھتے ہو۔'' علی نے اسے سمجھایا۔

''وہ شاید مجھے کچھ نہ کہیں مگر وہ رانو کے لیے کچھ نہیں کریں گے' میری رانو اس ذلیل شخص کے قبضے میں ہے۔'' وہ رونے لگا۔ ہم نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ میرے کہنے پر ہی بھاگی تھی۔ میری ذمہ داری ہے کہ میں اسے باحفاظت اس کے گھر واپس پہنچا دوں۔''

''بڑی سمجھداری کی باتیں کر رہے ہو برخوردار۔'' جاوید صاحب بولے۔

رضوان تیس بتیس سال کا ایک تنومند آدمی تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیزی سے گردش کرتی تھیں۔ جاوید

انصاری نے یہاں بھی وہی حربہ استعمال کیا۔ وہ ایجنسی والے بن گئے۔ جب علی نے اپنا تعارف کروایا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہا تو وہ گھبرا گیا۔

''میرا کیا قصور ہے جناب؟''

''قصور کا بھی پتہ چل جائے گا۔'' جاوید انصاری نے درشت لہجے میں کہا۔ ''مجرموں سے رابطے رکھتے ہو ان کی مدد کرتے ہو اور قصور پوچھ رہے ہو۔'' وہ اسے زوردار تھپڑ مارتے ہوئے بولے۔

''جھوٹ ہے جی الزام ہے۔''

''بک بک بند کرو ہمارے پاس پوری رپوٹ ہے۔ تم شیراز کو جانتے ہو؟''

''جی جانتا ہوں مگر......''

''تم نے ہی اسے یہاں مکان کرائے پر دلوایا تھا؟''

''وہ میرا پرانا دوست ہے۔ مجھے پتا ہے اس کی گزشتہ زندگی مجرمانہ سرگرمیوں میں گزری ہے' اسی لیے میں نے اس سے دوستی ختم کردی تھی۔ لیکن اس بار وہ مجھے پانچ سال بعد ملا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ اس نے برائی کی زندگی ترک کردی ہے اور سدھر گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس نے ایک کمپنی میں ملازمت حاصل کرلی ہے وہ اس علاقے کے نزدیک ہے اسی لیے وہ یہاں کرائے کے مکان کی تلاش میں تھا۔ میں نے تو صرف اس کی مدد کی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ سرجانی ٹاؤن میں اس کا مکان زیر تعمیر ہے جیسے ہی وہ تیار ہوجائے گا وہ وہاں شفٹ ہوجائے گا۔''

''اس وقت وہ کہاں ملے گا' تم اس کے دوست ہو یقیناً اس کے ٹھکانوں سے واقف ہوگے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''وہ اس وقت اپنے سرجانی ٹاؤن والے مکان میں ہے۔''

''تم یہ بات کیسے جانتے ہو؟''

''کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا' وہ پوچھ رہا تھا کہ کوئی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے تو میرے پاس نہیں آیا۔''

''وہ مکان تم نے دیکھا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''ہاں ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔''

''تم ہمارے ساتھ چل کر ہمیں وہ ٹھکانہ دکھاؤ گے۔''

''آپ مجھے گرفتار تو نہیں کریں گے نا۔'' وہ خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

''نہیں تم ہمیں اس کا ٹھکانہ دکھادو' اس کے بعد تم آزاد ہوگے۔'' علی نے کہا۔ ''اگر وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تو تمہاری خیر نہیں۔'' اسے انہوں نے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہوگئے' علی نے اس کا فون اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

رشید قریشی ذات کا قصائی تھا۔ شہر کی گوشت مارکیٹ میں اس کی خوب چلتی ہوئی متعدد دکانیں تھیں' وہ اور اس کے بیٹے کاروبار کو باخوبی چلارہے تھے۔ اس کے چھ بیٹے تھے جس میں راجو سب سے چھوٹا تھا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا اور طاقتور شخص تھا۔ محلے میں سب اس سے ذرا دب کر رہتے تھے لیکن جب سے گوجرانوالہ سے آئی ہوئی ایک فیملی ان کے محلے میں رہنے آئی تھی' اور ان کے بیٹے کو پہلوان کی بیٹی بھاگئی تھی اور ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔

بھولا پہلوان گوجرانوالہ کا ایک نامی گرامی پہلوان تھا۔ حیثیت میں بھی وہ کسی طرح رشید قریشی سے کم نہیں تھا۔

پھر متعدد بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی جھڑپیں ہونے لگیں مگر کچھ عرصے سے ان دونوں نے ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی۔ یہ خاموشی اور سکون اس وقت ختم ہوگیا جب رشید قریشی کا سب سے چھوٹا بیٹا راجو گھر سے غائب پایا گیا۔ وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن کالج نہیں پہنچا تھا۔ جب وہ گھر واپس نہیں آیا تو وہ اور اس کے پانچوں بیٹے اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راجو شروع ہی سے الگ مزاج کا لڑکا تھا وہ پڑھنا چاہتا تھا جبکہ اس کے دوسرے بیٹوں کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ جبکہ راجو کی پرورش مختلف انداز میں ہورہی تھی۔ اسے اپنے جدی پشتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شام تک وہ اسے اسپتالوں وغیرہ میں ڈھونڈتا رہا

کیونکہ اس کی دوستی کسی سے نہیں تھی۔ رشید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہوگیا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے اطلاع ملی کہ بھولا پہلوان کی بیٹی بھی گھر سے غائب ہے...... وہ بھی صبح کالج جانے کے لیے نکلی تھی پھر واپس نہیں آئی...... جلد ہی سارا معاملہ کھل گیا۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ راجو گھر سے اچھی خاصی رقم بھی لے گیا ہے۔ رشید کا غصے سے برا حال تھا۔

ادھر بھولا کے گھر میں بھی کہرام مچا ہوا تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی گھر سے غائب تھی۔ وہ اپنے ماں کے تمام زیور بھی لے گئی تھی۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ راجو کے ساتھ فرار ہوئی ہے اسے پورا یقین تھا کہ اس سازش میں رشید بھی شامل ہے۔ اس کے کہنے پر ہی اس کے بیٹے راجو نے رانو کو اپنے جال میں پھنسایا اور گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے رانو اس کے سامنے آجائے اور وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔

''تم سے یہ نہیں ہوتا کہ اس نامراد کو تلاش کرو۔ اس سے پہلے کہ سب کو خبر ہوجائے۔'' بھولا کی بیوی نے کہا۔

''کیسے تلاش کروں اور کہاں تلاش کروں؟ سب سے کہوں کہ بیٹی بھاگ گئی ہے اسے تلاش کررہا ہوں۔ کیا عزت رہ جائے گی زمانے میں۔''

''تم پولیس میں رپورٹ لکھواؤ رشید کے خلاف اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ ہمارے گھر کو آگ لگا کر وہ سکون سے بیٹھا ہوا ہے۔''

''پولیس کے پاس جاؤں گا تو میری ناک کٹ جائے گی' اور بدنامی الگ ہوگی۔ مجھے رشید کے گھر جانا پڑے گا اسے مزا چکھانے کے لیے۔''

''ایسا نہ کرنا۔'' وہ ڈر گئی۔ ''ہماری بیٹی ان کے قبضے میں ہے۔''

''جہنم میں گئی ایسی بیٹی جسے ماں باپ کی عزت کی پروا نہ ہو۔'' بھولا نے گرج کر کہا۔

''دیکھو کوئی ایسا کام نہ کرنا جس پہ بعد میں پچھتانا پڑے تم ایک بار رشید سے بات کرکے دیکھو۔''

''بکومت میں اس سے بات کروں اس کے آگے جھک جاؤں ناممکن۔''

''ابھی ہم مجبور ہیں' ہمیں جھکنا پڑے گا۔ ایک بار بیٹی گھر آجائے پھر جو جی میں آئے کرنا۔'' بیوی نے رسانیت سے سمجھایا۔

یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے رشید کا نمبر ملایا۔ رشید کی آواز سنتے ہی وہ بولا۔

''رشید لگتا ہے تجھے سکون سے رہنا گوارا نہیں' تو نے میری بیٹی کو اغوا کرکے اچھا نہیں کیا۔''

''زبان سنبھال کر بات کر۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے' میرے بیٹے کو غائب کرکے تو مجھ پر ہی الزام لگا رہا ہے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرکے تو بچ نہیں سکتا۔'' رشید بھڑکا۔ ''اگر میرے بیٹے کو ذرا بھی نقصان پہنچا تو تجھے چھوڑوں گا نہیں۔''

''شرافت سے میری بیٹی واپس کردے۔ زیادہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں' میری بیٹی کو تیرا بیٹا ورغلا کرلے گیا ہے۔ اگر وہ واپس نہیں آئی تو میں تم دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کردوں گا۔''

''تو جھوٹ بول رہا ہے میرا بیٹا ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔'' رشید نے کہا۔

''تو کیا سمجھتا ہے میں اتنا گھٹیا ہوں کہ بیٹی کا نام لوں گا۔ مجھے پتا چلا ہے وہ تیرے بیٹے کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔'' بھولا نے کہا۔

چند منٹ تک دونوں طرف سے تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ دونوں کا خیال تھا کہ وہ اسے دھوکا دے رہا ہے' بہرحال بات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ فون بند کرتے وقت دونوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک دوسرے کو نہیں بخشنا۔

☆......☆......☆

کار میں رضوان علی کے ساتھ آگے بیٹھا تھا جبکہ راجو جاوید انصاری کے ساتھ پیچھے تھا۔ سرجانی کا یہ علاقہ نیا آباد ہوا تھا' جہاں کئی مکان زیر تعمیر تھے۔ یہ مکان جس کی نشاندہی رضوان نے کی تھی دوسرے مکانوں سے ذرا ہٹ کے سنسان جگہ پر واقع تھا اور اس مکان کے آس پاس کوئی مکان نہیں تھا۔ علی نے کار اس مکان سے کچھ فاصلے پر روک دی۔

جاوید انصاری اور راجو نیچے اتر گئے۔ راجو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر مکان کے اندر پہنچ جائے۔ جاوید صاحب نے گھر کے گیٹ کے پاس جا کر اندر کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا' گیٹ اندر سے بند تھا۔

دبلا پتلا لیکن پھرتیلا راجو تیزی سے گیٹ کے سہارے دیوار پر چڑھ گیا' کچھ دیر بعد وہ اندر کود گیا۔ اس نے اندر جا کر گیٹ کھول دیا۔ علی نے اس دوران رضوان کو اپنے ساتھ لائی ہوئی رسی سے باندھ کر اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا کر گاڑی میں لاک کر دیا اور خود مکان کے اندر چلا گیا۔ عمارت کے اندر کوئی نظر نہیں آیا تھا نہ ہی کوئی آواز سنائی دی تھی بظاہر عمارت خالی نظر آ رہی تھی۔

''راجو تم یہاں رکو میں اور جاوید صاحب اندر جائیں گے۔''

''نہیں میں بھی آپ کے ساتھ اندر جاؤں گا۔''

''لیکن ایک شرط پر تم ہماری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے اور نہ ہی رانو اور انور کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گے۔'' راجو نے سوچا اور سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔''

☆......☆......☆

انور نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر خباثت تھی وہ مسکرایا اور رانو کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت اس کی شخصیت پر چڑھا ہوا نقاب اتر گیا تھا اور اصل شیراز کا مکروہ چہرہ نظر آ رہا تھا جو کسی بھیڑیے سے مشابہ تھا۔ وہ انتہائی خوف زدہ تھی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تھی' اس کے ارادے خطرناک تھے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی وقت علی نے دروازے پر لات ماری' دروازہ کھل گیا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' علی بارعب انداز میں چلایا۔

انور ایک مجرم تھا۔ اس نے پھرتی سے پستول نکال لیا اور اس کا رخ رانو کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''خبردار اگر آگے بڑھے میں اس لڑکی کو قتل کر دوں گا۔'' وہ رانو کو پستول کی زد پر رکھتا ہوا الماری کی طرف بڑھا اور اس میں سے وہ چرمی بیگ نکالا جس میں ان دونوں کا اثاثہ تھا۔

''تم تینوں دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ چلایا۔ وہ اسی دیوار کی سمت جا ہی رہے تھے کہ نہ جانے کیا ہوا راجو اچانک ہوا میں اچھلا اور انور پر جا گرا۔

انور اس آناً فاناً ہونے والے حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ زمین پر گر گیا' اسی وقت ایک فائر کی آواز آئی لیکن رانو محفوظ رہی تھی۔ انور کا نشانہ چوک گیا تھا گولی دیوار پر لگی تھی۔ راجو نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا تھا۔ وہ غصے سے بے قابو ہو گیا تھا' انور کا پستول اس لڑائی میں دور جا گرا تھا' علی اور جاوید انصاری جو اس سچویشن پر ہکا بکا کھڑے تھے اچانک ہوش میں آئے اور راجو کی مدد کے لیے دوڑے۔

انور جو اتنی مار کھا کر ادھ موا ہو چکا تھا اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی جو اٹھ بیٹھتا' رانو نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ چرمی بیگ قابو میں کر لیا تھا۔ راجو نے رانو سے پوچھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' رانو کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''وہ مجھے دھوکے سے یہاں لے آیا تھا۔''

''چلو اب تم دونوں اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے والدین سے معافی مانگو' تم نے گھر سے بھاگ کر غلطی کی تھی' میرا خیال ہے اتنی سزا تمہارے لیے کافی ہے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی ابو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔'' رانو نے انکار کیا۔

''تم نے کام ہی ایسا کیا ہے..... مگر میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کریں گے' ہم تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلیں گے۔'' علی اور جاوید صاحب نے ان کے والدین کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا۔

کچھ دن بعد راجو نے جاوید انصاری کو فون پر یہ خوش خبری سنائی تھی کہ ان کے باپ ان دونوں کی وجہ سے دوستی پر مجبور ہو گئے ہیں' کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے سمدھی بننے والے ہیں۔



یادگار محبت

فلک شیر ملک

محبت امر ہے، محبت لازوال ہے، اسے مارنے والے خود تو مر سکتے ہیں، مگر اسے نہیں مار سکتے، ایک محبت زدہ کی داستان، اس کی محبوبہ اس سے تاج محل کی خواہش کر بیٹھی تھی۔ وہ خواہش تو پوری ہوگئی مگر اس کا محبت محبتوں سے محروم رہا۔

سچائی کی علامت بننے والے ایک مکان کا قصہ جو محبت کی یادگار بھی تھا

مائیکرو بایولوجی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ذوہان احمد آج کل فارغ تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہ سائنس دان بننا چاہتا تھا اور اپنے پسندیدہ شعبے میں ریسرچ، اس کا خواب تھا...... اس خواب کی تکمیل میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اور وہ بوریت کا شکار ہورہا تھا۔ وہ اپنے والد کو ایک روز اسپتال لے کر گیا تو اتفاقاً وہاں ان کی ملاقات چشتی صاحب سے ہوگئی......

جمال چشتی ذوہان کے والد کے پرانے دوست تھے۔ وہ پراپرٹی بزنس سے منسلک تھے اور ایک اچھی خاصی چلتی ہوئی اسٹیٹ ایجنسی کے مالک تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی بیگم کو فزیوتھراپی کے لیے باقاعدگی سے اسپتال لاآتے ہیں۔ ذوہان کو یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ چشتی صاحب کی بیگم کافی طویل عرصے تک اعصابی تکالیف میں مبتلا رہنے کے بعد اب وہیل چیئر پرآ چکی تھیں۔ ذوہان بھی اپنے والد کو فزیوتھراپی کے لیے اسپتال لایا تھا کیونکہ چند ماہ سے انہیں جوڑوں میں درد کی شکایت رہنے لگی تھی اور ڈاکٹر نے ان کے لیے کچھ عرصہ فزیوتھراپی تجویز کی تھی۔ چند ہی دنوں میں وہ خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگے تھے۔

جب جمال چشتی صاحب کو معلوم ہوا کہ ذوہان ان دنوں فارغ ہے تو انہوں نے فوراً اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دے ڈالی۔ ذوہان نے یہ سوچ کر حامی بھرلی کہ بیکار رہنے سے کچھ نہ کچھ کرلینا بہتر تھا...... اس طرح نہ صرف اس کا وقت اچھا گزر جاتا بلکہ کچھ پیسے بھی ہاتھ آجاتے، وہ کئی سال پہلے بھی اپنی چھٹیوں کے دوران ان کے لیے کچھ کام کرچکا تھا اور چشتی صاحب نے اس کی محنت کا معقول معاوضہ ادا کیا تھا، حالانکہ ذوہان اور اس کے والد ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن چشتی صاحب دوستی اور بزنس کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کے قائل تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور اصول پسند انسان تھے۔

ذوہان صبح پہلے اپنے والد کو فزیوتھراپی کرانے اسپتال لے جاتا اور پھر انہیں گھر چھوڑنے کے بعد چشتی صاحب کی اسٹیٹ ایجنسی پہنچ جاتا...... جمال چشتی صاحب ذوہان کو بہت پسند کرتے تھے کیونکہ وہ ایک محنتی، ذمہ دار اور سب سے بڑھ کر مہذب قسم کا لڑکا تھا چونکہ بدقسمتی سے نوجوانوں کی یہ قسم نایاب ہوتی جارہی تھی۔ اس لیے چشتی صاحب دل سے اس کی قدر کرتے تھے...... ذوہان ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے کا فرد تھا، والد ریٹائر تھے، ایک بڑا بھائی تھا، جو بینک میں جاب کرتا تھا، ایک چھوٹی بہن تھی جو کالج میں پڑھ رہی تھی۔ بھائی کی تنخواہ اور والد کی پینشن ملا جلا کر بس گزارہ ہوجاتا تھا۔

چشتی صاحب کی اسٹیٹ ایجنسی شاہدرہ لاہور کے علاقے میں تھی...... وہ ایک سنجیدہ کم گو اور بظاہر کچھ سخت گیر اور تندخو سے انسان تھے، لیکن ذوہان جانتا تھا کہ دراصل وہ بہت نرم دل اور حساس تھے، کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو فوراً



بے چین ہو جاتے تھے۔

ذوہان کو اس بات پہ حیرانی تھی کہ ان کے اندر جو خصوصیات پائی جاتی تھیں' ان کے پیش نظر وہ اپنے کاروبار میں اس قدر کامیاب کیونکر تھے' حالانکہ اس قسم کے کاروبار کے لیے تو انسان کا چرب زبان' دروغ گو اور موقع شناس ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا..... مگر پھر اپنی والدہ کی کہی ہوئی اس بات پر اس کا ایمان پختہ ہو جاتا تھا۔

''جن کے دل میں کھوٹ نہیں ہوتا' اللہ پاک ان کی انگلی تھام لیتا ہے۔''

اس روز ذوہان اور چشتی صاحب آفس میں بیٹھے متوقع گاہکوں کے انتظار میں تھے۔ چشتی صاحب نے ان کے والد کی خیریت دریافت کی پھر اچانک کہنے لگے۔

''برخوردار..... یہ تمہیں سائنس دان وغیرہ بننے کی کیا سوجھی؟ کوئی ایسی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتے جس سے تمہارے گھریلو حالات کچھ بہتر ہو جاتے..... آج کل تو جسے دیکھو' پیسے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔'' ذوہان نے کہا۔

''انکل ہمارے ملک کو سائنس دانوں کی اشد ضرورت ہے' میں کوئی ایسا کام انجام دینا چاہتا ہوں جس سے ملک وقوم بلکہ ساری انسانیت کو فائدہ پہنچے..... رہی بات پیسے کی..... تو میں اسے صرف ضروریات زندگی پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں' اس کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہتا' جس قدر نصیب میں ہوا' مل ہی جائے گا.....''

''ٹھیک.....'' چشتی صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔

''نوجوانی میں میری بھی کچھ اس قسم کے انقلابی خیالات ہوا کرتے تھے مگر بعد میں وہ سب اعلیٰ وارفع خیالات حالات زندگی کی نذر ہو گئے اور ہم بس پیسہ کمانے کی مشین بن کر رہ گئے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد بولے..... بہرحال..... تمہارے

لے میری دعا ہے کہ اللہ کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب رہو......'' ذوہان جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس تشکر بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ چشتی صاحب کی ساری عمر مشکلات سے لڑتے ہوئے گزری تھی۔ بہت کم عمری میں گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آن پڑا تھا۔ شادی ہوئی تو شریک حیات کی خرابی صحت کی بنا پر مسائل سے دوچار رہے...... ایک بیٹا تھا ایف آر سی ایس کرنے لندن گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب وہ اکیلے کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور بیمار ومعذور بیوی کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔

''ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ آج ایک میاں بیوی وہی سفید محل دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔'' انہوں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم انہیں ساتھ لے جانا اور دکھا دینا۔''

''سفید محل......'' ذوہان نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن اس کے بارے میں تو پچھلی مرتبہ آپ نے بتایا تھا کہ وہ بک چکا ہے۔''

''وہ ایک مرتبہ پھر برائے فروخت ہے۔'' چشتی صاحب نے بیزاری سے کہا۔ ''لیکن اس دفعہ میں اسے فروخت کرنے کی غلطی کروں گا ہی نہیں، صرف کرائے پر دوں گا۔''

''اوہ اس مکان کا کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' ذوہان نے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ مکان میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔'' چشتی صاحب نے اپنی میز کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے چھ سالوں میں وہ محل نما مکان چار مرتبہ فروخت ہو چکا ہے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی سنگین مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے......''

''کیسا سنگین مسئلہ انکل......؟'' ذوہان نے تجسس سے پوچھا۔

''بس...... یہ لمبی کہانی ہے۔'' چشتی صاحب نے ٹالنے والے انداز میں کہا تو اس کا تجسس اور بڑھ گیا۔

''کوئی غیر معمولی کہانی ہے......'' اس نے کرید نے والے انداز میں پوچھا، لیکن چشتی صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کار سامنے پارکنگ لاٹ میں آ کر رکی۔

''میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا......'' چشتی صاحب نے جلدی سے کہا۔ ''دیکھو شاید ہمارے متوقع کرائے دار آ گئے ہیں۔'' ذوہان بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ کار سے ایک نوجوان جوڑا اتر کر چشتی اسٹیٹ ایجنسی کی طرف بڑھا...... ان کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ، چہروں پر چھلکتی شادمانی وسرخوشی کا عالم، مست مست چال، غرض ہر ادا سے اس بات کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ نئے نویلے شادی شدہ تھے۔ نوجوان نے دفتر کے اندر آ کر سلام کیا اور چشتی صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام سلطان سرور ہے اور یہ میری بیوی ہے......'' اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا...... ''آپ غالباً چشتی صاحب ہیں، میں نے ہی کل آپ سے فون پر بات کی تھی اور آپ نے ہمیں کوئی سفید محل مکان دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''جی بالکل......'' چشتی صاحب نے خوش دلی سے کہا۔ ''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، ذوہان صاحب آپ کو وہ مکان دکھا دیں گے۔'' انہوں نے دراز سے چابیاں نکال کر ذوہان کی طرف بڑھائیں۔

''آپ چونکہ ہمارے شہر میں مہمان ہیں، لہٰذا آپ کے لیے خصوصی رعایت ہے کہ آپ جتنا عرصہ چاہیں اس مکان میں قیام کر سکتے ہیں...... ایک ماہ...... دو ماہ، چھ ماہ اور جب آپ جانا چاہیں جا سکتے ہیں......'' سلطان سرور نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''اگر مکان ہمیں پسند آ گیا تو ہم اسے ایک ماہ کے لیے کرائے پر لیں گے۔''

''جیسی آپ کی خوشی۔'' چشتی صاحب نے سر ہلا دیا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم شادی کے بعد پہلی مرتبہ لاہور گھومنے کے لیے آئے ہیں۔'' اس مرتبہ مسز سلطان سرور نے لب کشائی کی۔ ''کچھ دن یہاں رہ کر اچھی طرح گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن دریا کے کنارے ایک خوشگوار فضا پر کسی محل نما مکان میں رہنا، ہمارے لیے پُرلطف ہوگا۔'' وہ ذوہان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''چلیں؟''

''جی چلیے۔'' ذوہان نے کہا اور انہیں ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ باہر آنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''آپ لوگ پیدل چلنا پسند کریں گے یا کار پر؟ سفید محل یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔'' سلطان سرور نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

''پیدل ہی چلتے ہیں' کتنا پیارا موسم ہے' مزا آئے گا۔'' سلطان شرارت سے ہنسا۔

''جیسے کہو ڈیئر۔ ویسے بھی میں تو ہائی ہیل پہنتا نہیں ہوں۔''

''کوئی بات نہیں......'' وہ بھی جواباً مسکرائی۔ ''اگر تھک گئی تو سینڈل اتار کر ہاتھ میں لے لوں گی بلکہ تمہیں پکڑا دوں گی۔''

''بہتر سرکار۔'' سلطان سرور نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب تو آپ کی غلامی اختیار کرلی ہے۔'' ذوہان ان دونوں کی پُر لطف نوک جھونک سے محظوظ ہوتا ہوا چل رہا تھا۔ دونوں میں کافی انڈراسٹینڈنگ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور یونہی ایک نظر ان دونوں کے چہروں پر ڈالی۔ دونوں کے چہرے اندرونی خوشی کے باعث تمتمارہے تھے۔ اب وہ دریائے راوی کے کنارے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مست ہوا اٹھکیلیاں کررہی تھی۔ مسز سلطان بار بار چہرے پر آنے والے بالوں کو پیچھے ہٹا رہی تھی۔

اس لمحے وہ ذوہان کو بہت خوبصورت لگی...... بالکل کنول کی طرح! کچھ دنوں پہلے وہ بھی اسی طرح ذوہان کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے پر چہل قدمی کررہی تھی...... اس کا چہرہ بھی یونہی بار بار زلفوں کی بدلی میں چھپ جاتا' اس کے چہرے پہ بھی ایسے ہی قوس قزح بکھری ہوئی تھی...... یادوں کا سلسلہ ممکن ہے کچھ اور دور جا نکلتا...... لیکن ان دونوں کی ہنسی کی آواز اسے واپس کھینچ لائی...... اس نے سر جھٹک کر خود کو یاد دلایا کہ وہ اس وقت آن ڈیوٹی تھا' پھر وہ بھی ان کی گفتگو میں شامل ہوگیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ملتان کے رہنے والے تھے۔ ملتان میں سلطان کا کچھ بزنس تھا اور کچھ آبائی زمینیں وغیرہ بھی تھیں اور یہ کہ سلطان کی بیوی اس کی چچازاد بھی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سفید محل کے عین مقابل کھڑے تھے...... ذوہان نے کئی سال پہلے دور ہی سے اسے بس سرسری نظر سے دیکھا تھا' اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ مکان' اس کے اندازے سے کہیں زیادہ بڑا تھا اور مکان کی بجائے ایک بڑا محل نظر آتا تھا...... اس کی تعمیر میں سفید سنگ مرمر اور سفید ماربل کا استعمال بڑے ماہرانہ انداز میں کیا گیا تھا۔ بھاری بھرکم اور پُرشکوہ داخلی دروازے کے دونوں جانب سفید ماربل کے ستون ایستادہ تھے اور دونوں ہی جانب آہنی شٹر والی کھڑکیاں تھیں۔ مکان کے بیرونی اسٹرکچر میں ہسپانوی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی تھی...... دریا کے کنارے پر اپنی طرز کا یہ واحد مکان تھا' اور منفرد بھی' اس کے اردگرد کوئی دوسری عمارت یا مکان موجود نہیں تھا۔

''واؤ...... شاندار!'' مسز سلطان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''واقعی......'' سلطان نے جواب تک مبہوت کھڑا تھا' ستائشی انداز میں کہا۔

''اسے کتنا عرصہ پہلے تعمیر کیا گیا تھا؟'' مسز سلطان نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے' اسے بیسویں صدی کے آغاز میں بنایا گیا تھا۔'' ذوہان نے اندازاً بتایا۔

''یہاں اس جیسا کوئی دوسرا مکان نظر نہیں آتا......'' سلطان نے کہا۔ ''کیا اس کی کوئی تاریخی حیثیت بھی ہے؟''

''مجھے اس کی تاریخی حیثیت کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' ذوہان نے اعتراف کیا۔ ''مجھے اس مکان کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ یہ بہت آرام دہ ہے اور یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔'' ذوہان کی بات غلط نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی کو وہ محل نما مکان بہت پسند آیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی خوبصورتی اور یہاں سے دکھائی دینے والا ساحلی منظر انہیں مسحور کر گیا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ دفتر واپس آئے' چشتی صاحب کو ایک ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کیا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید وہ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ یہاں قیام کریں۔

اس کے بعد ذوہان کا پورا ہفتہ انتہائی مصروفیت میں

گزرا۔ اسٹیٹ ایجنسی پر کسٹمرز کا کافی ہجوم تھا۔ وہ مختلف قسم کی پراپرٹی خریدنے کے خواہشمند افراد کو مکانات' دکانیں اور فلیٹس وغیرہ دکھانے کے لیے ادھر سے ادھر دوڑتا رہا۔ اس مصروفیت کے باعث وہ چشتی صاحب سے سفید محل کے بارے میں پوچھنا بھول گیا لیکن ہفتے کے آخری روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سفید محل کے بارے میں اس کا تجسس ایک بار پھر جاگ اٹھا۔ سوموار کے روز ذوہان چشتی صاحب کے ساتھ آفس میں بیٹھا ہوا تھا' وہ ذوہان کو ایک پلاٹ کی لوکیشن سمجھا رہے تھے کیونکہ اسے کچھ دیر بعد آنے والے گاہکوں کو وہ پلاٹ دکھانے کے لیے جانا تھا۔ دفعتاً آفس کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور مسٹر اور مسز سلطان ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسر کو دھکیلتے ہوئے آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے...... دونوں بیک وقت ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ سلطان سرور نے چابیاں چشتی صاحب کے میز پر پھینکیں۔

''یہ لیں...... رکھیں اپنے سفید محل کی چابیاں اپنے پاس...... ہم ملتان واپس جارہے ہیں۔ یہ عورت اس قابل نہیں ہے کہ اس کے اتنے نازنخرے اٹھائے جائیں۔'' وہ پھنکارا۔ ذوہان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

چشتی صاحب کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ نکل کر پہلے میز پر پھر وہاں سے لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر جاگری۔

اب مسز سلطان چلا چلا کر بول رہی تھی اور ساتھ ساتھ روتی بھی جارہی تھی۔

''میں اس قابل نہیں ہوں یا تم اس قابل نہیں تھے کہ مجھ جیسی خوبصورت اور دولت مند لڑکی کے شوہر بنتے...... تم...... تم ایک احسان فراموش انسان ہو۔'' سلطان سرور مزید آگ بگولا ہوگیا۔

''خاموش...... ذلیل عورت' احسان میں نے کیا ہے تم پر ورنہ تیرے جیسی پھوہڑ اور بدزبان عورت سے کون شادی کرتا؟ اوپر سے مجھے حکم کا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔''

''ہاں...... ہاں......'' مسز سلطان اور زور سے چلائی۔

''غلام تو تمہیں بننا ہی پڑے گا' لالچی انسان' تم کیا سمجھتے تھے؟ اتنی آسانی سے میرے حصے کی دولت اور زمینوں کے مالک بن جاؤ گے۔'' وہ غصے سے سڑی اور پیر پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی...... سلطان چند لمحوں تک وہیں کھڑا شرمندگی سے ہونٹ کاٹتا رہا پھر مٹھیاں بھینچتا' تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ ذوہان اور چشتی صاحب چند لمحوں تک ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں کہہ سکے' یہ منظر ان کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ ذوہان حیران تھا کہ کیا یہ وہی میاں بیوی تھے جو چند روز پہلے یک جان دو قالب نظر آرہے تھے اور وہ ان کے محبت بھرے انداز اور گفتگو پر رشک کررہا تھا۔

''انکل......!'' بالآخر ذوہان نے تاسف بھری آواز میں چشتی صاحب کو مخاطب کیا...... ''یہ سب کیا تھا؟ یہ دونوں تو ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہورہے تھے۔''

''لعنت بھیجو یار......'' چشتی صاحب نے سگریٹ کے پیکٹ کی تلاش میں میز پر ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ ذوہان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔

''آپ اس دن مجھے سفید محل کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے اور ان دونوں کے آجانے پر بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔'' ذوہان نے محتاط انداز میں کہا۔ چشتی صاحب نئی سگریٹ سلگا چکے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا کش لیا اور دھوئیں کا مرغولہ بلند کرتے ہوئے اداس سے لہجے میں کہنے لگے۔

''گزشتہ چھ سالوں کے دوران وہاں دو طلاقیں' ایک خودکشی اور ایک قتل ہوچکا ہے...... اب تم مجھ سے ان باتوں کا سبب پوچھو گے جو کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔'' ذوہان حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے کہنے لگا۔

''دو طلاقیں' ایک خودکشی اور ایک قتل؟ آپ مذاق تو نہیں کررہے؟'' چشتی صاحب جھنجلا گئے۔

''یعنی اب میں تم سے مذاق کروں گا؟ اور وہ بھی ایسے سنگین معاملے سے متعلق......''

''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ وہ جگہ آسیب زدہ ہے؟''

''نہیں......'' انہوں نے جواب دیا۔ ''میرا یہ مطلب

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

نہیں تھا' وہاں رہنے والے کسی شخص نے بھی ایسی کوئی شکایت نہیں کی' کسی نے وہاں کچھ نہیں دیکھا' نہ ہی کبھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کی۔ بس ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ وہاں رہنے کے لیے جاتے ہیں تو کچھ اور نظر آتے ہیں اور جب اس جگہ کو چھوڑتے ہیں تو یکسر بدلے ہوئے انسان ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کے اندر چھپا ہوا سچ باہر آ جاتا ہے' شاید اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔''

''یہ تو انتہائی ناقابل یقین سی بات ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔'' ذوہان نے کہا۔

''میری سمجھ میں تو خود کچھ نہیں آتا' لیکن اس مکان میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے...... تم نوجوان ہو محققانہ طبیعت کے مالک ہو' ذرا اس معاملے پر ریسرچ کر کے دیکھو۔'' چشتی صاحب نے کہا۔ ''شاید کوئی منطقی جواز نکل ہی آئے۔'' ذوہان نے دل ہی دل میں سوچا۔

''بھلا اس بات کا کیا منطقی جواز ہو سکتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر تل جاتے ہیں۔'' پھر اس نے چشتی صاحب سے پوچھا۔ ''آپ اس جگہ کے متعلق کیا کچھ جانتے ہیں انکل؟ مجھے ساری باتیں تفصیل سے بتائیے پلیز۔'' اس کی تجسس پسند فطرت اسے اکسا رہی تھی۔

''میری معلومات کے مطابق یہ سفید محل ایک نوجوان صنعت کار عظمت شیخ نے 1940 میں تعمیر کروایا تھا۔ اس وقت کا لاہور ظاہر ہے کہ آج کی طرح بارونق اور گنجان آباد نہیں تھا' اور دریا کے ساتھ تعمیرات نہ ہونے کے برابر تھیں' چاروں طرف ریت ہی ریت تھی اور تاحد نظر پھیلا ہوا دریا راوی......'' چشتی صاحب نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا۔

''کیا اس شخص عظمت شیخ نے سفید محل میں رہائش اختیار کی تھی؟'' ذوہان نے بیتابی سے سوال کیا۔

''نہیں......'' چشتی صاحب نے جواب دیا۔ ''اور یہی اس کہانی کا سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز پہلو ہے...... عظمت شیخ نے یہ مکان اپنی ہونے والی دلہن کو سرپرائز دینے کے لیے بنوایا تھا...... وہ لڑکی رومان پسند فطرت کی مالک تھی' بادل' ہوا' چاندنی اور دریا کی لہروں سے اسے عشق تھا' ایک دفعہ دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے' اس نے عظمت شیخ سے کہا۔ 'اگر میں ممتاز محل ہوتی تو شاہ جہاں سے اس جگہ تاج محل بنوانے کی فرمائش کرتی۔ اور وہ بھی سفید سنگ مرمر سے۔' اس نے تو شاید یہ بات یونہی ازراہ مذاق کہی تھی' مگر عظمت شیخ نے اسے دل پر لکھ لیا اور فوراً ہی ایک مشہور آرکیٹیک سے اس محل کا نقشہ بنوا کر اس کی تعمیر کا کام شروع کروا دیا۔ کیونکہ وہ اس لڑکی کو دیوانہ وار چاہتا تھا اور شادی پر اپنی طرز کا یہ انوکھا محل اسے بطور تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا...... مگر بدقسمتی سے اس دوران وہ لڑکی جو کہ بہت امیر' کبیر والدین کی بیٹی تھی' ان کے ساتھ سیر و تفریح کرنے اور شادی کی شاپنگ کرنے کی غرض سے یورپ چلی گئی تھی۔ وہاں اس کی ملاقات کسی اور نوجوان سے ہوئی وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور اس سے شادی کر کے وہیں کی ہو رہی...... اور پھر کبھی واپس نہیں آئی۔'' ذوہان نے' جو اب تک دم بخود سا بیٹھا یہ عجیب و غریب داستان سن رہا تھا' ذرا پہلو بدلا اور کھوئے کھوئے انداز میں چشتی صاحب سے پوچھا۔

''اور وہ عظمت شیخ کا کیا ہوا؟''

''سفید محل کی تعمیر اور تزئین و آرائش کا کام مکمل ہو چکا تھا' ایک روز عظمت شیخ یہاں آیا اور کچھ ہی دیر بعد مر گیا......''

''مر گیا......؟''

''ہاں......'' چشتی صاحب نے کہا۔

''کیا اس نے خودکشی کی تھی؟'' ذوہان نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

''نہیں...... اس کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔ بتایا تو یہی جاتا ہے۔''

''اوہ بے چارہ۔'' ذوہان نے تاسف سے کہا۔

''اس کے بعد مکان اس کے بڑے بھائی اور پھر بھتیجے کی تحویل میں چلا گیا۔ اسی بھتیجے نے چھ سال پہلے میری ایجنسی کے توسط سے یہ مکان فروخت کیا تھا' لیکن تب سے اب تک میرے گلے پڑا ہوا ہے......'' چشتی صاحب نے ناگواری سے بتایا۔ ذوہان نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا اور کہا۔

''انکل...... گزشتہ چھ سالوں کے دوران پیش آنے

والے واقعات کے تو آپ خود چشم دید گواہ ہیں...... لیکن اس سے پہلے یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے......؟'' چشتی صاحب نے ایک گہری سانس لی اور کہنے لگے۔

''برخوردار' یہ تقریباً ساٹھ' ستر سالوں پر محیط کہانی ہے۔ تب سے اب تک نہ جانے کیا کچھ ہو چکا' اسی دوران پاکستان کا قیام عمل میں آیا' بہت سے مقامی لوگ جو اس کہانی کے بارے میں یقیناً بہت کچھ جانتے ہوں گے' ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے اور وہاں سے لوگ ہجرت کر کے یہاں آ گئے...... جو ظاہر ہے اس کہانی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے لیکن میں نے جو مختلف ذرائع سے تحقیقات کیں تو معلوم یہ ہوا کہ عظمت شیخ کے ورثا نے کبھی اس مکان میں باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی' دراصل وہ لوگ بیرون ملک سیٹل ہو گئے تھے' شاید اسی لیے یہ مکان کافی عرصہ تک بند پڑا رہا...... یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس دوران کسی اکا دکا عزیز یا دوست نے کبھی یہاں ٹھہرنے کی جسارت کی تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ضرور پیش آیا۔''

''اس کا مطلب ہے' یہ مکان فروخت کرنے میں آپ کو کافی دشواری پیش آئی ہو گی؟'' ذوہان نے خیال ظاہر کیا۔

''بالکل نہیں......'' چشتی صاحب نے جواب دیا۔ ''بلکہ پہلی مرتبہ تو اتنی جلدی اس کا سودا طے ہو گیا کہ میں خود حیران رہ گیا' دراصل لوگ پہلی نظر میں ہی اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو جاتے تھے' پھر عام تاثر یہی تھا کہ چونکہ اس کے مالکان بیرون ملک قیام پذیر ہیں اس لیے یہ بند رہتا ہے اور جب وہ یہاں آتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اس میں ٹھہرتے بھی ہوں گے۔ خود میرا خیال بھی یہی تھا' مگر بعد میں یہاں پیش آنے والے واقعات کی بنا پر میں نے اس کے بارے میں تحقیقات کیں تب یہ ساری باتیں سامنے آئیں' جن کی بظاہر کوئی توجیہہ نہیں......''

''یعنی اتنے ناخوشگوار واقعات پیش آنے کے باوجود بھی اس مکان کی منفی شہرت عام نہیں ہوئی۔'' ذوہان نے کہا۔

''ہاں...... کیونکہ بہت کم لوگوں کو ان واقعات کی تفصیل معلوم ہے۔'' چشتی صاحب نے کہا۔ ''لیکن میں ڈرتا ہوں کہ یہاں مزید کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ جائے...... اور اس کا موجودہ مالک ہے کہ میری جان چھوڑنے کو تیار نہیں۔''

''لیکن انکل' یہ اس مسئلے کا حل تو نہیں......؟''

''تم ہی بتاؤ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' ذوہان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا' اسی اثنا میں متوقع کسٹمرز آن پہنچے اور بات ختم ہو گئی۔

ان دنوں چشتی صاحب کی بیگم کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی اور وہ ایجنسی کے معاملات ذوہان کے سپرد کر کے چند روز کی چھٹی پر چلے گئے۔ ذوہان کا پہلا دن انتہائی بور گزرا' ایک بھی کسٹمر نہیں آیا۔ ذرا فراغت میسر آئی تو اسے کنول کی یاد شدت سے ستانے لگی...... جب سے اس نے چشتی صاحب کے پاس آنا شروع کیا تھا اس سے ملاقات بھی نہیں ہو سکی تھی۔

کنول ذوہان کی فرسٹ کزن اور بے ضابطہ قسم کی منگیتر تھی...... کیونکہ ان دونوں کی نسبت وغیرہ کا باضابطہ اعلان نہیں ہوا تھا' مگر دونوں گھرانوں کے درمیان تقریباً طے تھا کہ مستقبل میں ان دونوں کو ایک دوسرے کا شریک سفر بنا دیا جائے گا...... ظاہر ہے کہ دونوں کے بزرگ ان کے جذبات سے بے خبر تو نہیں رہ سکتے تھے...... اسی وجہ سے ان کی منزل آسان ہو گئی تھی۔

دوسرے روز بھی کوئی خاص کام نہیں تھا اور ذوہان کی توقع تھی کہ اس کا یہ دن بھی بوریت کے عالم میں گزرے گا' لہٰذا اس نے صبح سب سے پہلے کنول کو فون کر کے اپنے پاس دفتر آنے کا حکم صادر کر دیا' جس کا کنول نے کافی برا منایا کہ وہ ابھی سے اسے اپنے احکامات کا پابند کرنا چاہتا ہے' تو آگے کیا ہو گا...... بالآخر ذوہان نے اپنے حکم کو باقاعدہ درخواست میں تبدیل کیا اور معذرت طلب کی' تب کہیں جا کر اس کی درخواست منظور ہوئی اور کنول نے آنے کا وعدہ کر لیا...... ذوہان اب چشتی صاحب کی میز کے پیچھے ان کی ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا اور کنول اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔

''اب کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی یا یونہی گھورتے

رہو گے......؟'' کنول نے جل کر کہا کیونکہ وہ تقریباً پچھلے دس منٹ سے خاموش بیٹھا اسے تک رہا تھا۔ نیلے رنگ کے لباس میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''یار تم لڑکیاں اتنی سنگ دل کیوں ہوتی ہو؟ کسی کے جذبات کی قدر ہی نہیں کرتیں......'' ذوہان نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

''تمہارے جذبات میرا سر درد دور نہیں کر سکتے اور نہ ہی انہیں کپ میں ڈال کر پیا جا سکتا ہے...... جلدی سے میرے لیے اچھی سی چائے منگواؤ، میں چائے پیے بغیر چلی آئی ہوں۔'' کنول نے کہا۔ ''اور بائی داوے' کتنی لڑکیوں کی سنگ دلی کا تجربہ ہو چکا ہے تمہیں اب تک؟'' ذوہان نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''ایک ہی کافی ہے۔'' دفعتاً دفتر کا دروازہ دھڑ سے کھلا' ایک وحشت زدہ سا آدمی اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا پھر آگے بڑھ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس ٹھک سے نیچے رکھا اور بغیر کسی تکلف کے ایک کرسی گھسیٹ کر دھم سے اس پر گر سا گیا۔

ذوہان اضطراب کے عالم میں اپنی کرسی پر اتنا آگے کھسک آیا کہ گرنے کے قریب ہو گیا۔ بمشکل تمام اس نے خود کو سنبھالا اور تھوک نگل کر پوچھا۔

''جی...... فرمایئے؟''

''مجھے کرائے پر کوئی جگہ چاہیے......اجنبی نے کرخت سی آواز میں جواب دیا۔ اس کی صورت پر بھی کرختگی اور پھٹکار برس رہی تھی' تاہم لباس اس کا معقول ہی تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے زبردستی اس کے جسم پر منڈھ دیا گیا ہو۔

''تمہارے پاس کوئی جگہ ہے یا نہیں؟'' اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اجنبی نے دوبارہ اسی کرخت لہجے میں پوچھا۔

''جج...... جی ہاں......'' ذوہان نے ایک ہی لمحے میں فیصلہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمارے پاس ایک بہت ہی شاندار ہاؤس موجود ہے' بالکل آپ جیسے آدمی کے شایان شان۔''

''ہوں......'' اجنبی کی گردن فخر سے کچھ اکڑ سی گئی۔

''تم یہیں ٹھہرو......'' ذوہان نے کنول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔'' پھر اس نے سفید محل کی چابیاں دراز سے نکالیں اور اجنبی سے کہا۔ ''آیئے سر' میں آپ کو مکان دکھا دوں۔'' وہ شخص سوٹ کیس اٹھائے ذوہان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ باہر اس کی کار کھڑی تھی' دونوں اس میں بیٹھ کر سفید محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ذوہان نے کہا۔

''معاف کیجیے گا سر میں نے اب تک آپ کا نام تو پوچھا نہیں۔''

''میرا نام صابر علی ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''آپ غالباً کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں۔'' ذوہان نے پوچھا۔

''ہاں' میں بزنس کے سلسلے میں کراچی سے یہاں آیا ہوں' اب یہاں میرا آنا جانا رہے گا اسی لیے میں کوئی اچھی سی جگہ کرائے پر لینا چاہتا ہوں۔'' اس شخص نے اپنے مخصوص اکھڑے لہجے میں بتایا۔

''وہ مکان جسے ہم سفید محل کہتے ہیں یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔'' ذوہان خوش اخلاقی سے مسکرایا۔

''ہوں۔'' اس شخص نے مختصر سا جواب دیا اور پھر سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے' گویا وہ مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتا۔ ذوہان بھی خاموش ہو گیا۔ دریائے راوی کے کنارے پہنچ کر ذوہان نے اسے مکان دکھاتے ہوئے اس کی خصوصیات بتانا چاہیں تو اس نے ہاتھ اٹھا کر ذوہان کو بولنے سے روک دیا اور کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ مجھے مکان پسند آ گیا ہے' باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' وہ ذوہان کے ساتھ دفتر واپس آیا' مکان کا کرایہ اور ڈپازٹ کی رقم ذوہان کے حوالے کی اور کرایہ نامہ پر دستخط وغیرہ کی ضروری کارروائی سے گزرنے کے بعد چابیاں لے کر اسی وقت سفید محل روانہ ہو گیا۔ کنول جواب تک خاموش بیٹھی تھی' اس شخص کے جانے کے بعد کہنے لگی۔

''ذوہان...... یہ آدمی تمہیں کچھ مشکوک سا نہیں لگا؟ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اس کے بریف کیس میں کیا ہوگا؟''

''واقعی' یہ سوال تو بڑا اہم ہے کہ بریف کیس میں کیا ہوگا؟'' ذوہان ہنسا۔ ''ٹھہرو مجھے سوچنے دو' شاید کسی لاش

کے ٹکڑے' یا ڈھیر ساری رقم یا پھر ہیرے جواہرات' اگر یہ بھی نہیں تو شاید فلسفے کی بھاری بھرکم کتابیں......''

''تم سنجیدگی سے کسی بات پر غور نہیں کرسکتے؟'' کنول نے ناگواری سے کہا۔

''ارے تم خوامخواہ فکر مند ہو رہی ہو۔'' ذوہان نے کہا۔ ''میں نے ضروری کارروائی مکمل کرنے اور مناسب رقم لینے کے بعد ہی مکان کی چابیاں اس کے حوالے کی ہیں۔''

''تم جانو۔'' کنول نے کندھے اچکائے پھر کہنے لگی۔ ''چائے تو میں نے تمہارے آفس بوائے سے منگوا کر پی لی تھی' اب لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس کے بعد مجھے گھر بھی واپس جانا ہے۔''

''تم بھول رہی ہو...... تم نے شام تک میرے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔'' ذوہان نے کہا۔

''بھئی میں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتی' تمہاری خاطر آج یونیورسٹی سے چھٹی کی ہے' لیکن گھر والوں کو تو یہی معلوم ہے کہ میں یونیورسٹی گئی ہوئی ہوں۔'' ذوہان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''اچھا چلو فی الحال تو لنچ کے لیے چلتے ہیں۔'' اس نے آفس بوائے کو بلا کر چند ہدایات دیں اور کنول کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ دونوں لنچ کرکے واپس آچکے تھے۔ انہیں دفتر آئے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ دفتر کا دروازہ ایک مرتبہ پھر دھڑ سے کھلا...... صابر علی بالکل پہلے کے سے انداز میں سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کیا' سوٹ کیس اسی طرح ٹھک سے نیچے رکھا اور ایک کرسی گھسیٹ کر دھم سے اس پر بیٹھ گیا...... ذوہان ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا سر...... وہاں کوئی مسئلہ پیش آگیا......؟''

''کیا میں ایک فون کرسکتا ہوں؟'' صابر علی نے ذوہان کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

ذوہان اور کنول نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ اس شخص کا لہجہ بالکل بدلا ہوا سا تھا۔ آواز میں کرختگی کی بجائے ایک نرمی سی تھی' چہرے کے تاثرات بھی بدلے ہوئے تھے اور آنکھوں سے بھی سرد مہری کی بجائے نرمی جھلک رہی تھی۔

''جی ہاں' کیوں نہیں۔'' ذوہان نے جواب دیا۔ صابر علی نے فون اپنے آگے کھسکایا اور نمبر ملانے لگا۔ پھر وہ نروس سے انداز میں بولا۔

''ہیل...... پپ...... پولیس اسٹیشن؟'' ذوہان اور کنول نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا' وہ کہہ رہا تھا۔ ''دیکھیے...... آپ لوگ آج صبح کو ہونے والی بینک ڈکیتی کے مجرم کو تلاش کررہے ہیں نا؟ دراصل میں ہی وہ مجرم ہوں...... نہیں...... نہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے' میری بات کا یقین کریں' میں یہاں پوری رقم کے ساتھ موجود ہوں۔ آپ یہاں آجائیں۔'' پھر وہ انہیں دفتر کا پتہ لکھوانے لگا۔

ذوہان نے دیکھا' کنول کا چہرہ زرد پڑگیا تھا اور وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ ذوہان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا' اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے تاکہ وہ پُرسکون ہوجائے۔ صابر علی ریسیور رکھ کر ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ لوگ پریشان مت ہوں...... ڈریں نہیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے سفید محل کی چابیاں میز پر رکھ دیں۔

''لیکن آپ کچھ بتائیں تو سہی! معاملہ کیا ہے؟'' ذوہان نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ ایک طویل منصوبہ بندی کے بعد آج میں ایک لمبا ہاتھ مارنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور تن تنہا ایک کامیاب بینک ڈکیتی کا معرکہ سرانجام دینے کے بعد دو ایک روز یہاں چھپنے کے ارادے سے آیا تھا...... تم یہ سوٹ کیس دیکھ رہے ہو؟'' اس نے نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پورے کا پورا نوٹوں سے بھرا ہوا ہے...... لیکن اب میں انہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''مجھے احساس ہوگیا ہے کہ میں نے غلط کام کیا ہے؟ میں کب تک اس طرح روپوش رہ سکتا ہوں؟ پھر میرے بیوی بچے بھی ہیں۔''

''کیا تمہیں کسی نے پہچان لیا تھا؟'' ذوہان نے پوچھا۔

''بالکل نہیں...... کوئی بھی میرا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔''

''پھر تم ایسا کیوں کررہے ہو؟'' ذوہان نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''بس اس مکان میں جانے کے بعد اچانک یہ خیال جونک کی طرح میرے ذہن سے چمٹ گیا کہ مجھے رقم واپس کر دینی چاہیے اور خود کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

''اوہ...... تمہارا مطلب ہے کہ وہاں اس مکان میں کوئی آسیب وغیرہ؟''

''نہیں...... نہیں...... میرے خیال میں تو وہاں ایسی کوئی بات نہیں' بس یہ خیال تو اچانک ہی میرے دل میں پیدا ہوا' پہلے تو مجھے اس احمقانہ خیال پر ہنسی آئی لیکن جتنا میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکنا چاہا اسی قدر یہ میرے ذہن کو جکڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرا دماغ کچھ سوچنے' سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا اور میں اس خیال پر عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔'' اچانک پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آواز سنائی دی اور دو پولیس موبائل گاڑیاں دفتر کے باہر رکیں۔ ان میں سے دس بارہ پولیس والے چھلانگیں مار کر نیچے اترے اور رائفلیں تانے دفتر کی جانب بڑھے۔ ان کے آگے ریوالور ہاتھ میں لیے ایک پولیس آفیسر تھا۔ وہ سب دندناتے ہوئے دفتر میں گھس آئے۔

''خبردار...... کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔'' آفیسر اندر آتے ہی چلایا۔ حالانکہ وہ سب پہلے ہی بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

''میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔'' صابر علی نے پُرسکون انداز میں بتایا۔ ''اور ساری رقم اس سوٹ کیس میں ہے۔'' اس نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر جلدی سے صابر علی کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔

آفیسر کے اشارے پر ایک سپاہی نے سوٹ کیس کھولا۔ نوٹ دیکھ کر سب کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

سپاہی...... نے سوٹ کیس دوبارہ بند کر دیا۔

''یہ لوگ کون ہیں؟'' پولیس آفیسر ذوہان اور کنول کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔

''یہ اس اسٹیٹ ایجنسی کے مالک ہیں اور یہ ان کی بیگم ہیں۔'' صابر علی نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں کرائے پر کوئی مکان حاصل کرنے آیا تھا مگر پھر اچانک میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

پولیس آفیسر نے سپاہیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے دائیں بائیں سے صابر علی کو پکڑ لیا...... ایک نے نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر وہ سب چل دیئے...... پولیس آفیسر کا چہرہ اندرونی خوشی کے باعث تمتما رہا تھا۔ اتنا بڑا کیس اتنی آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ اسے انعام اور ترقی ملنے کی امید ہو گی۔

پولیس کے جانے کے بعد ذوہان نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ وہ اس وقت دل ہی دل میں صابر علی کا شکر گزر رہا تھا' جس نے بروقت ان کی پوزیشن کلیئر کر دی تھی' ورنہ پولیس والے یقیناً انہیں بھی اس کیس میں گھسیٹ لیتے۔

''یہ سب کیا تھا ذوہان؟'' کنول نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اس سفید محل میں کیا بات ہے؟''

''مجھے خود اس سوال کا جواب نہیں معلوم......'' ذوہان نے کہا۔ ''آؤ میں تمہیں سفید محل دکھاتا ہوں۔'' اس نے اچانک میز سے چابیاں اٹھائیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''راستے میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ آج میں اطمینان اور سکون کے ساتھ اس مکان کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''



وہ دونوں سفید محل کے سامنے کھڑے تھے۔ اردگرد کی فضا پُرکیف تھی اور وہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ اونچائی پر بنا یہ محل انتہائی پُرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک ذوہان کو یوں محسوس ہوا گویا سفید محل کی دونوں کھڑکیاں کھڑکیاں نہیں' بلکہ دو انسانی آنکھیں تھیں...... جو کسی کی راہ تک رہی تھیں اور محل سراپا انتظار نظر آ رہا تھا' سوگ میں لپٹا اور اداس...... چند لمحوں بعد وہ بھری بھرکم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے...... کتنا سکون تھا وہاں' مکان کی اندرونی آرائش' قدیم و جدید کا حسین امتزاج لیے ہوئے تھی' ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ فضا میں کسی کی موجودگی کا احساس رچا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی باہر

گیا ہے اور بس واپس آنے ہی والا ہے۔ مکان سے ویرانی کی بجائے زندگی کا تاثر مل رہا تھا۔ وہاں چاروں طرف طمانیت اور سکون کی ایک لہر سی تھی جو چپکے سے ان کے روئیں روئیں کے اندر سرائیت کر گئی تھی...... اور وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بالکل خاموشی کے ساتھ مکان میں گھومتے رہے...... یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ بولے تو ان کے اردگرد چھایا ہوا سحر ٹوٹ جائے گا۔ اب وہ ایک بار پھر مکان کے کشادہ ہال میں کھڑے ہوئے تھے۔ ذوہان نے آگے بڑھ کر ایک کھڑکی کھول دی...... ساحل دریا کی نم آلود اور خوشگوار ہوا کا جھونکا ان کے چہروں سے ٹکرایا...... ذوہان کے جسم میں سر سے پاؤں تک سرشاری کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسی لمحے ان دونوں کی نظریں ملیں ذوہان نے بے اختیار کنول کو کھینچ کر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"آئی لو یو...... کنول!" اس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

"اوہ ذوہان...... آئی لو یو ٹو۔" کنول نے اس کے شانے میں منہ گھساتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"کنول میں اب ایک پل بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا...... ہم بس فوراً شادی کر لیں گے۔" ذوہان نے بے تابی سے جذباتی لہجے میں کہا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔

"ذوہان......" کنول نے کمزور سا احتجاج کیا اور اس کی باہوں کے تنگ گھیرے میں کسمسانے لگی۔ اب ذوہان کو ذرا ہوش آیا اور اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی...... اسی لمحے اس نے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے سفید گھوڑے والی ایک شاندار بگھی کو سامنے رکتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا...... اور دروازہ کھول کر دیکھنے پر اسے وہاں کچھ بھی نظر نہیں آیا چاروں جانب اسی طرح سکوت چھایا ہوا تھا...... کنول اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں......" ذوہان نے چونک کر جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔

"آؤ واپس چلتے ہیں۔" اس نے باہر آ کر دروازہ لاک کیا اور کنول کو ساتھ لے کر دفتر واپس آ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ کنول کو اسٹاپ تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے کہا۔

"آئی ایم سوری کنول، پتا نہیں اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔" اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ "یقین کرو، وہ سب غیر ارادی طور پر سرزد ہوا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے ذوہان......" کنول نے نظریں جھکائے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں، ہم دونوں بیک وقت ہی اس غیر ارادی کیفیت کا شکار ہوئے تھے۔ مجھے...... مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نہ جانے کب سے ان سب باتوں کی منتظر تھی......"

"بالکل ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔" ذوہان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا، جیسے میں نہ جانے کب سے وہ باتیں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ میں اب تک حیران ہوں کہ اچانک ایسا کیوں ہوا تھا؟ ہمارے جذبات ایک دوسرے کے لیے اتنی شدت کیوں اختیار کر گئے تھے؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ وہ اس جگہ، اس ماحول کا اثر تھا، شاید ہمارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو اس سے پہلے وہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ یعنی ہمارے لاشعور میں دبی خواہشات ہمارے اندر کا سچ ابھر کر سامنے لے آئی تھیں۔" کنول نے خیال ظاہر کیا۔ ذوہان نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

"کتنا درست تجزیہ کیا ہے تم نے...... آج ثابت ہو گیا کہ تم سائیکالوجی کی اسٹوڈنٹ ہو اور بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہو۔" آسمان پر چھائے ہوئے بادل گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ دونوں بارش کے ڈر سے تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ ذوہان سوچ رہا تھا کہ ایک دوسرے کے جذبات سے باخبر ہونے کے باوجود کبھی کبھی محبت کا اظہار بھی کرنا ضروری ہے۔

......☆......

چشتی صاحب خلاف توقع دو روز بعد ہی واپس آ گئے تھے۔ ان کی بیگم کی طبیعت اب کافی بہتر تھی اور وہ بہت مطمئن بلکہ خوش نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے بتایا

کہ اگلے ہفتے ان کا بیٹا ان سے ملنے کے لیے انگلینڈ سے آرہا تھا۔ تب ذوہان کو ان کے چہرے پر چھائی ہوئی خوشی کی اصل وجہ معلوم ہوئی' وہ اپنی ماں کو علاج کے لیے اپنے ساتھ انگلینڈ لے جانا چاہتا تھا۔

ذوہان سفید محل کے بارے میں بات شروع کرنے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ چشتی صاحب اخبار کے فرنٹ پیج کی سرخیاں دیکھنے کے بعد صفحات پلٹ رہے تھے کہ ان کی نظر اندرونی صفحات کی کسی خبر پر جم گئی۔ خبر پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ اتفاق سے ذوہان اس وقت انہی کی طرف متوجہ تھا۔ چشتی صاحب نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''یہاں آیئے برخوردار......'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ذوہان اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ چشتی صاحب نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔

''بینک ڈکیت اور دریا کنارے سفید محل...... ایک واقعہ' ایک معجزہ...... نیچے بینک لوٹنے والے اس شخص کی پوری کہانی چھپی ہوئی تھی جسے ذوہان نے محل میں ٹھہرایا تھا۔ اس شخص کا نام صابر علی نہیں بلکہ بابر خان تھا۔ سفید محل کی ایک عدد تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کہانی لکھنے والے رپورٹر نے مکان کا مختصر سا تعارف بھی تحریر کیا تھا۔ کسی رپورٹر کو اصل واقعے کی بھنک پڑ گئی تھی پھر اس کے لیے یہ ساری معلومات حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

''تم نہیں جانتے یہ پبلسٹی مجھے کتنی مہنگی پڑے گی۔'' چشتی صاحب نے اس پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔ ذوہان نے معذرت خواہانہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا انکل' کہ یہ سب......''

''لیکن میری غیر موجودگی میں تمہیں وہاں کسی کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟'' انہوں نے ذوہان کی بات کاٹی۔

''لیکن انکل آپ نے مجھے وہاں کسی کو لے جانے کے لیے منع بھی تو نہیں کیا تھا۔''

''ہاں...... غلطی میری ہی تھی' مجھے خصوصی طور پر تمہیں ہدایت دینی چاہیے تھی۔'' انہوں نے تسلیم کیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ''چلو خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔''

''اس کے علاوہ اس دوران ایک اچھی بات بھی ہوئی ہے۔'' ذوہان نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے سفید محل میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کا راز پا لیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ذوہان کہنے لگا۔

''انکل جیسا کہ آپ نے عظمت شیخ کے ساتھ پیش آنے والی ٹریجڈی کے بارے میں بتایا تھا کہ کس طرح وہ محبت میں ناکامی کا شکار ہوا تھا اور پھر اس مکان میں اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کی اچانک موت کا سبب یقیناً وہ گہرا صدمہ تھا جو اپنی محبت میں ناکامی کے باعث اسی اٹھانا پڑا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی دلہن کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا' دیوانہ وار اس سے محبت کرتا تھا' جب اس نے اپنی محبوبہ کے لیے وہ محل تعمیر کرایا تو ایک اعتبار سے گویا اپنی روح اس کی تعمیر میں شامل کر دی تھی......اور وہی روح اب تک وہاں امید وبیم کی کیفیت میں بھٹک رہی ہے۔ اب تک اسی آنے والی کی راہ تک رہی ہے۔ عظمت شیخ یقیناً ایک سچا اور کھرا انسان تھا' اس کی محبت بھی ہر قسم کے کھوٹ سے پاک تھی۔ لہٰذا اس کی روح بھی ویسی ہی سچی اور شفاف ہے۔ وہ وہاں ہر آنے والے کی روح کو اپنی سچائی کے آئینے میں دیکھتی ہے اور اس کے اندر چھپے ہوئے سچ کو باہر منعکس کر دیتی ہے...... جو بھی جذبہ اس کے دل میں ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹوں تک آن پہنچتا ہے......''

ذوہان نے ایک گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں کہنے لگا۔ ''حالانکہ عقل اسے مشکل سے ہی تسلیم کرتی ہے...... لیکن صرف ایک یہی توجیہہ سمجھ میں آتی ہے۔'' چشتی صاحب ساکت بیٹھے ذوہان کی بات سن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ذوہان کے لیے ستائش کی چمک لہرا رہی تھی۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اسی وقت ایک لمبی سی سیاہ کار دفتر کے سامنے آ کر رکی جسے باوردی شوفر چلا رہا تھا' شوفر جلدی سے نیچے اترا اور ادب سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک عمر رسیدہ اور باوقار سی

خاتون چھڑی کے سہارے کار سے نیچے اتریں...... ذوہان نے جلدی سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اور اپنا اخبار سمیٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ خاتون آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتی ہوئی دفتر کے دروازے تک پہنچیں۔ ذوہان نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے لیے دروازہ کھولا اور انہیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''نہیں......نہیں......'' خاتون نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔

''تمہارا بہت شکریہ مجھے اپنی چھڑی کا سہارا کافی ہے۔'' وہ دفتر کے اندر داخل ہوئیں اور مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''گو کہ میں پچاسی برس کی ہو چکی ہوں مگر اب بھی مجھ میں بہت ہمت ہے۔'' چشتی صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں میڈم؟''

''ہاں......'' انہوں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''کیا تم ہی اس سفید محل کے ڈیلر ہو؟''

''جی میڈم......'' چشتی صاحب نے ذرا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں...... پلیز۔'' بوڑھی خاتون نے مرتعش سی آواز میں پوچھا۔

''آئی ایم سوری میڈم۔'' چشتی صاحب نے کہا۔ ''اب وہ جگہ برائے فروخت نہیں ہے۔''

''اوہ......'' بوڑھی خاتون یکا یک کچھ غمزدہ سی نظر آنے لگی۔ ''شاید میں نے آنے میں دیر کردی۔'' وہ دھیمی آواز میں بولیں۔ ''میں بہت دور سے صرف اس مکان کی خاطر آئی تھی۔''

''کیا آپ...... آپ اس مکان کے بارے میں جانتی ہیں؟'' چشتی صاحب نے پوچھا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کردی۔

''ہاں...... جانتی ہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کے لہجے میں شکست خوردگی جھلک رہی تھی۔

''میں اس شخص کو بھی جانتی ہوں جس نے وہ سفید محل تعمیر کروایا تھا۔ عظمت شیخ......'' ذوہان کے ذہن میں اچانک ایک خیال ابھرا۔ اس نے پوچھا۔

''کیا ان کے پاس ایک سفید گھوڑے والی بگھی تھی؟''

''ہاں......'' انہوں نے جواب دیا' پھر ان کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے حیرانی سے کہا۔ ''لیکن تم یہ بات کیسے جانتے ہو نوجوان؟''

ذوہان نے ان کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی اور طرف تھا۔ ایک دم ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں ابھرا۔

''کیا آپ وہی ہیں جن کے لیے عظمت شیخ نے وہ مکان تعمیر کرایا تھا؟'' بوڑھی خاتون کا سر جھک گیا اور وہ اضطرابی سی کیفیت میں چھڑی کے اوپر اپنی ہتھیلی پھیرنے لگی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ افسردگی سے بولیں۔

''ہاں...... میں وہی ہوں۔ اس وقت میں ایک جذباتی اور بے وقوف سی لڑکی تھی۔ میں یورپ گھومنے گئی تھی اور پھر وہاں ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر بیٹھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا...... میں نے غلط کیا تھا غلطی کسی اک کی ہوتی ہے اور اس کا خمیازہ کسی دوسرے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ عظمت کے ساتھ ہوا...... وہ اپنی جان سے گزر گیا۔ یہ دلوں کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' وہ خاموش ہو کر اپنی سانس درست کرنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھا کر باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔ ''چھ ماہ پہلے میرے شوہر کا انتقال ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے اتنا عرصہ میں نے کسی خواب کے عالم میں گزار دیا تھا...... خواب کا طلسم ٹوٹا تو مجھے اپنے ماضی کی یاد شدت سے ستانے لگی۔ میں نے اپنے ملک واپس آنے کا ارادہ کرلیا۔ چند ہی روز پہلے میں یہاں پہنچی تھی۔ آج صبح ہی میں نے اخبار میں سفید محل کی کہانی پڑھی

اور بے تاب ہو کر یہاں چلی آئی' اپنا وعدہ نبھانے کے لیے۔ کیونکہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ محل مدتوں سے مجھے پکار رہا ہے اور وہی مجھے سات سمندر پار سے ہاں کھینچ لایا ہے......اور جیسے عظمت اب تک وہاں میری واپسی کا منتظر ہے۔'' چشتی صاحب اور ذوہان نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

چشتی صاحب نے سفید محل کی چابیاں ذوہان کی طرف بڑھائیں اور بوڑھی خاتون سے مخاطب ہوئے۔

''ذوہان صاحب آپ کو وہ مکان دکھا لائیں گے۔ آپ ان کے ساتھ چلی جائیے۔''

''اوہ...... بہت شکریہ۔'' بوڑھی خاتون کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ذوہان' خاتون کے ہمراہ ان کی گاڑی میں سفید محل تک پہنچا' وہ اس کا ہاتھ تھام کر محل کی دروازے تک لے گیا' جسے وہ پہلے ہی ان کے لیے کھول چکا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے اندر قدم رکھا' ذوہان نے دیکھا خاتون کے چہرے پر خوشی اور حیرت کا عجیب سا امتزاج نظر آ رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ گویا ذوہان کو بھول گیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتی رہیں تھیں۔

''اوہ عظمت...... یہ تو بہت خوبصورت گھر ہے...... بہت ہی خوبصورت' بالکل میرے خیالوں جیسا میرا تاج محل۔ میرے خدا...... میں تو کب سے اسے دیکھنا چاہتی تھی۔'' دفعتاً وہ ذوہان کی طرف مڑی۔ اسے اس کی آنکھوں میں امید کی چمک نظر آئی۔

''مسٹر...... مسٹر ذوہان......'' اس کے لہجے میں بیقراری تھی۔ ''کیا چشتی صاحب یہ مکان مجھے دلوا سکتے ہیں؟ میں اسے خریدنا چاہتی ہوں۔'' ذوہان مسکرایا۔ خاتون کی اس معصوم سی خواہش نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ وہ اپنی محبت کی اس یادگار کو حاصل کرنے کی خواہش مند تھی تاکہ اس کی گم گشتہ محبت......اس کے محبوب کی روح کو قرار آ سکے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔'' ذوہان نے جلدی سے جواب دیا۔ ''وہ یقیناً یہ مکان آپ کو دلوا دیں گے۔''

''اوہ...... کیا واقعی؟'' اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ وہ چند لمحوں تک کسی غیر مرئی سی چیز کو گھورتی رہی پھر کہنے لگی۔ ''تم بہت اچھے اور ذہین نوجوان ہو...... ہمدرد بھی ہو' اسی لیے یہ سب باتیں تم سے کر رہی ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے کہ میں اس وقت خود کو ایک نوجوان لڑکی کی طرح محسوس کر رہی ہوں...... بالکل پینسٹھ سال پہلے والی نوجوان اور حسین شبانہ کی طرح...... ہے نا عجیب اور احمقانہ سا احساس؟'' اس نے ذوہان کی طرف دیکھا۔

''نہیں میڈم...... یہ کوئی عجیب اور احمقانہ بات نہیں ہے' آپ دراصل اس وقت انہی کیفیات سے گزر رہی ہیں جن سے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے یہاں آنے پر آپ کو گزرنا تھا۔'' ذوہان نے کہا۔

''آ......وہ ساٹھ پینسٹھ سال درمیان سے نا جانے کون چرا کر لے گیا' مگر اب میں واپس آ گئی ہوں میرے عظمت......تم واقعی عظیم ہو......'' وہ سرگوشی کی سی آواز میں کہہ رہی تھی......اور...... اس لمحے ذوہان کو یوں محسوس ہوا جیسے سفید محل کے در و دیوار پر چھائی اداسی اور سوگ و انتظار کی کیفیت یک لخت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ فضا سے کیف آگیں اور نشاط انگیز موسیقی کی لہریں پھوٹنے لگی تھیں اور بڑے سے ہال کے وسط میں عمر رسیدہ شبانہ کی جگہ ایک نو عمر اور حسین دلہن عروسی لباس میں ملبوس' آنکھیں بند کیے کھڑی تھی...... یہ محبت بھی کیا عجب شے ہے...... سمٹے تو دل عاشق اور پھیلے تو زمانہ ہے......!!!



محبت اور نفرت

دستگیر شہزاد

محبت اور نفرت دو ایسے جذبے ہیں جو حد سے بڑھ جائیں تو انسان کو انسانیت سے دور کر دیتے ہیں' محبت اگر جنون کی شکل اختیار کر لے تو رشتے بھی اس سے حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک عاشق نامراد کا قصہ جسے اپنی بیوی سے شدید محبت تھی

عدالت کے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا تمام لوگ غصیلی نظروں سے مجرم کی طرف دیکھ رہے تھے سامعین کی قطار میں سب سے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے مولانا نے تسبیح کے دانوں کو جلد جلد پھیر کر از حد نفرت اور غصے بھری نظروں سے مجرم کی طرف دیکھا اور دانت بھینچ کر کہا۔

''کافر، نامعقول، کفن چور، یاد رکھ دوزخ کا ایندھن ہوگا تو۔''

''ہاں تو صاب۔'' قبرستان کے مجاور نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور کمر میں جیسے کسی نے گرم گرم سلاخیں ٹھونس دی ہوں اور صاب آج سے پہلے بھی میں کئی مرتبہ بیمار ہوا تھا لیکن یہ تو مادر بخت ایسی بیماری تھی کہ میرے تو پلے ہی پڑ رہی تھی کہ کیا ہے خدا جانے کیا بات تھی کہ......!''

''مطلب کی بات کرو۔'' منصب عدالت نے ٹوکا۔

''مطلب کی ہی تو کر رہا ہوں۔'' مجاور برا مان گیا۔ ''ہاں تو صاب بندہ تو چونکہ بیمار تھا اس لیے صاب میں نے مغرب ہی سے اٹوائی کھٹوائی سنبھالی اور بھوکا پیاسا ہی سو گیا قریب آدھی رات کے میرے آنکھ کھلی میرا کتا شیرو بے تحاشا بھونک رہا تھا یہ تو آپ جانتے ہوں گے صاب کہ ہم مسلمانوں میں کتے پالنا منع ہے کیونکہ یہ ناپاک جانور ہے آپ تو عالم فاضل آدمی ہیں صاب آپ کو تو پتا ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے تھے نا تب شیطان مادر بخت کتے کے منہ میں گھس گیا تھا اور اس لیے اس کے منہ سے یہ رال نکلتی ہے نا، وہ ناپاک ہوتی ہے اور زبان سے تمام بدن کو چاٹتا ہے سو وہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے سوائے پیشانی کے ہاں تو صاب اس کتے کو میں نے پالا نہیں تھا کسی نیکی میں بچا کھچا میں اس کتے کو دے دیتا چنانچہ وہ رات دن میرے دروازے پر پڑا رہتا لیکن قسم خدا کی میں بھی اسے قبرستان نہیں گھسنے دیا کیونکہ صاب یہ جہاں ہوتا ہے وہاں پر رحمت کے فرشتے نہیں آتے تو صاب کل رات اس کتے کے بھونکنے سے میری آنکھ کھل گئی دیکھا تو کوئی دو کا عمل ہوگا مجھے بڑا غصہ آیا کہ مادر بخت نے میری نیند خراب کر دی مارے غصے کے میں اسے مارنے کے لیے اٹھا اور جب اپنے کمرے سے باہر آیا تو صاب میں نے دیکھا کتا قبرستان میں گھسا بھونک رہا ہے اب تو مجھے اور خار آ گئی تو میں ڈانگ لے کر بھاگا کہ اس کی کمر توڑ دوں مردے بیچاروں کی روحیں لرز گئی ہوں گی کتے کو دیکھ کر لیکن صاب جب قبرستان میں گھسا تو مارے ڈر کے میرا تو پیشاب خطا ہوتے ہوتے رہ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ قبرستان کے بیچ و بیچ ایک جگہ مدہم سا دیا جل رہا ہے اور میرا کتا اسی سے دس گز کے فاصلے کھڑا بھونک رہا تھا میں نے کہا کہ یا مظہر العجائب یہ کیا اسرار ہے آدھی رات گئے یہ کیا معاملہ ہے قبرستان میں خدا جانے کوئی جان ہے کہ چڑیل ہے کہ بلا ہے، ہے کیا اتنی رات قبرستان میں کوئی انسان آئے تو مارے ہیبت کے وہیں ڈھیر ہو جائے صاب میں ڈرپوک نہیں ہوں لیکن ایسے موقع پر اگر آپ بھی ہوتے تو خدا کی قسم یہیں بے ہوش ہو جاتے خیر صاب میں نے کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر اپنے پر دم کیں مضبوطی سے لاٹھی ہاتھ میں تھامی اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا میرا پورا وزن سو سالہ بوڑھے کی طرح لرز رہا تھا اور صاب لاٹھی تو جیسے میرے ہاتھ سے بھاگی جا رہی تھی جیسے تیسے میں اس روشنی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مٹی کے ایک ڈھیر پر ٹارچ جلا کر رکھی ہوئی تھی اور قریب ہی ایک قبر کھلی پڑی ہے اور یہ نوجوان (مجاور نے مجرم کی طرف اشارہ کیا) قبر میں گھسا ہوا ایک نوجوان عورت کی لاش کو قبر سے باہر نکال رہا تھا یہ لاش کل صبح ہی دفنائی گئی تھی میری آنکھوں میں خون اتر آیا میں نے اسے پکڑا اور فوراً تھانے میں پہنچا دیا اور جا کر صبح تک محنت کر کے قبر کو بند کیا اب پتا نہیں یہ شریف زادے وہاں کفن چرانے گئے تھے یا خدا جانے کیا

کرنے۔‘‘ مجاور نے اپنا بیان ختم کیا تو عدالت کے کمرے میں ایک ہلڑ مچ گیا۔

’’بڑے شرم کی بات ہے پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے نامعقوم کو ایسی جگہ مارو کافر کو جہاں پانی نہ ہو۔ واہ اچھی عزت رکھی ہے کفن چور کون جانے حرامی نے کتنی قبریں کھولی ہوں گی اور کتنی لاشوں کی بے حرمتی کی ہوگی۔ ہاتھ کاٹ ڈالنے چاہیے ایسے لوگوں کے۔‘‘ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے لیکن کوئی کسی کی سنتا نہیں تھا۔

’’آرڈر، آرڈر۔‘‘ یکلخت کمرے میں سناٹا چھا گیا لیکن سب لوگ کھا جانے والی نظروں سے مجرم کو دیکھنے لگے۔

’’مجرم کچھ اپنی صفائی میں کہنا چاہتا ہے تو اجازت ہے۔‘‘

مجرم اٹھا، گورا چٹا رنگ، نیلی کانچ کی گولیوں ایسی آنکھیں گھنگھریالے بالے، بھرا بھرا جسم اور خاصا خوب صورت عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

’’خدا کو حاضر ناظر جان کر جو کچھ کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر جو کہوں گا سچ کہوں گا۔‘‘ مجرم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’مائی لارڈ اینڈ جنٹل مین آف دی جیوری۔ میں گناہ کا اقرار کرتا ہوں اور اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں گزشتہ رات میں نے ایک قبر کو کھولا تھا لیکن کسی بری نیت سے نہیں مجاور کے بیان کے مطابق میں ایک نوجوان عورت کو قبر سے باہر نکالنے کی کوشش کررہا تھا اس بات میں مجاور کو غلط فہمی ہوئی ہے میں لاش کو باہر نکالنا نہیں چاہتا تھا میں تو صرف اسے دیکھ رہا تھا اور یقین مانیے وہ کوئی غیر نہیں تھی میری اپنی بیوی تھی اور کل صبح وہ مر گئی تھی۔ آج سے کوئی چھ ماہ پہلے میری اس کے ساتھ شادی ہوئی تھی ہم دونوں شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور والدین کی مخالفت کے باوجود میں نے اس سے شادی کرلی تھی میری اس حرکت پر والدین مجھ پر بہت خفا ہوئے ان کا بس چلتا تو مجھے زندہ دیوار میں چنوا دیتے لیکن آخر کو ماں باپ تھے چنانچہ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دینے پر ہی اکتفا کیا کچھ یہ بات نہیں تھی کہ میری بیوی نیچ ذات تھی وہ یتیم تھی تو کیا ہوا خاندانی تھی اور از حد خوبصورت اپنے چچا کے یہاں رہتی تھی اور انہوں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا اور جب میں گڑگڑا کر اپنی بیوی کے چچا سے اس کے لیے درخواست کی تو وہ راضی ہوگئے لیکن اتنا ضرور کہا برخوردار پہلے اپنے والدین سے دریافت کرلو ایسا نہ ہو کہ پیچھے سے جھگڑے اٹھیں اور نوبت کورٹ کچہری تک پہنچے تو تمہاری اور ہماری دونوں کی عزت خاک میں مل جائے مجھے یقین تھا کہ اگر والد صاحب نہ مانے تب بھی اماں جان انہیں جیسے بھی ہوگا منوالیں گے لیکن وہاں کچھ اور ہی گل کھلا ہوا تھا میری بے خبری ہی میری بات میرے ماموں کی لڑکی سے طے ہوچکی تھی جب میں نے انفال کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں کہا تو ابا جان آگ بگولا ہوگئے لیکن غصے کو دبا کر مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب میں کسی صورت نہ مانا تو انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پیٹنا شروع کیا وہ اماں نے بیچ میں پڑ کر میری جان چھڑائی ورنہ مجھے یقین ہوچکا تھا کہ وہ دن میری زندگی کا آخری دن تھا۔ خیر کئی روز تک اماں مجھے سمجھاتی رہیں۔

’’دیکھو بیٹا ایسی طفلانہ حرکتیں نہیں کرتے تمہاری بات طے ہوچکی ہے اور اگر شادی نہ ہوئی تو پورے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ ہم تمہارے دشمن نہیں کہ تمہارا برا چاہیں مشعل میں کیا برائی ہے سگھڑ ہے خوب صورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بچپن سے تمہارے ساتھ کھیلی ہوئی ہے سچ کہتی ہوں ایسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی ساری خدائی میں، تم ابھی بچے ہو جتنی عمر اتنی عقل اچھی صورت پر مرے جاتے ہو لیکن یاد رکھو اچھی صورت والی لڑکیاں ہی حرافہ ہوتی ہیں وہ کون جانے کون ہے کون نہیں نہ ماں ہے نہ باپ چچا کے ٹکڑوں پر پلی ہوئی ہے کیا نام بتایا تھا تم نے، انفال ہاں کیا ہے اس میں اللہ رکھے وہ تو میری مشعل کی جوتی کی برابری بھی نہیں کرسکتی تم ہو بے وقوف کہتے ہو، اس سے محبت ہے بڑے شرم کی بات ہے بیٹا آج تک کسی بھی لڑکے نے اپنے والدین کے سامنے ایسی بے حیائی کی بات کی ہے یہ تو انگریزوں میں ایسا رواج ہوگا ہمارے خاندان میں تو شادی سے پہلے میاں بیوی کو ایک دوسرے کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوتے تھے میں نے تعلیم تمہیں اس لیے نہیں دلوائی تھی کہ تم اس سے ایسی واہیات باتیں سیکھو میرا کہنا مانو اور مشعل سے شادی کرلو آج تم جھوٹے کہہ دو تو ابھی تمہاری بچ شادی کردوں۔‘‘

’’مائی لارڈ میں اپنے بیان کی طوالت کی معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے اس طرح سے بیان کرنے کی اجازت دیں میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا ہے اور اگر میں نے اسے اندر ہی اندر دبانے کی کوشش کی تو میں پاگل ہوجاؤں گا دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گا ہاں تو اماں جان مجھے از حد سمجھایا لیکن میں اپنی بات پر اڑا رہا تھک ہار کر انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور مجھے بھی دو ہتڑ جما دی والد صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے آخری نوٹس دے دیا کہ اگر مجھے اس گھر میں رہنا ہو تو مشعل سے ہی شادی کرنی پڑے گی ورنہ میں ان کے لیے گویا پیدا ہی نہیں ہوا تھا میں عشق میں دیوانہ ہو ہی رہا تھا اپنے کپڑے لتے لے کر چلتا بنا اماں نے دروازے سے سر دے دے مارا اور ننگے سر اور ننگے پیر میرے پیچھے دوڑیں لیکن اس وقت میں اس قدر سنگدل ہوگیا تھا کہ میں پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا میں نے انفال ہی کے محلے میں کرائے پر ایک کمرہ لے لیا اور اس کے چچا سے پھر درخواست کی انہوں نے پوری سرگزشت سنی تو انفال کی شادی پر کسی طرح تیار نہ ہوئے تھے۔

اب یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی اور میں دھوبی کا کتا ہو کر رہ

گیا تھا اور عجب دیوانوں کی سی حالت ہوگئی تھی نہ کھانے کی فکر تھی نہ ملازمت کی بس خیال تھا تو ایک ہی کہ کسی صورت انفال سے شادی کرلو ادھر انفال کی حالت مجھ سے بدتر تھی اس نے تنگ آ کر جب زہر کھانے کی دھمکی دی تو اس کے چچا نے مجبوراً ہم دونوں کی شادی کردی میں از حد خوش تھا مجھے جیسے ساری دنیا کی دولت مل گئی تھی ہمارا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور تھوڑا بہت سامان ملازمت سے آتا تو انفال مسکرا کر میرا استقبال کرتی گرم گرم چائے اور ناشتہ فوراً میرے سامنے رکھ دیتی اور ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے کہتے ہیں شادی کے بعد محبت کم ہوجاتی ہے اور بڑھاپے میں تو میاں بیوی روازنہ آپس میں جھگڑے رہتے ہیں لیکن میں اس کو نہیں مانتا ہماری محبت روز بروز بڑھتی رہی اور اگر انفال زندہ ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ ہم بڑھاپے میں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکتے دنیا مافیا سے بے خبر ہم ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک دن انفال نے مجھے خوش خبری سنائی کہ وہ حمل سے ہے ہماری خوشی انتہا کو پہنچ گئی اور مجھ سے زیادہ خوش قسمت شخص مجھے دنیا میں کوئی اور نظر نہیں آتا تھا اور مارے غرور کہ میرے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے ہم رات گئے تک ہونے والے بچے کے بارے میں باتیں کرتے رہتے اور نام کے بارے میں لڑکا ہوگا لڑکی اس بات پر بہت لمبی چوڑی بے مقصد بحثیں کرڈالتے اور یوں مزے مزے میں دن گزرے جارہے تھے کہ قدرت نے میری زندگی میں زہر گھول دیا انفال کو مس ریڈ ہوگیا مرا ہوا بچہ پیدا ہوا میں نے شہر بھر کے ڈاکٹروں کو جمع کرلیا روپیہ پانی کی طرح بہادیا لیکن مرے ہوئے بچے کا زہر انفال کے تمام جسم میں پھیل گیا تھا ڈاکٹرز نے بہت سر مارا لیکن وہ اسے نہ بچا سکے اور کل پرسوں رات کو انفال مرگئی کل صبح لوگوں نے اسے دفنا دیا اور میں نے جنازے میں بھی شریک نہ ہوسکا میرا دماغ سن ہوگیا تھا اور کلیجہ پھٹا جاتا تھا انفال کی صورت آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی نہ تھی اور اس کی مترنم آواز میرے کانوں سے پردوں سے مسلسل ٹکرارہی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں خودکشی کرلوں اور کوشش بھی کی لیکن مائی لارڈ اپنے آپ کی جان لینا بہت بہت مشکل ہے یہاں بڑے بڑے سورماؤں کے دل دہل جاتے ہیں میری بھی ہمت نہ پڑی اور میں بے تحاشا رونے لگا آپ میری اس وقت کی حالت کا بہتر اندازہ اپنے تصور میں لگا سکتے ہیں میں الفاظ میں اسے بیان نہیں کرسکتا اب کوئی مجھے دلاسا دینے والا نہیں مجھے یقین تھا کہ میرے والدین مجھے ڈھارس بندھانے ضرور آئیں گے لیکن خدا جانے وہ اس حادثے سے بے خبر تھے یا ان کے دل پتھر ہوگئے تھے بہر حال رات کے بارہ بجے تک میں یونہی کچھ کھائے پیے بغیر پڑا رہا اور پھر ایک دم سے انفال کی محبت نے جوش مارا اس کی صورت اس کا جسم اور اس کی باتیں مجھے یاد آئیں اور میں بے چین ہوگیا ایک دم سے میرے سر پر بھوت سوار ہوگیا میں نے بیلچہ اور ٹارچ لی اور قبرستان میں جا پہنچا جنازے میں تو شریک نہیں ہوا تھا اس لیے ہر ایک قبر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا اور آخر ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر پہنچ کر رک گیا یقین ہوگیا کہ یہ انفال کی قبر ہے ٹارچ لگا کر ایک طرف رکھ دی اور پاگلوں کی طرح بیلچہ چلانے لگا تھوڑی ہی دیر میں بیلچہ پتھر تک پہنچ گیا اور جب میں نے پتھر ہٹائے تو اس کے نیچے کفن میں لپٹی ہوئی انفال کی لاش پڑی تھی انفال میری بیوی جو سلوٹوں والے بستر پر نہیں سوسکتی تھی جسے سلوٹوں پڑے بستر پر نیند نہیں آتی تھی کنکر پر پڑی ہوئی تھی یہ خیال آتے ہی میں بے تحاشا رونے لگا کچھ دیر کے بعد میں اٹھا قبر میں اتر کر میں نے انفال کے منہ سے کفن سرکایا تو تیز بدبو نے میرا دماغ پراگندہ کردیا میں بھونچکا رہ گیا ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ انفال کے منہ سے بدبودار سیاہ لعاب بہہ رہا تھا اور نیلے موٹے چیونٹے اس کے منہ اور ناک میں چل رہے تھے مائی لارڈ ان ہونٹوں کو میں نے چوما تھا اور اس منہ سے کسی زمانے میں سونف اور الائچی کی خوشبو آتی تھی چومنے کا خیال آتے ہی میں لرز اٹھا ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی ایک لہر دوڑ گئی انفال کا وہ خوب صورت جسم جو میری بانہوں میں سیماب کی طرح پھیلا کرتا تھا نیلا پڑ گیا تھا اور اس پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور خوب صورت آنکھوں میں چیونٹے لگے اپنی تیز تیز ٹانگوں سے دیدے کریدرہے تھے اور تم جسم سے بے پناہ بدبو اٹھ کر میرا دماغ پراگندہ کررہی تھی اس جسم کو میں نے اپنی بانہوں میں لیا تھا یہ ہونٹ میں نے چومے تھے میں نے سوچا اور انفال کی محبت میرے دل سے ہوا ہوگئی میرا جی متلانے لگا اور انفال کے خلاف شدید نفرت نے میرے دل میں اپنے پنجے گاڑھ دیے میں لاش کو چھوڑ کر بھاگنے والا تھا کہ مجاور نے مجھے پکڑ لیا جی ہاں میں مجرم ہوں گناہگار ہوں آپ کا بھی اور انفال کا بھی آپ کا اس لیے کہ میں نے ایک قبر کھولی اور انفال کا اس لیے کہ اب مجھے اس سے محبت نہیں رہی۔ میں لاکھ چاہتا ہوں کہ اس کے مردہ جسم کو بھول کر زندہ جسم کو یاد کروں لیکن ہمیشہ مجھے اس کا متعفن جسم ہی یاد آتا ہے اور میرا جی متلانے لگتا ہے اگر میں نے قبر نہ کھولی ہوتی تو انفال کو قیامت تک نہ بھولتا آپ جو چاہے سزا دیں میں اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم سمجھتا ہوں انفال میں اسے بھولنا چاہتا ہوں لیکن مرتے دم تک سجانا چاہتا ہوں لیکن یہ بھی نہیں کرسکتا میں اس نفرت کو جو انفال کے لیے میرے دل میں آکر جم گئی نکالنا چاہتا ہوں لیکن نہیں نکال سکتا میں کیا کروں میں مرجاؤں گا۔ خدا کی قسم دیوانہ ہوجاؤں گا۔"

وہ رو پڑا عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور تمام خجالت سے جھکی ہوئی تھیں مولانا برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے تسبیح جیب میں رکھی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے باہر چل دیے۔



فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

خالی صندوق	ابن عبداللہ
لہو کا گلاب	صداقت حسین ساجد
غیرت مند	شہباز اکبر الفت
سناٹا	عنبرین
اللہ دتہ	صائمہ قریشی
بھوت بنگلہ	نائمہ غزل

خالی صندوق

ابن عبداللہ

یہ کہانی اس دن شروع ہوئی تھی جب ہم نے گھر بدلا تھا اور دوسرے محلے میں بسنے آئے تھے۔

اس نئے محلے میں باقی سب کچھ پرانا تھا جیسا کہ ہر محلے میں ہوتا ہے پر ایک بوڑھا اس محلے میں عجیب تھا۔

وہ ہر وقت متلاشی نظروں سے محلے کی گلیوں اور کونوں کھدروں میں جھانکتا رہتا تھا پہلے پہلے مجھے لگا کہ اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے جس کی اسے تلاش ہے پر کچھ مہینوں کے بعد مجھے اپنی سوچ بدلنی پڑی کیونکہ محلے کے ایک اور بزرگ نے مجھے بتایا کہ یہ پچھلے کئی سالوں سے ایسے ہی کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔

کسی بھی چیز کو ہم ایک وقت تک تلاش کرتے اور پھر اس پر صبر کر لیتے ہیں اور کسی اور چیز سے دل لگا لیتے ہیں دنیا کی ہر چیز کا نعم البدل موجود ہے کچھ رشتوں کے علاوہ۔ شاید اس بوڑھے سے بھی کوئی رشتہ کھو گیا تھا۔

مجھے تجسس ہوئے جا رہا تھا کہ اس بوڑھے کی کھوئی ہوئی چیز کیا ہے جو مل ہی نہیں رہی۔ میں کسی موقعہ کی تلاش میں تھا جب اس سے پوچھ سکوں۔

پھر وہ موقعہ مجھے مل گیا وہ بوڑھا کچھ دنوں سے نظر نہیں آیا اور میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی دروازہ کھلا اور بوڑھا زرد چہرہ لیا سامنے تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مردگی چھا گئی شاید وہ کسی اور کے انتظار میں تھا۔

''کیسے آنا ہوا برخوردار۔'' مجھے دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''آپ کچھ دن سے نظر نہیں آئے تو خیریت دریافت کرنے چلا آیا۔''

میری بات سن کر انہوں نے مجھے اندر آنے کا کہا اور کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے بیٹھے بتا رہے تھے کہ ان کی طبعیت خراب تھی اس لئے باہر کم جاتے ہیں۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔

میرے سوال پر انہوں مجھے یوں چونک کر دیکھا جیسے میں ہی وہ گمشدہ چیز ہوں جس کی تلاش میں ان کی آنکھیں بے چین ہیں۔

پھر بولے ایک کہانی سنو گے؟''

''جی۔'' میں نے سر ہلا کر کہا تو وہ کہانی سنانے لگے۔

''پتر میری ماں ایک غریب عورت تھی جب میرا باپ ٹی بی سے خون تھوکتے تھوکتے مر گیا تو اس نے مجھے بڑی محنت سے پالا۔ وہ اونچے گھروں میں کام کرتی تھی برتن مانجھتی تھی ایک سے دوسرے گھر جاتی صفائی کرتی تھی سب کی پر اپنے نصیب کی کالک کبھی دھو نہیں پائی تھی۔''

بولتے بولتے بوڑھے کو زور کی کھانسی آئی۔

مجھے لگا بوڑھا دم آخر پر ہے پر کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا اور کہانی کو دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا،

اس نے مجھے بڑی محنت سے پالا اس کا خواب تھا کہ میں افسر لگ جاؤں وہ دن رات کام کرتی تھی دن کا تو بتا ہی چکا رات وہ محلے کے بچوں کے کپڑے سیتی تھی اکثر میں اسے رات چھپ کر دیکھتا تھا کبھی کبھی تو مجھے لگتا جیسے وہ کپڑے نہیں میرا نصیب سی رہی ہے۔

مشین پر جھکی ہوئی وہ پورے انہماک سے میرا نصیب سیتی تھی ماں کی نظر بہت کمزور ہوگئی تھی سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے اسے بہت محنت کرنا پڑتی تھی اور ایسے میں جب میں اس کے ہاتھ سے دھاگہ لیکر سوئی میں ڈالتا تو مجھے وہ یوں دیکھتی جیسے آنکھیں خواب دیکھتی ہیں اس گھر کی دیواروں میں مشین چلنے کی آواز میں اب بھی سن سکتا ہوں۔

بوڑھا سانس لینے کو رکا اور پھر کچھ دیر خاموش ہوگیا جیسے دیواروں سے رستی ٹھک ٹھکا ٹھک مشین چلنے کی آواز سن رہا ہو۔

کچھ دیر بعد وہ پھر سے بولنے لگا۔

میری ماں کی آنکھوں میں میرا خواب ہی رہتا تھا افسر بننے کا پتا نہیں وہ اتنا طویل خواب دیکھنے سے اکتاتی کیوں نہیں تھی شاید ساری مائیں اپنی اولاد کے لئے ایسے ہی طویل خواب دیکھتیں ہوں گی۔

ماں منہ نہار اٹھ کر کام پر نکل جاتی تھی اور شام گہری ہونے کے بعد لوٹتی تھی۔ خالی پیٹ جاتی تھی اور اونچی حویلیوں میں بہتے رزق سے اپنے حصے کی بھوک لیکر لوٹ آتی تھی شاید ماں نے بھوک ہڑتال کی ہوئی ہوتی تھی خدا کے سامنے میرے مقدر کے لئے ماں کی اس بھوک نے مجھے کبھی بھوکا سونے نہیں دیا تھا میری ماں کی ہاتھ کی روٹی میں بڑی لذت تھی۔ میں پوچھتا تھا کہ وہ کیا ڈالتی ہیں روٹی میں جو اتنی لذیذ ہوتی ہے اور وہ مسکرا دیتی تھیں۔

شاید میں اس لذت کی وجہ کبھی نہ جان پاتا مگر ایک دن جب مالک مکان میری ماں کو گالیاں دیکر رخصت ہوا تو میں نے دیکھا میری ماں کے گالوں سے بہتے آنسو آٹے میں شامل ہو رہے ہیں اور اس دن مجھے پتا چلا کہ میں ماں کے آنسو کھاتا ہوں روٹی میں پکے ہوئے آج جب میں کسی ماں کو اس لئے روتے دیکھتا ہوں کہ اس کی اولاد نے اسے غم دیا تو میری زبان پر ماں کے آنسوؤں کا ذائقہ زندہ ہو جاتا۔

ان آنسوؤں کی لذت دنیا کا کوئی ذائقہ مقابلہ نہیں کر پایا۔

بوڑھے کی ڈھونڈتی آنکھوں میں کچھ آنسو جمع ہو رہے تھے اور گھر میں جیسے آنسو برسنے لگے تھے۔

ماں سوتی نہیں تھی ہر وقت کام کام میں کہتا کہ ماں سو جایا کرو تو آگے سے کہتیں سو جاؤں گی بس تم افسر بن جاؤ۔ میں اس کے بعد اطمینان سے سویا کروں۔

میں پڑھتا چلا گیا اور کمیشن کا امتحان دیا۔

ماں کی دھندلی نظروں میں میرا مقدر روشن تھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے مقدر کو دیکھنے کے لئے انہوں نے اس عینک کا سہارا لیا ہو جس کو کان پر دھاگے سے باندھتی تھیں۔

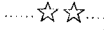
میں نے کمیشن امتحان پاس کرلیا اور جس دن یہ خبر مجھے ملی میں بازار میں تھا۔ میں بھاگا بھاگا گھر آیا پر ماں تو مجھے افسر بنا کر خود سو چکی تھی۔

وہ وعدے کی بڑی پکی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ میرے افسر بنتے ہی وہ سو جائیں گی پتا نہیں انہوں نے وعدہ توڑنا کیوں نہیں سیکھا تھا۔ بوڑھے کی آواز بھیگ چکی تھی۔

تم پوچھتے ہو میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں تو سنو میں گلیوں میں ماں کے وہ دکھ ڈھونڈتا ہوں جو وہ لوگوں سے چھپا کر چلتی تھی ان گلیوں میں مجھے وہ دکھ نہیں ملتے اور ماں کا صندوق بھی تو خالی ہے پتا نہیں وہ سارے غم کہاں چھپا گئی ہے جو ملتے ہی نہیں ہیں میں ماں کا چھپایا گیا پانچ روپے کا سکہ ڈھونڈ لیتا تھا پر ماں کے چھپائے گئے غم برسوں میں ڈھونڈ نہیں پایا ہوں۔

بوڑھا خاموش ہوگیا اور میں بوجھل دل لئے وہاں سے اٹھ آیا ماں کے خالی صندوق میں بھرے ہوئے غم مجھے بھی

دکھائی نہیں دیے تھے۔



لہو کا گلاب

صداقت حسین ساجد

''اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں اس کے لیے سرخ گلاب لے آؤں تو وہ میرے ساتھ رقص کرے گی۔'' ٹوٹے ہوئے دل والا نوجوان طالب علم چلایا۔ ''لیکن اس سارے باغ میں کوئی سرخ گلاب نہیں ہے۔''

شاہ بلوط کے درخت میں اپنے گھونسلے میں بیٹھی بلبل نے اس کی آواز سنی اور حیران ہو کر پتوں سے باہر جھانکنے لگی۔

''کہیں بھی ایک سرخ گلاب بھی نہیں ...'' وہ چلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرنے لگے۔ ''آہ! خوشی کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر منحصر ہوتی ہے...... میں نے عقل مندوں کے قلم سے نکلنے والا ایک ایک لفظ پڑھا ہے اور فلسفے کے تمام اسرار و رموز جانتا ہوں، لیکن ایک سرخ گلاب کی کمی نے میری زندگی الٹ پلٹ کر رکھ دی ہے۔''

''آخر ایک سچا عاشق دکھائی دے ہی گیا۔'' بلبل نے کہا۔ ''ہر رات میں نے اس کے گیت گائے ہیں، لیکن کبھی اسے دیکھا نہیں ہے...... ہر رات میں نے ستاروں کو اس کی کہانی سنائی ہے اور اب میں اسے دیکھ رہی ہوں...... اس کے بال سنبل کے شگوفوں کی طرح کے سیاہ ہیں اور اس کے ہونٹ اس کی طلب کے گلاب کی طرح سرخ ہیں، لیکن جذبات نے اس کے چہرے کو زرد ہاتھی دانت کی سی پیلاہٹ دے دی ہے اور غم نے اس کی پیشانی پر اپنی مہر لگا دی ہے۔''

''کل رات شہزادے کی طرف سے رقص کی دعوت کا اہتمام ہوگا۔'' نوجوان طالب علم بڑبڑایا۔ ''اور میری محبوب بھی وہاں جائے گی...... اگر میں اس کے لیے ایک سرخ گلاب لے گیا، تو وہ میرے ساتھ دیر تک رقص کرے گی...... اگر میں نے اسے سرخ گلاب دیا، تو میں اسے اپنی بانہوں میں لے سکوں گا اور وہ میرے کندھے پر اپنا سر رکھے گی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوگا، لیکن میرے باغ میں کوئی سرخ گلاب نہیں ہے، اس لیے میں تنہا بیٹھا رہوں گا اور وہ میرے پاس سے گزر جائے گی...... وہ مجھے بالکل توجہ نہیں دے گی اور میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''یقیناً یہ ایک سچا عاشق ہے۔'' بلبل نے کہا۔ ''جس جذبے کے میں گیت گاتی ہوں، یہ اس کا شکار ہے، جو میرے لیے طرب ہے، اس کے لیے کرب ہے...... یقیناً محبت ایک انوکھی چیز ہے...... یہ زمردوں سے زیادہ مہنگی اور ہیروں سے زیادہ قیمتی ہے...... موتیوں اور اناروں سے اسے خریدا جا سکتا ہے، نہ ہی یہ کسی بازار میں بکتی ہے...... اسے تاجروں سے خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی سناروں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہے۔''

''موسیقار اپنی غلام گردش میں بیٹھیں گے۔'' طالب علم نے کہا۔ ''اور اپنے تاروں والے ساز بجائیں گے...... میری محبوب چنگ رباب کی تان پر رقص کرے گی...... اس کا رقص اتنا سبک خرام ہوگا کہ اس کے پاؤں زمین کو نہ چھوئیں گے اور زرتار عباؤں میں ملبوس دربار کے امراء اس کے گرد پرے باندھ دیں گے، لیکن وہ میرے ساتھ رقص نہیں کرے گی، کیوں کہ میرے پاس اسے دینے کے لیے ایک بھی سرخ گلاب نہیں ہے۔''

وہ گھاس پر جا گرا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگا۔

''یہ کیوں رو رہا ہے؟'' ایک ننھے سبز کرلے نے دم ہوا میں اٹھا کر اس کے پاس سے بھاگ کر گزرتے ہوئے پوچھا

ایک تتلی نے سورج کی کرن کے گرد پھڑ پھڑاتے ہوئے کہا۔
''کیا واقعی ......لیکن کیوں؟''
ایک پھول نے ہولے سے اپنے پڑوسی سے سرگوشی کی۔
''یہ ایک سرخ گلاب کے لیے رورہا ہے۔''
بلبل نے یہ سرگوشی سن لی اور کہا۔
''ایک سرخ گلاب کے لیے؟''
کرلا اور تتلی چلا اٹھی۔
''یہ کیسی پاگلوں کی سی بات ہے!''
پھر ننھا سبز کرلا کھلکھلا کر ہنس پڑا، وہ کچھ زیادہ شوخ واقع ہوا تھا، لیکن بلبل طالب علم کے غم کی حقیقت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے گھونسلے میں بیٹھی وہی اور محبت کے اسرار پر غور وفکر کرتی رہی۔ اچانک اس نے اپنے پر پھیلائے اور اڑ گئی۔ وہ ایک سائے کی طرح درختوں کے جھنڈ سے گزری اور سائے کی طرح تیرتی ہوئی باغ کے دوسرے سرے پر جا پہنچی۔ ایک گھاس کے قطعے کے درمیان میں گلاب کا ایک خوب صورت پودا کھڑا تھا۔ جب بلبل نے اسے دیکھا، تو اس کے اوپر جا پہنچی اور ایک ہری بھری ٹہنی پر بیٹھ گئی۔
''مجھے ایک سرخ گلاب دے دو۔'' بلبل نے کہا۔ ''میں تمھیں اپنا سب سے میٹھا نغمہ سناؤں گی۔''
لیکن پودے نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میرے گلاب سفید ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''سمندر کی جھاگ جیسے سفید اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھوپ سے زیادہ سفید......''
''لیکن مجھے تو سرخ گلاب چاہیے......''
''تم میرے بھائی کے پاس جاؤ، جو پرانی دھوپ گھڑی کے پاس کھڑا ہے......شاید وہ تمھاری خواہش پوری کر سکے''
چناں چہ بلبل اڑ کر گلاب کے اس پودے کے پاس جا پہنچی، جو پرانی دھوپ گھڑی کے پاس کھڑا تھا۔
''مجھے ایک سرخ گلاب دے دو۔'' بلبل نے کہا۔ ''میں تمھیں اپنا سب سے میٹھا نغمہ سناؤں گی۔''
لیکن پودے نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میرے گلاب زرد ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''گہرے زرد تخت پر بیٹھنے والی کنواری جل پری کے بالوں کی طرح زرد اور سبزہ زار میں کھلنے والے نرگس کے پھولوں سے زیادہ زرد، جو گل چیں کے آنے تک لہلہاتے رہتے ہیں......''
''مجھے تو سرخ گلاب کی ضرورت ہے۔''
''تم میرے بھائی کے پاس جاؤ، جو طالب علم کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہے......شاید وہ تمھاری طلب پوری کر سکے۔''
چناں چہ بلبل اڑی اور گلاب کے اس پودے تک جا پہنچی، جو طالب علم کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا۔
''مجھے ایک سرخ گلاب دے دو۔'' بلبل نے کہا۔ ''میں تمھیں اپنا سب سے میٹھا نغمہ سناؤں گی۔''
لیکن پودے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میرے گلاب سرخ ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''فاختہ کے پیروں کی طرح سرخ اور سمندر کے غاروں میں لہراتے رہنے والے مونگے کے بڑے بڑے پنکھوں سے زیادہ سرخ......''

''پھر مجھے ایک سرخ گلاب دینے میں کیا قباحت ہے؟''

''سردی نے میری رگوں کو سرد کر دیا ہے اور کہرے نے میری کلیوں کو کاٹ کھایا ہے......طوفان نے میری ٹہنیاں توڑ ڈالی ہیں......اس سال مجھ پر کوئی گلاب نہ آئے گا......''

''مجھے تو صرف ایک سرخ گلاب کی ضرورت ہے۔'' بلبل نے کہا۔ ''صرف ایک سرخ گلاب کی......کیا وہ مجھے کسی طرح سے حاصل نہیں ہو سکتا؟''

''ایک طریقہ ہے۔'' پودے نے جواب دیا۔

''طریقہ......کیسا طریقہ؟''

''لیکن وہ اتنا خوف ناک ہے کہ میں تمھیں بتانے کی ہمت نہیں رکھتا۔''

''تم مجھے بتاؤ۔'' بلبل نے کہا۔ ''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔''

''اگر تمھیں سرخ گلاب چاہیے۔'' پودے نے کہا۔ ''تو تمھیں اسے چاندنی کی روشنی میں موسیقی سے تخلیق کرنا ہوگا اور اس میں رنگ بھرنے کے لیے اپنے دل کا لہو دینا ہوگا......تم کانٹے پر اپنا سینہ رکھ کر مجھے گیت سناؤ گی......تمام رات تمھیں مجھے گیت سنانا ہوگا اور کانٹا تمھارے دل میں اترنا چاہیے......تمھارا زندگی سے بھرپور لہو میری رگوں میں دوڑے گا اور میرا بن جائے گا۔''

''زندگی کے بدلے ایک سرخ گلاب کا سودا بہت مہنگا ہے۔'' بلبل چلائی۔ ''اور زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی......سرسبز درختوں کے بیچ بیٹھ کر سورج کو اپنے سونے کے رتھ اور چاند کو اپنی موتی کی بگھی میں سفر کرتے دیکھنا اچھا لگتا ہے، گلشن میں کھلے پھولوں کی خوش بو میٹھی ہے اور وادی میں چھپے پھولوں کی خوش بو میٹھی ہے اور پہاڑ پر لہلہانے والے پھولوں کی خوش بو میٹھی ہے، لیکن محبت زندگی سے بہتر ہے اور ایک انسان کے دل کے مقابلے میں ایک پرندے کے دل کی کیا وقعت ہے؟''

اس نے پر پھیلائے اور ہوا میں بلند ہوگئی۔ ایک سائے کی طرح تیرتی ہوئی وہ باغ پر سے گزری اور ایک سائے کی طرح درختوں کے جھنڈ میں سے گزر گئی۔ نوجوان طالب علم ابھی تک اسی جگہ پڑا تھا، جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی اور اس کی حسین آنکھوں کے آنسو ابھی تک سوکھے نہ ہوئے تھے۔

''خوش ہو جاؤ'' بلبل نے پکار کر کہا۔

''خوش ہو جاؤں......کیا مطلب؟''

''خوش ہو جاؤ......تمھیں سرخ گلاب مل جائے گا۔''

''لیکن کیسے ملے گا؟''

''میں اسے چاندنی کی روشنی میں بیٹھ کر موسیقی سے تخلیق کروں گی اور اپنے دل کے لہو سے اس میں رنگ بھروں گی......اس کے بدلے میں، میں تم سے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اپنی محبت میں سچے رہنا، کیوں کہ محبت فلسفے سے زیادہ حکمت بھری ہے......اگرچہ فلسفہ بھی حکمت بھرا ہے اور محبت طاقت سے زیادہ قوی جذبہ ہے......اگرچہ طاقت بھی قوی ہوتی ہے......اس کے پر شعلے کی طرح کے ہیں اور اس کے جسم میں شراروں کی سی جھلک ہے......اس کے ہونٹوں میں شہد کی سی حلاوت ہے اور اس کی سانسوں میں عطر کی سی مہک ہے۔''

طالب علم نے چہرہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا اور سنتا رہا، لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بلبل اس سے کیا کہہ رہی ہے، کیوں کہ وہ صرف ان ہی چیزوں کو سمجھتا تھا، جو کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں، لیکن شاہ بلوط کا درخت سب سمجھ رہا تھا اور وہ اداس تھا، کیوں کہ اسے اس ننھی سی بلبل سے پیار ہو گیا تھا، جس نے اس کی شاخوں میں اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔

''مجھے ایک آخری گیت سنادو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''وہ کیوں؟''

''تمھارے جانے کے بعد میں خود کو بہت تنہا محسوس کروں گا۔''

چناں چہ بلبل نے اسے گیت سنایا۔ اس کی آواز یوں ابھری، جیسے چاندی کے مرتبان سے پانی بلبلے بناتا باہر ابل رہا ہو۔ جب اس کا گیت ختم ہوا، تو طالب علم اٹھا اور اپنی جیب سے ایک سادہ کاپی اور پنسل نکالی۔

''اس کے پاس انداز ہے، اس سے انکار نہیں۔'' اس نے جھنڈ سے گزر کر پرے جاتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیا اس کے پاس احساس بھی ہے؟ افسوس کہ نہیں ہے...... حقیقت میں یہ بھی زیادہ تر فن کاروں جیسی ہے ...... اس کے پاس ناز و انداز تو ہے، لیکن خلوص نہیں ہے...... یہ دوسروں کے لیے خود کو قربان نہیں کرے گی...... یہ صرف موسیقی کے بارے میں سوچتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ فن کار خود غرض ہوتے ہیں...... پھر بھی یہ بات ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس کی آواز میں چند مدھر سر ہیں...... کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان سروں کا کوئی مطلب نہیں ہے اور ان سے کوئی اچھا کام نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر لیٹ کر اپنی محبوبہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ سو گیا اور جب آسمان میں چاند چمکنے لگا، تو بلبل گلاب کے پودے کے پاس پہنچی۔ اس نے اپنا سینہ کانٹے پر رکھ دیا۔ پوری رات کانٹے پر سینہ جمائے وہ گاتی رہی۔ سرد بلوری چاند نیچے جھک آیا اور گیت سنتا رہا۔ تمام رات وہ گاتی رہی اور کانٹا آہستہ آہستہ اس کے سینے میں دھنستا رہا اور اس کا لہو رستا رہا۔ اس نے پہلے ایک لڑکے اور لڑکی کے دل میں محبت کے جنم کے گیت گائے اور پودے کی سب سے اوپر والی ٹہنی پر ایک خوب صورت پھول کھلنے لگا۔ ایک کے بعد ایک گیت پھوٹتا چلا گیا اور ایک کے بعد ایک پتی کھلتی گئی۔ پہلے اس کا رنگ زرد تھا۔ دریا کے اوپر منڈلانے والی دھند کی طرح زرد اور آنے والی صبح کے قدموں کی طرح زرد اور نقرئی تھا، صبح کی پہلی کرن کے پروں کی طرح نقرئی، چاندی کے آئینے میں دکھائی دینے والے گلاب کے عکس کی طرح، حوض کے پانی میں پڑنے والے گلاب کے عکس کی طرح، پودے کی شاخ پر کھلنے والا پھول بھی عکس کی طرح ہی تھا۔ پودے نے چلا کر بلبل سے قریب آنے کو کہا۔

''اور قریب آؤ...... ننھی بلبل!'' اس نے کہا۔

''وہ کس لیے؟''

''گلاب کا رنگ سرخ کرنے کے لیے قریب آؤ...... ورنہ گلاب کے مکمل ہونے سے پہلے سورج طلوع ہو جائے گا
۔''

چناں چہ بلبل اور نزدیک ہو گئی۔ کانٹا اس کے سینے میں اور گہرا اتر گیا۔ اس کا نغمہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا، اس لیے کہ وہ ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کی روح میں پھوٹنے والے نرم جذبوں کے گیت گا رہی تھی۔ گلاب کی پتیوں میں ہلکی ہلکی سرخی اترنے لگی۔ دولہا کے چہرے پر اس وقت آنے والی حیا کی سرخی کی طرح کی سرخی تھی، جب وہ اپنی دلہن کے ہونٹوں پر پہلا بوسہ دیتا ہے، لیکن کانٹا ابھی تک بلبل کے دل تک نہ پہنچا تھا، چناں چہ گلاب کا دل اب بھی سفید تھا، کیوں کہ صرف بلبل کے دل کا لہو ہی ایک گلاب کے دل کو سرخ کر سکتا ہے۔ پودے نے ایک دفعہ پھر چلا کر بلبل سے اور نزدیک آنے کو

کہا۔

''اور قریب آؤ...... ننھی بلبل! ورنہ گلاب کے مکمل ہونے سے پہلے سورج طلوع ہو جائے گا۔''

چناں چہ بلبل اور نزدیک ہوگئی اور کانٹے نے اس کے دل کو چھولیا۔ درد کی ایک تند لہر اس کے پورے جسم سے گزر گئی۔ اس کا درد تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا اور اس کا گیت المناک ہوتا چلا گیا، کیوں کہ وہ اس محبت کا گیت گا رہی تھی، جو موت سے مکمل ہوتی ہے، اس محبت کا گیت، جو قبر میں بھی مرتی نہیں۔ وہ انوکھا پھول سرخ ہوگیا، مشرقی افق پر کھلنے والے پھول کی طرح سرخ۔ پتیوں کا ہالہ سرخ تھا اور ان کے بیچ گلاب کا دل یاقوت کی مانند چمک رہا تھا۔ بلبل کی آواز مدہم پڑتی گئی۔ اس کے ننھے ننھے پر پھڑکنے لگے اور اس کی آنکھوں پر ایک دھندسی چھاگئی۔ اس کا گیت مدہم ہوتا گیا...... اور مدہم...... اور پھر یوں لگنے لگا، جیسے کوئی چیز اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ پھر اس کے حلق سے موسیقی کا آخری ریلا چھوٹا۔ سفید چاند نے اسے سنا اور صبح کی آمد کو بھول کر آسمان میں تھم گیا۔ سرخ گلاب نے اسے سنا اور فرطِ طرب میں سرتاپا تھرتھراتے ہوئے صبح کی سرد ہوا میں اپنی پتیاں کھول دیں۔ بازگشت اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر پہاڑیوں میں لے گئی اور چرواہوں کو نیند سے بیدار کر آئی۔ یہ دریا کی لمبی لمبی گھاس میں سے تیرتا ہوا گزرا اور وہ اس کا پیغام سمندر تک لے گئی۔

''دیکھو...... دیکھو۔'' پودے نے چیخ کر کہا۔ ''گلاب مکمل ہوگیا۔''

مگر بلبل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب بھی کیسے دیتی، وہ تو گھاس پر مردہ پڑی تھی اور کانٹا اس کے دل میں اترا ہوا تھا۔

دوپہر کو طالب علم نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا۔

''کتنی زبردست قسمت ہے۔'' وہ چلا اٹھا۔ ''یہ رہا سرخ گلاب کا پھول...... میں نے پوری زندگی میں ایسا پھول نہیں دیکھا...... کتنا خوب صورت ہے یہ...... مجھے یقین ہے کہ لاطینی زبان میں اس کے لیے کوئی لمبا سا نام ضرور ہوگا۔''

وہ نیچے جھکا اور پھول توڑ لیا۔ پھر اس نے سر پر ہیٹ جمایا اور گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے پروفیسر کے گھر کی طرف بھاگا۔ پروفیسر کی بیٹی گھر کے دروازے میں بیٹھی نلکی پر نیلا ریشم لپیٹ رہی تھی اور اس کا چھوٹا سا کتا اس کے قدموں پر سر رکھے لیٹا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ اگر میں تمھارے لیے سرخ گلاب لے آیا، تو تم میرے ساتھ رقص کروگی۔'' طالب علم نے پکار کر کہا۔ ''یہ رہا دنیا کا سب سے سرخ گلاب...... تم آج رات اسے اپنے دل کے پاس لٹکاؤ گی اور جب ہم رقص کریں گے، تو یہ تمھیں بتائے گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

یہ سن کر لڑکی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''افسوس ہے۔''

''کس بات کا؟''

''میرے لباس کے ساتھ یہ بالکل بھدا لگے گا۔''

یہ سن کر لڑکا چلا اٹھا۔

''کیا!!!؟''

''ویسے بھی چیمبر لین کے بھتیجے نے مجھے چند اصلی ہیرے بھجوائے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ہیرے پھولوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم بے حد ناشکری ہو۔'' طالب علم نے بپھر کر کہا اور پھول گلی میں پھینک دیا۔
پھول سڑک پر جا گرا اور ایک چھکڑا کھڑکھڑاتا ہوا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ لہو کے گلاب کا کچومر نکل چکا تھا۔
''ناشکری؟''
''ہاں!''
''تم بے حد بدتمیز ہو اور ویسے بھی تمھاری حیثیت کیا ہے؟ تم صرف ایک طالب علم ہو...... میرے خیال میں تمھارے جوتوں پر چیمبرلین کے بھتیجے کے جوتوں کی طرح چاندی کے بکل بھی نہیں ہوں گے۔''
وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گھر کے اندر چلی گئی۔
''محبت بھی کیسی احمقانہ چیز ہے!'' نوجوان نے چلتے ہوئے کہا۔
''اس کا فائدہ تو کچھ ہے ہی نہیں، کیوں کہ یہ کچھ ثابت نہیں کرتی اور یہ ہمیں ہر وقت ایسی باتیں بتاتی رہتی ہے، جنھیں کبھی ظہور میں نہیں آنا ہوتا اور ایسی چیزوں پر یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا...... حقیقت میں یہ بالکل غیر عملی سی چیز ہے اور آج کے دور میں عملی ہونا سب سے اہم ہے...... میں فلسفے کی طرف پلٹ جاؤں گا اور مابعد الطبیعات کا مطالعہ کروں گا۔''
چناں چہ وہ اپنے کمرے میں واپس پہنچا اور الماری سے ایک موٹی سی پرانی کتاب نکال کر مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆

غیرت مند
شہباز اکبر الفت

آج ایک طویل عرصہ کے بعد، جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے اور اس کے راستے الگ ہوئے کئی زمانے بیت گئے ہوں، وقت کی دھول اور گرد راہ نے سب کچھ دھندلا دیا ہے ماسوائے اس موہنی صورت اور بڑی بڑی آنکھوں کے، جن میں کبھی زندگی رقص کیا کرتی تھی۔
وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے میرے جیسے عام سے لڑکے کو اپنی محبت سے خاص بنا دیا، اس نے مجھے حقیقی معنوں میں ٹوٹ کر چاہا تھا اور جب ذات پات، رسم و رواج اور ظالم سماج ہماری محبت کی راہ میں حائل ہوئے تو اس نے بغاوت کا راستہ اپنانے سے بھی دریغ نہ کیا، اس نے اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں اور واپسی کے سارے رستے بند کر کے بھاگ کر میرے پاس آ گئی تھی لیکن کورٹ میرج کے لئے نکلتے وقت ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جو نہ صرف ہماری دائمی جدائی کا باعث بنا بلکہ اس کی نظروں میں، ہمیشہ کے لئے میں ایک ایسا کم ہمت، بزدل اور بے وفا انسان بھی ٹھہرا جو زمانے کے سرد و گرم میں اس کا ساتھ نہیں دے پایا، وہ اپنی جگہ سچی لیکن مجھے بھی اپنے اس فیصلے پر کوئی پشیمانی نہیں کیونکہ اچانک ہی محبت سے زیادہ غیرت میرے لئے اہم ہو گئی تھی۔
محبت کی یہ کہانی اسی دفتر سے شروع ہوئی تھی جہاں ہم اکٹھے کام کرتے تھے، ہمارے درمیان بہت کچھ مشترک تھا، ہم عمر، ہم پلہ اور گفتگو کیلئے ایک جیسے موضوعات، ہم گھنٹوں بلا تکان بولتے، اس بے نام سے تعلق کو پہلے دوستی کا نام ملا اور

پھر پتہ ہی نہ چلا کہ کب یہ دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی، ایک دوسرے کی رفاقت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا، دن تو دفتر میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے گزر جاتا اور رات فون پر باتیں کرتے، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے، محبت خالص تھی، جذبہ سچا اور نیت صاف، دونوں نے اپنے اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیا، رشتے کی بات چلی لیکن بات وہاں آ کر رک گئی جہاں پر غیرت شروع ہو جاتی ہے، یہ غیرت بھی عجیب شے ہے، لڑکا کسی لڑکی کو سبز باغ دکھائے، محبت کے جال میں پھنسائے تو وہ اس کی مردانگی کہلاتی ہے لیکن کسی لڑکی کی طرف سے اپنی پسند کا اظہار اور شادی کی خواہش پورے خاندان کیلئے غیرت کا مسئلہ بن جاتی ہے، اس معاملہ میں بھی یہی ہوا، غیرت نے پوری شدت کے ساتھ سر اٹھایا، رشتے سے انکار کے ساتھ ساتھ پابندیاں بھی لگ گئیں، میں اور میرے گھر والوں نے سارے جتن کر کے دیکھ لئے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، الٹا دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں کہ اگر میں نے اس سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، پانی سر سے گزر رہا تھا، جدائی صاف نظر آ رہی تھی اور ان حالات میں ہمارے پاس بغاوت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ہمارے پاس ایک ہی حل تھا کہ ہم اپنا قانونی اور شرعی حق استعمال کرتے ہوئے کورٹ میرج کر لیں، جس دن وہ گھر سے بھاگ کر میرے پاس آئی، اس کے گھر والوں نے اس کا کسی کزن کے ساتھ زبردستی نکاح پڑھوانے کی کوشش کی تھی، میں نے اسے تسلی دی، فوراً اپنے وکیل کو فون کیا اور ساری صورت حال بتا کر کورٹ میرج کا انتظام کرنے کی ہدایت کی اسی دوران اس کی ماں بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گئی، اس کی ماں نے ہمارے رشتے کیلئے بہت کوشش کی تھی مگر ان کا بس نہیں چلا، اس وقت مجھے وہ بہت مایوس اور تھکی تھکی سی نظر آئیں، میں نے انہیں اندر بلایا، کرسی دی اور پانی پلایا، اسی دوران انہوں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہیں، میری محبوبہ نے استفہامی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میری طرف سے اشارہ پا کر باہر چلی گئی۔

"بیٹا! تم جانتے ہونا کہ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے بیٹوں کی طرح سمجھا ہے۔" وہ گویا ہوئیں۔

"جی۔" میں نے اثبات سر ہلایا۔

اور یہ بھی کہ میں نے تم دونوں کی شادی کے لئے پوری کوشش کی تھی؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جی۔" میں نے ایک بار پھر تائید میں سر ہلایا

"لیکن بیٹا، اب پورے خاندان میں کوئی اس رشتے کے لیے راضی نہیں تو بتاؤ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟" بے بسی ان کے لہجے سے نمایاں تھی

"آنٹی..." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا، وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھیں

"بیٹا، میری چھ بیٹیاں ہیں اور یہ سب سے بڑی، میں نے اپنی بیٹیوں کو بھی بیٹوں کی طرح پالا، غربت کے باوجود کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی، کپڑے، جوتے، تعلیم ہر خواہش پوری کی لیکن آج اس کا باپ اس کی وجہ سے میری تربیت اور کردار پر انگلیاں اٹھا رہا ہے، آج خاندان والے باتیں کر رہے ہیں کہ بڑی بیٹی خراب نکلی ہے تو چھوٹی کون سا اچھی ہوں گی؟ ان کے رشتے کہاں سے آئیں گے؟" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"ہم تو عزت کے ساتھ ہی رشتہ لے کر آئے تھے آنٹی لیکن آپ لوگوں نے ہی انکار کیا، بلاوجہ عزت اور غیرت کا مسئلہ بنا لیا، مجھ میں کوئی خامی دیکھی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔" میرے دل کی بات ہونٹوں پر آ ہی گئی۔

"بیٹا، تم میں کوئی خامی نہیں، تم سچے، تمہاری محبت سچی اور جو تم کرنے جا رہے وہ تمہارا حق بھی ہے لیکن آج اگر میری بیٹی نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی تو جانتے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف

دیکھا۔

''انجام سے کون ڈرتا ہے آنٹی اور میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں کہ اپنی اور اپنی بیوی کی حفاظت نہ کرسکوں'' میرے لہجے میں نہ چاہنے کے باوجود سختی در آئی

''تمہاری بات نہیں کر رہی بیٹا، اپنی بات کر رہی ہوں، اس کی یہ بغاوت میرے لئے زندگی بھر کا روگ بن جائے گی، میری تربیت پر سوالیہ نشان اور میرے کردار پر کلنک کا ٹیکہ بن جائے گی، اس کا باپ ساری زندگی میرے منہ پر تھوکے گا کہ میں بری عورت تھی جو اپنی بیٹی کی اچھی پرورش نہ کرسکی اور میرے کردار کی خامی میری بیٹی میں نکل آئی۔'' اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھیں

ماحول یکدم ہی افسردہ ہوگیا، ان کے آنسو دیکھ کر میرا دل بھی پسیجا، سچ تو یہ ہے کہ غلطی میری بھی نہیں تھی، مجھے یہ رستہ انہی لوگوں نے دکھایا تھا، انہی کی ہٹ دھرمی نے یہ انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کیا تھا ورنہ میں تو خود اپنی محبت کو بھگا کر لانے کی بجائے پورے اہتمام کے ساتھ بیاہ کر لانے کا خواہش مند تھا، اس سے پہلے میں کچھ کہتا، اچانک ہی انہوں نے غیر متوقع طور جھک کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور رندھے ہوئے لہجے میں وہ آخری جملہ کہا جس کے بعد ساری بات ہی ختم ہوگئی تھی

" کیا تمہاری محبت ایک ماں کی مجبوری سے بھی زیادہ ضروری ہے؟"

تڑپ کر پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے میں نے اس مجبور ماں کی نم آنکھوں اور جھریوں بھرے چہرے کو غور سے دیکھا، مجھے اچانک ہی اس میں اپنی ماں کا عکس نظر آیا تھا اور اسی لمحہ میرے دل میں یہ بھی آیا کہ میرا بھی تو ایک گھر، ایک خاندان ہے جو اسی سماج کا حصہ ہے، میرا باپ بھی تو سخت گیر، ماں ہر وقت اس سے دبی دبی رہتی ہے اور ہاں میرے گھر میں بھی تو ایک لڑکی موجود ہے، میری بہن کی صورت میں، اگر مجھے محبت کا حق ہے تو میری بہن کو کیوں نہیں؟ اگر میں یا میری محبوبہ بغاوت کرسکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں؟ اور کیا میں یہ برداشت کرسکوں گا کہ میری ماں کو بھی اس طرح کسی کے پاؤں پکڑنے پڑیں؟

فیصلہ فوری طور پر ماں کے حق میں ہوا کیونکہ اس کے بعد مزید کچھ سوچنا میری غیرت کو گوارہ ہی نہیں تھا۔

......☆☆......

سناٹا

عنبرین اختر

جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا. تو وہ پورے گاؤں کی نظروں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی. ہر نگاہ اس کی طرف اٹھتی اور یہی سوال کرتی۔

''لبنیٰ.. تم اپنے شوہر کی دوسری شادی کردیتیں تو آج ہم سب کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا. آخر دوسری شادی میں حرج ہی کیا ہے. وہ تم سے آخری سانس تک پوچھتا رہا. مگر تو کم بخت ہاں بھی نہ کرسکی شادی کیا خاک کرواتی اب دیکھ اپنے شوہر کا مرا ہوا منہ اور روا اس کی چارپائی کے ساتھ لگ کے۔

آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی جب اس کے بالوں میں چاندی نے کثرت سے ڈیرہ جما لیا تھا. جب بچے

بڑے ہو گئے تھے۔ اور اپنا خیال خود رکھ سکتے تھے۔

محلے والوں کے یہ سوال آج بھی اس کے کانوں اور دل میں تیر کی طرح چبھتے۔ وہ تو شوہر کے مرنے والے دن بھی خاموش تھی اور لوگوں کی شیر نظروں کا مقابلہ کرتی رہی اور آج بھی ان سب سوالوں کے جواب اپنے دل میں لیے خاموش کھلے آسمان کو دیکھتی رہتی۔ آسمان کی وسعت اور اس کی گہرائی کا اندازہ لگاتی رہتی۔

آسمان جو اس کے دل کی طرح وسیع تھا۔ جو کبھی بادل برساتا ہے۔ تو کبھی سنہری دھوپ سے دنیا کو اجالا بخشتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی کبھی پانی برساتیں۔ تو کبھی اپنے معصوم ہونٹ ہلا کر بات کر لیتیں لیکن اس کے اندر کا طوفان کب باہر آئے گا اس سوال کا جواب تو شاید اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ یا پھر وہ کسی اور دن کا انتظار کر رہی تھی۔ حیرت و مسرت کے یہ نپے تلے احساسات آنسوؤں کی موہوم سی نمی بن کر اس کی آنکھوں میں تیرتے رہتے اور وہ پرانی یادوں کو دل میں دہرانے لگتی۔

میرا شوہر الیاس بیٹے کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کب منع کیا تھا اسے دوسری شادی کرنے سے۔ وہ جس عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر والے اس رشتے پر راضی نہ تھے۔ میں نے تو اسے پہلے دن ہی دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

پھر ایک رات نا جانے الیاس کو کیا ہوا۔ پاگلوں کی طرح پورے گھر میں دوڑنے لگا اس پر کسی آسیب کا اثر ہو گیا تھا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ اور وہ منہ کے بل کسی پتھر پر جا گرا۔ ماتھے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے اپنے دوپٹے کو پلو سے پھاڑ کر الیاس کے خون آلود ماتھے پر باندھنا چاہا۔ لیکن پہلے ہی اس کی آنکھیں آسمان کو دیکھنے لگیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا۔ میرا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ اور لوگ اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ میں کس کس کی بات کا جواب دیتی۔ میں نے چپ سادھ لی۔ اور سب اللہ پر چھوڑ دیا۔

ایک دن اس کی بڑی بیٹی عالیہ ماں سے سوال کرنے لگی

''ماں تو اتنی خاموش کیوں بیٹھی ہے؟ ہم اسکول سے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ تو ہمیں کھانے کو نہیں پوچھتی۔ دیکھ رابعہ کا کل سے پاؤں جلا پڑا ہے۔ وہ ہائے ہائے کر رہی ہے لیکن تو کیسی ماں ہے۔ تجھے اپنے بچوں کی چیخ و پکار بھی سنائی نہیں دیتی۔ کیا تیرے سینے میں دل کی جگہ کسی نے پتھر رکھا ہے؟''

اس نے ایک لمحے کو اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اسے سینے سے لگا لیا۔ اور پیار کرنے لگی۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو عالیہ کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اس دن کے بعد اب وہ بیٹیوں کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ ان کو وقت پر کھانا دیتی۔ اسکول کے لیے لنچ بکس تیار کرتی۔ لیکن یہ سب کام وہ خاموشی سے کرتی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ بجلی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ باہر صحن میں پلنگ بچھائے بیٹھی تھی۔ اس کے صحن میں نیم، پیپل اور شہتوت کے اونچے گھنے درخت چھتر چھاؤں کیے کھڑے رہتے۔ اور اس زمین کے ساتھ ساتھ ایک کھلے وسیع آسمان کے کنارے آن ملتے تھے اور یہ سب کچھ مل کر اتنا لامحدود اور لا انتہا ہوتا کہ کہیں بھی کسی بھی چیز کی کوئی حد نظر نہ آتی۔ ایسے موقع پر وہ خود کو بھی لامحدود پاتی۔ پھر درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی شرارتیں اور خوش گپیاں سن کر دل بہلا لیتی۔

ایک شام وہ اکیلی صحن میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ اس کی سہیلی ممتاز اس کے پاس آئی۔ اس کے بکھرے وجود اور چہرے پر وقت سے پہلے پڑنے والی جھریاں دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔

''ہائے لبنیٰ!! تجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں تو تجھے پہچان ہی نہیں پائی۔ حالانکہ دس پندرہ دن پہلے میں تیرے پاس آئی تھی تو

تو اچھی بھلی تھی۔ اب تیرے بدن کو کیا ہو گیا ہے"۔
وہ ممتاز کی بات سن کر جیسے سکتے میں آ گئی۔ بے خیالی میں اپنے ہاتھوں اور چہرے کو ٹٹولنے لگی۔
"میں ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا۔ دیکھ میں اپنے بچوں کے لیے کھانا پکانے لگی ہوں۔ بچوں نے میرے ضمیر کو جھنجوڑ ڈالا ہے۔ میں اب ان کے ہر دکھ سکھ کا خیال رکھتی ہوں۔"
"پر تیرا خیال کون رکھے گا۔ مجھے تو ساٹھ سال کی اماں دکھائی دے رہی ہے۔" ممتاز اس کے پاس اپنی ٹانگوں کا کراس بناتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اور پیار سے بولنے لگی۔
"دیکھ لبنیٰ!!!! اتنی چپ اچھی نہیں ہوتی۔ انسان کو اندر سے مار دیتی ہے۔ جب انسان اندر سے مر جاتا ہے۔ تو وہ دنیا والوں کے لیے ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح ہوتا ہے۔ تو اپنے غم کب تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھے گی۔ اگل دے سب کچھ نہیں تو بیمار پڑ جائے گی۔ پھر تیری بیٹیوں کا خیال کون رکھے گا۔ تو اپنے اندر ہمت پیدا کر۔ تجھے پتہ ہے آج بھی لوگ تیرے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ کہ بزدل عورت شوہر کی دوسری شادی بھی نہیں کرا سکی۔ اگر تو لوگوں کی باتوں کا جواب نہیں دے گی۔ تو تیرے ساتھ تیری بیٹیوں کا بھی یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ کل کو تو نے بیٹیوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ سدا ایسے وقت نہیں گزرے گا میری بھولی بہن۔ غلامی کے اندھیروں سے نکل کر باہر دیکھ امید کا سورج تیرا منتظر ہے"۔
اس نے اپنے زنگ آلود لب جو برسوں سے بند تھے۔ جو کھلنے سے انکار کرتے رہتے تھے۔ اس نے اپنے پورے اعصابی نظام کو اکٹھا کیا۔ ماتھے پر شکنوں کی بجائے رعب نے ڈیرے جمانے شروع کیے۔ آدھ کھلی آنکھوں میں روشنی اور امید نو کے دیے جلنے لگے۔ وہ ہر پرانی یاد کو ذہن سے کھرچ رہی تھی۔ وہ چپ کے پنجوں سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پسینے کے قطرے اس کے وجود کو تر کر رہے تھے۔
ایک دن عالیہ اور رابعہ اسکول سے گھر آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے تین چار لڑکے آوازیں کس رہے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کمزور اور مظلوم عورت کی بیٹیاں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ ان لوگوں نے گلی کے نکڑ پر کھڑے اور لڑکوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ وہ لڑکے سیٹیاں بجاتے گانے گاتے جب لبنیٰ کے گھر کے قریب پہنچے۔ تو لبنیٰ ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکلی۔ جلدی سے بیٹیوں کو اندر کیا۔ غصے سے ان لڑکوں کے گریبان باری باری پکڑے اور دھکے دے کر پیچھے گرا دیا۔ وہ لڑکے اٹھنے ہی لگے تھے کہ لبنیٰ نے ان کو بالوں سے پکڑ کر ایک بار پھر زمین پر گرا دیا۔ ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔
ظالمو!! تم لوگ کیا سمجھتے ہو۔ کیا میرے منہ میں زبان نہیں۔ تم سب نے آج تک میری چپ اور بے چارگی دیکھی ہے۔ لیکن اب تم سب میرا غصہ اور رعب دیکھو گے۔ جس نے میری بیٹیوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نوچ کر قانچوں کو کھلا دوں گی۔ بھاگو یہاں سے اور اب اپنی منحوس صورتیں مت دکھانا مجھے۔"
لڑکے تو دم دبا کر بھاگ نکلے۔ لیکن گاؤں والے لبنیٰ کے اس نئے روپ پر ہاتھ ملتے رہ گئے۔
گاؤں کا بدمعاش شیدا کافی دنوں سے لبنیٰ سے آنکھ ملانے کی ہمت کر رہا تھا۔ وہ لبنیٰ سے شادی کرنے کی سوچ رہا تھا۔
ایک دن لبنیٰ ہمسائی کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔ کہ اسے راستے میں شیدا مل گیا۔
"کیا بات ہے مہارانی؟ آج کل بڑے غصے میں رہتی ہو۔ کیا کوئی سونے کا چراغ مل گیا ہے؟ جو اتنی اتراتی پھرتی ہو۔"
تنومند شیدے کے چہرے پر بڑی اور گھنی مونچھوں کے عقب سے ایک زہریلی مسکان لبنیٰ کے چہرے کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس کے نتھنے لبنیٰ کو دیکھ کر ایک پیاسے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔
"تجھے کتنی دفعہ کہا ہے۔ میرے رستے میں نہ آیا کر۔ تجھے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

لبنی کی بات سن کر شیدا ایک دم زرد رنگت میں ڈوب گیا. ایک لمحے کو اس نے تامل کیا. پھر بولا.
"تو بس میری بات کا سیدھا جواب دے تو مجھے کیا ضرورت ہے. تیرے پیچھے یوں گرمی میں سڑنے کی".
لبنی نے غصے سے شیدے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی.
"تو اچھی طرح جانتا ہے. میری بیٹیاں اب جوان ہو رہی ہیں. ان کی شادیاں کروں یا تیری غلیظ خواہش پوری کروں".
''ارے پگلی حویلی میں تجھے رانی بنا کر رکھوں گا. تجھے ایسے تھوڑی لے جاوں گا. پورے گاوں میں ہماری شادی کے چرچے ہوں گے. صرف تیری رضامندی چاہیے.'' اس نے اپنے گرد آلود لبوں پر زبان پھرتے ہوئے کہا.
''میں تھوکتی ہوں تجھ پر اور تیری حویلی پر. آج کے بعد میرا راستہ روکا تو تیرا بھی وہی حال کروں گی جو اس دن لڑکوں کا کیا تھا. چلا جا یہاں سے اور آج کے بعد مجھے اپنی سانپ جیسی شکل نہ دکھانا.''
لبنی خونخوار نظروں سے کہتی اپنے گھر چلی گئی. لیکن شیدے کے دل پر لبنی کی باتیں بجلی برسانے لگیں.
اس نے اپنی بے عزتی کا منصوبہ بنایا.
گاوں میں زیادہ تر لوگ گرمی میں باہر صحن میں سوتے تھے.
آدھی رات کا وقت تھا. لبنی ابھی تک جاگ رہی تھی. وہ اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی. جب سے بیٹیاں بڑی ہوئی تھیں. اس کی آنکھوں سے جیسے نیند روٹھ گئی تھی. ذرا سا کھٹکا ہوتا اور وہ تکیے کے نیچے رکھا چھرا نکال کر فوراً کھڑی ہو کر کہتی.
''کون ہے جو میرے گھر کی دہلیز پار کرنے آیا ہے.''
آج کل ممتاز لبنی کو اس کی بیٹی عالیہ کے لیے کچھ اچھے رشتے دیکھا رہی تھی. وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں الجھی ہوئی تھی. کہ کوئی صحن کی کچی دیوار پھلانگ کر اندر گھس آیا.
''کون ہے......کون ہے.''
لبنی تھی تو عورت ہی. اس کی آواز میں رعب اور سنجیدگی تھی. اپنی جرات اور بہادری کو لبنی نے اپنے نازک جسم میں جمع کیا. فوراً چھرا نکال لیا. اور سینہ تان کر اس شخص کے سامنے کھڑی ہو گئی.
اندھیرے میں وہ دیکھ ہی نہ سکی کہ اس کی بیٹیاں سوئی ہوئی ہیں یا جاگ رہی ہیں.
چہرے کو کپڑے سے چھپائے وہ شخص اور قریب آیا. اور لبنی کا ہاتھ پکڑنے لگا. چھرا لبنی کے ہاتھ سے چھوٹا. اور زمین پر پنچ گرا.
چھوڑ میرا ہاتھ آوارہ بدمعاش انسان میں تجھے پہچان گئی ہوں لیکن وہ نقاب پوش شخص خاموش غلیظ نظروں سے لبنی کے جسم کو تکتا رہا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے چھرا اس شخص کی کمر میں گھونپ دیا۔ وہ شخص زمین پر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا.
"تو غم نہ کر ماں۔ آج میں نے تیری چپ اور تیری محرومیوں کا بدلہ لے لیا ہے. میں جانتی تھی تو کس وجہ سے اتنی چپ رہتی ہے. تجھے یہ بندہ تنگ کرتا تھا ناں. دیکھ آج تیرے پاوں میں پڑا تڑپ رہا ہے.
ماں تو اب پریشان نہ ہوا کر. اب ہمارے اچھے دن آئیں گے. ہم بھی دوسروں کی طرح سر اٹھا کر جی سکیں گے".
''ننھی رابعہ خون آلود ہاتھوں میں چھرا پکڑے معصومیت سے ماں کو کہہ رہی تھی.''
ایک معصوم آہ اس رات کے سناٹے میں گونجی. اور زمین سے آسمان کی طرف لپکنے لگی۔

......☆☆......

اللہ دتہ

صائمہ قریشی

سائیں اللہ دتہ اپنے تخت پر بڑی شان سے براجمان تھے، محفل سجی تھی، مریدوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، عورتیں دعائیں کرانے کے لیے لائن میں لگی تھیں۔

"سائیں دعا چاہیے۔" سکینہ انکھوں سے بہتے آنسوؤں کو چادر میں جذب کر کے بولی۔

"سائیں! ساس طعنے دیتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے، پھر سے آس لگی ہے تو سائیں سوہنے رب تے اپنے حبیب کے صدقے دعا کریں سائیں۔" سکینہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اب سائیں کے گھٹنوں کو دبانے لگی

"یا رحیم، یا کریم" تسبیح پرورد کرتے سائیں نے نیم وا انکھوں سے کندھے دباتے اپنے مرید کو دیکھا۔

"کل آ جانا سائیں تعویز دیں گے۔" جانشین مرید سائیں کے اشاروں سے بخوبی واقف تھا۔

ادھ کھلی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر اس کو بتایا تھا۔ تو اس نے لاچاری سے سائیں کو دیکھا اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک اور عورت آگے بڑھی اور اپنا دکھڑا رونے لگی۔

☆☆

"سائیں میں سخت پریشان ہوں، ساس نے آج بھی کہا ہے کہ بیٹا نہ ہوا تو میرے شوہر کی دوسری شادی کرا دیں گیں" سکینہ زار و قطار روتے ہوئے بولی تو اپنی مخصوص حالت میں بیٹھے سائیں نے انکھوں کو کھول کر اسے دیکھا اور پھر اپنے جانشین کو دیکھا تو اس نے تین چھوٹے چھوٹے کاغذ کے ٹکڑے سکینہ کو دیے۔

"یہ تعویز تین دن تک دھو کر پیو گی تو دلی مراد پوری ہو گی اور ایک عمل بھی کرنا پڑے گا، چلہ کاٹنا پڑے گا" خدمت گزار مرید نے کہا۔

"ہاں سائیں ٹھیک ہے چلہ کاٹ لیں، سائیں استخارہ ہو سکتا ہے کیا؟؟" سکینہ کو امید کی کرن نظر آئی۔

"چلے کے لیے کچھ چیزیں چاہیے ہوں گی۔" مرید نے کہا تو سکینہ نے ناسمجھی کی سی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تم پر تعویز کرائے گے ہیں، سائیں کے حساب میں آیا ہے۔" مرید کی بات پر سکینہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"تو کیا کرنا ہو گا؟" سکینہ گھگیائی آواز میں پوچھنے لگی۔

"ایک عمل کرنا پڑے گا اس کا سامان لانا ہو گا اور سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اب کے سائیں خود بولے

"ٹھیک ہے سائیں عمل کب شروع کرنا ہے؟"

"اندازاً پچاس ہزار کا خرچہ ہو گا۔" سائیں اللہ دتہ پھر بولے۔

"رحم سائیں۔ میرا مرد مزدور آدمی ہے سائیں اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی سائیں۔" سکینہ ہاتھ جوڑے، آنسو بہاتے بولی۔

"تم کتنے دے سکتی ہو؟" خدمت گزار مرید نے پوچھا۔

"سائیں ہماری اوقات کا تو آپ کو پتہ ہے ناں اور سائیں میں چھپ کر یہاں آتی ہوں ساس کو پتہ چل گیا سائیں تو۔۔ سائیں آپ تو سب جانتے ہیں ناں۔" سکینہ ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی تھی۔

"تم جتنے کا انتظام کرسکتی ہو کردو۔ سائیں چلہ کاٹ لیں گے باقی بعد میں دے دینا۔"
اب سائیں خاموشی سے اپنی تسبیح رولے جا رہے تھے۔
"میں صرف بیس ہزار دے سکتی ہوں۔" سکینہ بولی
"ٹھیک ہے جتنے بھی آسانی سے دے سکتی ہو دے دینا تا کہ سائیں چلہ شروع کر سکیں۔"
"مجھے تین چار دن کا وقت دیں سائیں میں دے دوں گی" سکینہ اب سوچ رہی تھی کہ اپنی بالیاں بیچ دے۔
"پھر تو میری مراد پوری ہوگی ناں سائیں" سکینہ منت بھرے لہجے میں اپنی مراد کے پورا ہونے کی تصدیق چاہ رہی تھی
"سائیں کے چلے میں بڑی شفا ہے۔قسمت میں لکھے کو بدلوا لیتے ہیں۔" سائیں کا کندھا دباتے مرید نے سکینہ سے کہا اور پھر ایک رجسٹر (جو سائیں اللہ دتہ کی گدی کی ساتھ رکھی الماری کے اوپر رکھا تھا) پر کچھ لکھ دیا۔
"اب تم جاؤ سائیں کے چلے کا وقت ہو رہا ہے" سائیں اسی حالت میں پھر محو ہو گئے مرید نے تخلیہ کا اعلان کر دیا تو سکینہ اٹھ کر چلی گئی۔



(پندرہ دن بعد)
پھر وہی ہجوم،
پھر وہی فریادیں،
پھر وہی عورتوں کے مسائل،
پھر وہی مرغ مسلم کی خوشبوئیں،
وہی لنگر خانہ،
پھر وہی آہ و بکا،
پھر وہی چلے،
وہی تعویز،
وہی اشارے،
سکینہ پھر حاضر تھی۔اسی حالت بے بسی میں غرق۔انہی آنسوؤں کو بار بار بڑی سی چادر میں جذب کرتی سکینہ سائیں کے پاس سے ہجوم کے کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ سائیں کا بیان جاری تھا، مریدوں کا جوش و جذبہ بھی عروج پر تھا، سنت رسول کی پیروی کی تاکید کی جا رہی تھی، اللہ تعالیٰ کی کرامات کے قصے سنائے جا رہے تھے۔
سائیں اللہ دتہ کے اللہ پاک سے تعلقات کی سچائی بیان کی جا رہی تھی۔تعلقات کی گہرائی کو بیان کیا جا رہا تھا۔
اب عورتیں، بچے، مرد سائیں اللہ دتہ سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ اپنی فریادیں ان کو بتا رہے تھے، ان کی خدمت میں نذرانے پیش کر رہے تھے۔
انڈیا کے گانوں کی دھن پر نعتوں پر جھوم رہے تھے، بہت سے مرید وجد میں مبتلا تھے۔
وہ ایک کونے میں بیٹھی عقیدت سے سر جھکائے درود شریف پڑھ رہی تھی اور سائیں کے نظر کرم کی بھی منتظر تھی۔

"اب سائیں کے آرام کا وقت ہے، باقی فریادیں شام کو سنی جائیں گی" سائیں اللہ دتہ کے جانشین نے اعلان کیا۔
"سائیں۔" وہ انتظار میں تھی کے سائیں کے تھک جانے کا اعلان کر دیا گیا، سکینہ بلبلا اٹھی اور بے اختیار ان کو پکارا۔
"سائیں میری فریاد۔" وہ گھگیائی آواز میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔
"سائیں کے آرام کا وقت ہے پھر آنا"
اسی خاص ادمی نے قدرے ناگواری سے کہا
"سائیں پھر آنا مشکل ہوگا۔" وہ ہاتھ جوڑے سائیں پر نظریں گاڑے اپنی فریاد سنے جانے کی التجا کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کے ساتھ تلخ کلامی کرتا سائیں نے ہاتھ اٹھا کر اس کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا اور سکینہ کی طرف متوجہ ہوئے
"تم نے تو دوسرے دن آنا تھا اتنے دن لگا دیے۔" سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے اس خاص آدمی کو خاموش رہنے کا کہہ کر سکینہ سے مخاطب ہوئے۔
"سائیں اتنی رقم جمع کرنا مشکل تھا سائیں۔" وہ چادر کے اندر سے ایک خاکی لفافہ سائیں کی طرف بڑھا کر بولی جسے سائیں کے خاص ادمی نے نہایت احترام سے تھام کر الماری کھول کر اس میں رکھ دیا۔
"سائیں بہت امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں، سائیں کوئی معجزہ کر دیں، میں دوسری عورت برداشت نہیں کر سکوں گی سائیں اور تین تین بیٹیوں کو لے کر کہاں در در بھٹکوں گی۔" سکینہ ہاتھ جوڑے زارو قطار روتے سائیں اللہ دتہ کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی۔
"فکر نہ کرو، سائیں بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں اللہ سے ہر وقت رابطے میں رہتے ہیں بڑے خاص بندے ہیں اس کے۔ تمہاری مراد تو بہت معمولی سی ہے ضرور پوری ہوگی۔" سائیں جو آرام کی غرض سے محفل برخاست کر رہے تھے ایک بار پھر تسبیح رولنے لگے۔ ان کی بند انکھوں کو دیکھ کر ان کے خاص آدمی نے سکینہ سے کہا تھا تو یکدم ہی اس نے آنسو پونچھ لیے۔ چہرے پر جہاں کچھ دیر پہلے ناامیدی تھی اب آس و امید کی چھاپ نہایت واضع تھی۔
"لیکن ایک بات یاد رکھنا سائیں کی وہی دعا آگے جاتی ہے جس کا چلہ مکمل ہو۔"
"سائیں رحم کرنا۔ سائیں آپ تو سب پوشیدہ باتوں کو جانتے ہیں ناں، سائیں بیٹا ہوا تو ساری عمر آپ کے در کی جوتیاں سیدھی کرے گا سائیں، میرے حق میں فیصلہ کریں۔"
سکینہ ایک بار پھر ایک خوف میں مبتلا ہونے لگی تھی۔
"بہتر ہوگا۔ بہتر ہوگا" سائیں بولے اور وہ اٹھ گئی

☆☆

"سائیں میرا بیٹا اپنی دادی کے بہت پیچھے پیچھے پھرتا ہے، سائیں کوئی حل بتائیں، ہر وقت دادی پوتا ساتھ رہنے لگے ہیں اور تو اور سائیں اس مکار عورت نے بیٹے کو بھی قابو کر رکھا ہے نجانے کیا گھول کر پلایا ہے ہر دم ماں کی ہی چاکری کرتا رہتا ہے" اس کے جاتے ہی ایک اور عورت آگے بڑھی اور اپنی ساس کا دکھڑا رونے لگی
"یہ تعویز لے اور میٹھے میں ڈال کر ساس کو پلا دینا، اور یہ والا اپنے خاوند کے سرہانے میں دبا دینا" سائیں اللہ دتہ

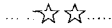
کے چیلے نے دو تعویز اس کی طرف بڑھا کر کہا تو اس نے بے فٹافٹ ہاتھ بڑا کر لے لیے۔
"سائیں یہ چھوٹا سا تحفہ "اگلے پل اس عورت نے اپنی کلائیوں میں پہنی سونے کی چوڑیوں میں سے دو اتار کر سائیں کی خدمت میں پیش کر دیں جن کو دل و جان سے قبول کیا گیا۔
"باقی فریادیں عصر کی نماز کے بعد سنی جائیں گی۔ "اس کو تعویذ دے کر محفل برخاست کر دی گئی اور سائیں اللہ دتہ اٹھ کھڑے ہوئے تو ایک مرید برق رفتاری سے آگے بڑھا اور سائیں کے پیر زمین پر رکھنے سے پہلے چپل ان کے قدموں کے نیچے رکھ دیے سائیں نے اس کے پیٹ تھپتھپائی اور چلے گے۔
پھر سائیں اللہ دتہ کے دربار میں دعاؤں اور فریادوں کا سلسلہ جاری و ساری رہا، عورتوں کا ہجوم بڑھتا رہا اور قبولیت کی گھڑیوں کی آس دلائی جانے لگی، عقیدت مند مرید سائیں اللہ دتہ کی خدمت میں دن رات حاضر رہتے، وقت گزر رہا تھا۔

......☆☆......

(سات ماہ بعد)
"سائیں غضب ہو گیا، سائیں اپ نے کہا تھا بیٹا ہو گا" سکینہ تواتر سے روتے ہوئے بولی
"نہ مائی سائیں پر الزام لگا کر گناہگار نہ ہونا۔ سائیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔"
سائیں کے کندھے دباتے ایک چیلے نے تلخی سے کہا
"یا رحیم!" سائیں نے موٹے موٹے دانوں والی تسبیح کو رولتے ہوئے انکھوں کو کھولا اور سکینہ کو دیکھا" غصہ نہ کر، اس کو رجسٹر دکھا دے" جانشیں چیلے نے حکم کی تعمیل کی" سکینہ طاہر (بیٹی)" وہ رجسٹر لے آیا جس پر بہت پہلے لکھا جا چکا تھا۔
"مائی باپ سائیں، خطا معاف، غلطی ہو گئی، میں نے غلط سمجھا تھا سائیں" سکینہ رجسٹر کو دیکھ کر گھبرائی، سائیں کی نافرمانی پر ان کی ناراضی سے ڈرنے لگی تھی، تھر تھر کانپنے لگی۔
"تمہیں کوئی خواب نہیں آیا تھا کیا؟" ایک عجیب سا سوال کیا گیا۔
"نہیں مجھے کوئی خواب نہیں آیا" وہ تواتر سے بہتے آنسو کو صاف کر کے بولی۔
"بیٹا ہو گا تم یہ سننا چاہتی تھی اس لیے یہی سمجھی ہو ورنہ سائیں کو اشارہ کیا تھا کہ تمہارے ہاں اس دفعہ بھی بیٹی کی ولادت ہو گی، تو سائیں نے چلہ کاٹا تھا، تمہیں خواب میں اشارہ دیا تھا اور تمہیں سائیں کے آستانے پر حاضری کا کہا تھا، لیکن تم آئی ہی نہیں" جانشین مرید نے رجسٹر بند کرتے ہوئے کہا
سکینہ انتہائی مایوسی سے وہاں سے اٹھی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو اپنی چادر میں جذب کیا تھا۔
"سائیں خواب میں اپنا جواب دیتے ہیں، مائی کیا تمہیں واقعی کوئی خواب نہیں آیا تھا؟؟" سوال پر اس کے قدم رکھے تھے۔
"سائیں مجھے خواب میں کوئی اشارہ نہیں آیا تھا" سکینہ ہاتھ جوڑے مڑی تھی" کیا کوئی خواب بھی نہیں آیا؟" پھر پوچھا گیا
"سائیں ایک بار دیکھا تھا کہ خواب میں کہ میں ایک تتلی پکڑ رہی ہوں" سکینہ نے بھرائی آواز میں کہا۔

"بیٹیاں تتلیاں ہی تو ہوتی ہیں" سائیں اللہ دتہ نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا "تمہارے حواسوں پر بیٹا سوار تھا ورنہ اس سے زیادہ کیا اشارہ ہوسکتا ہے؟؟"

جاں نشین مرید نے پھر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی اور باہر نکل گئی



اگلی نشست:

ایک بار پھر عورتوں کا ہجوم، ایک بار پھر دعاؤں کی قبولیت پر نذرانے پیش کرتے لوگ، بے مراد عورتوں کو تسلی دیتے سائیں اللہ دتہ کی کوشش، وجد میں مبتلا لاوارث لڑکوں کا جوش، لنگر کی دیکھ بھال کا انتظام سنبھالتے نوجوان، غریبوں میں کھانا تقسیم کرتے لوگ، سب انتظامات اسی تواتر سے جاری تھے

"مائی باپ سائیں پر لاکھوں جانیں قربان، سائیں کا کہا سچ ہوا بیٹا ہوا سائیں یہ نذرانہ قبول کریں" سائیں اللہ دتہ ابھی کچھ دیر ہوئی اپنی گدی پر آکر بیٹھے تھے کے رشیدہ آ گئی بے انتہا خوش، بے حد پر جوش اور ایک چھوٹا سا بیگ سائیں کی طرف بڑھایا،

"سائیں اپ کی کوششوں نے آج مجھے ملکہ بنا دیا، سائیں بیٹے کی پیدائش کے بعد ساس کا رویہ ہی بدل گیا۔ سائیں کی آن بان شان سلامت رہے، سائیں میں نے لنگر میں دیگیں دی ہیں، یہ چھوٹا سا نذرانہ اپ کی خدمت میں" رشیدہ سر جھکائے انتہائی عاجزی سے ان سے مخاطب تھی

"حق ہو۔" سائیں نے پھر کہا اور اسی چیلے نے آگے بڑھ کر پیسوں کا بیگ پکڑ لیا اور اس مخصوص الماری میں رکھ دیا، اچانک اس نے حساب کتاب والا رجسٹر دیکھا۔

"رشیدہ اکبر (بیٹی)" ان چند لفظوں نے اسے بھی چونکا دیا

"سائیں یہ کیا؟" وہ الجھا ہوا تھا رشیدہ کے جاتے ہی اور باقی عورتوں کی فریادیں سننے کے بعد اس نے پوچھا تو سائیں اللہ دتہ نے مسکرا کر اسے دیکھا

نشست برخاست ہو چکی تھی، سائیں تھک گے تو اب ارام فرمانے لگے تھے

"بزنس کا پہلا اصول ہے کہ گاہک کی دکھتی رگ کی پہچان ہونی چاہیے اور یہ علم ہونا نہایت ضروری ہے کے ہمارا مال کس طبقے کے لیے ہوگا۔ کون کتنی موٹی اسامی ہے

ایک بزنس مین کو اس بات کی خبر ہونی چاہیے ہمارا دھندا ایسا ہے کہ ہمیں دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کو قابو کرنا ہے اور ہم نے "عورت" کا انتخاب کیا ہے" سائیں اللہ دتہ کی آنکھوں کی چمک واضح کر رہی تھی کے وہ کتنا لطف اندوز ہوتا ہے

" پیری مریدی کی کامیابی کا راز ان عورتوں کی جہالت میں ہے" سائیں کا قہقہہ اپنے اندر بے تحاشہ خباثت چھپائے ہوئے بلند ہوا تھا

"عورت کے دل میں ذرا سا شک ڈال دو ان کو کسی دشمن کا اشارہ دے دو، کالے جادو کی طرف توجہ دلا دو پھر تمہاری کامیابی کسی طرح بھی ناکامی میں نہیں ڈھل سکتی"

سائیں اللہ دتہ اپنے حجرے میں اپنے خاص چیلوں سے مخاطب تھا"

دیکھاناں تم نے کیسے یہ عورتیں مجھے اپنا سب کچھ مانتی ہیں، کیسے اپنے مردوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں حاضری لگاتی ہیں، میرے ایک اشارے کی دیر ہے اپنی مراد پوری ہونے کے عوض یہ سب کچھ نثار کردیں، وہ تو میں ہی ذرا "بورنگ" انسان ہوں کے مجھے عورت میں دلچسپی نہیں، ہم تو بس ایک لطف کے شیدائی ہیں" سائیں کی آنکھوں میں شیطانیت در آئی تھی جو ایک قہقہے میں بدل گئی

"سائیں کی جے ہو" چیلوں نے نعرہ لگایا تو سائیں اللہ دتہ ہنسنے لگے

"بیٹا کہو اور بیٹی لکھو، بیٹا ہو گیا تو چیک کون کرے گا؟ اور بیٹی ہوئی تو لکھا ہوا بھی یہی ہو گا، وہ بیٹا چاہتی تھی اس لیے سمجھ میں غلطی ہوئی، یہ لوگ اللہ کی طاقت پر نہیں ہماری طاقت پر یقین رکھتے ہیں، ہمارے خلاف کوئی غلط بات کہہ کر تو دیکھے منہ کالا کر کے پورے علاقے میں گھما کر سو کوڑے نہ مارے گے اسے تو یہ اس گدی سے دھکے مار کر اتار دینا!" سائیں اللہ دتہ کے لہجے میں غرور تھا، یقین تھا۔

"سائیں آپ تو واقعی مائی باپ ہیں" اور ایک قہقہہ گونجا تھا، وہ واقعی قائل ہوا تھا

اور ہوتا بھی کیوں نہ سائیں کی " گدی" پر تو اسی نے بیٹھنا تھا ناں۔

پردے گرا دیے گے اب سائیں اپنی آرام گاہ میں تھے۔

"شربت پلا یار، آج تو تھک گیا ہوں۔"

"یہ لو سرکار"

"کتنے پیسے ہیں؟؟"

"سرکاراں کی خیر ہو ایک لاکھ پچیس ہزار ہیں۔"

"دیسی مرغے روسٹ کروا"

"سرکار، حکم کرو"

"اپنی نگرانی میں تیار کروانا، روغنی نان کے ساتھ۔ پھر ہی چلہ پورا ہوگا"

"سرکار کوئی مسئلہ ہی نہیں شام تک تیار ہو گا سب۔"

"لیپ ٹاپ لاؤ ذرا۔" سائیں نے حکم دیا۔

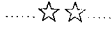
" کیوں سائیں کیا کرنا ہے؟" پوچھا گیا

"انڈین موویز کی پابندی کے خلاف احتجاج درج کروانا ہے یار یہ کہاں کا انصاف ہے بھلا جس چیز پر سب سے آخر میں پابندی لگنی چاہیے، بلکہ لگنی ہی نہیں چاہیے تھی اس پر سب سے پہلے لگا دی، اور ستم تو دیکھو اب کہا جا رہا کہ فیس بک بھی بین کی جا رہی ہے یہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی، ذرا ذرا سی بات پر بڑے بڑے ہنگامے بھلا کوئی عقلمندانہ عمل ہے؟" سائیں اللہ دتہ کا انداز شکایتی تھا، لیپ ٹاپ ان کرتے ہوئے وہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔

"ناکارہ حکمرانو اللہ پوچھے گا تمہیں!" وہ اپنی شکایت کی ای میل بھیج کر پھر بڑبڑائے

"سائیں باہر ہجوم بڑھ رہا ہے اگر آپ زیادہ تھکے نہی ہوئے تو ایک نشست اور کر لیں" حجرے کا مخملی پردہ ہٹا کر وہ رازدار جانشین چیلہ اندر آیا اور شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہنے لگا

"ہاں ہاں چلو" کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مخصوص حلیے میں اپنے اپ کو لپیٹ کر باہر کی جانب بڑھ گے۔

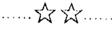


کاش میرے پاس اختیار ہوتا، کاش ایک خون معاف ہوتا، کاش عورت اپنے اپ پر "جاہل عورت" کا ٹھپہ لگا نا بند کردے، کاش ہمارے معاشرے میں "سائیں اللہ دتہ" جیسے پیروں کو سرِ عام گولی مار دینے کا قانون ہوتا!

کاش میرے پاس اتنا اختیار ہوتا کہ میں سائیں اللہ دتہ کو اس گدی سے دھکے مار کر اتارتا اور منہ کالا کر کہ سارے علاقے کا چکر لگوا کر سو کوڑے بھی مارتا۔۔۔!

لیکن میں۔۔۔۔اس دربار کا ایک ادنی سا ملازم ہوں، میرے پاس کوئی اختیار نہیں۔

میں بے بس ہوں۔



بھوت بنگلہ

نائمہ غزل

سامنے پھیلا اجاڑ بیابان سا کھلا میدان اور اس کے پیچھے خستہ حالی کا شکار مکانات، پتہ نہیں کیوں میری نظر جب بھی اس طرف اٹھتی تو مجھے ہر بار ہی کسی آسیب زدہ گھر کا خیال آتا تھا، اپنے ٹیرس پر کھڑی چائے کی چسکیاں لیتی میں بہت دیر تک اس مکان پر نظریں گڑائے اپنے ذہن میں کبھی کی دیکھی گئی ڈراوئنی فلموں کے سین دہراتی رہتی، ان میں اسی طرح کے اجاڑ اور بیابان گھروں کا ہی تو ذکر رہتا تھا، سامنے موجود مکان کی دیواروں کا پینٹ ایسے نظر آرہا تھا جیسے خزاں رسیدہ سوکھے پتے، عجیب رنگوں کے پینٹ کراتے تھے پچھلے زمانے کے لوگ، بھلا یہ پیلا بھی کوئی رنگ ہوا، اتنی رنگوں کی دنیا میں ایسے بیزار سے رنگ بھی بھلا آنکھوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، میں خاصی بدمزہ ہوئی، مگر ایک بار پھر سے کسی فلم کے ڈراوئنے سین کی یاد میں کھو کر دل کی تسلی کا سامان کر لیا، سامنے موجود مکان کی ہیئت ذہن کے پردۂ اسکرین پر پھر سے ایک بار پراسراریت اختیار کر چکی تھی، چائے کی آخری چسکیاں بھرتے میں وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی، اندر کی طرف جاتے میں نے ایک بار پھر سے مڑ کر اس مکان کی طرف دیکھا، شام کے گہرے سائے اتر کر اس مکان کو اپنی بانہوں میں ڈھانپنے کو بے قرار نظر آرہے تھے، اس مکان کی ہیئت آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈھل کر اور بھی خوفناک منظر پیش کر رہی تھی، مجھے ایسا لگا جیسے وہاں کوئی سفید لباس میں کھڑا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور گھور کر تنبیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہاں سے دور چلی جاؤں، میں جھرجھری لے کر جلدی سے اندر چلی گئی۔

"اففف یار عجیب ہے وہ گھر" میں رات کو اپنے بستر میں لیٹی اپنی بیسٹ فرینڈ سے فون پار بات کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کون سا گھر۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے وہی جو سامنے میدان کے دوسری طرف ہے، جس کا عجیب پیلا ملگجہ سا رنگ ہے۔" میں نے نشانی بتاتے ہوئے کہا اور اس گھر کے بارے میں اپنے خیالات اس سے شیئر کرنے لگی۔

"اچھا......وہ......!" اس نے اچھا کو خاصا کھینچ کر ادا کیا۔

"اچھا، چھوڑو تم بتاؤ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس اب تو فارغ ہی ہوں۔" اس نے ہلکے سے کہا۔

''ہاں یار پیپرز کے بعد تو بس سو سو کر ہی دن گزرتا ہے۔'' میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں محترمہ یہ شوق بس تم نے ہی پالے ہوئے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا خیال ہے، کسی روز پکنک کا پروگرام بنائیں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہمم..... آئیڈیا اچھا ہے پھر کل صبح تم تیار رہنا میں تمہیں ایک جگہ لے کر جاؤں گی۔'' اس کی بات پر مجھے کافی حیرت ہوئی وہ کہیں بھی جانے کے لیے کم تیار ہوتی تھی، کجا کہ اتنی جلدی مان جانا، عجیب طبیعت کی لڑکی تھی۔ ہلہ گلہ انجوائے کرنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا میں زبردستی ہی اسے اپنے بنائے گئے پروگرام میں گھسیٹ لیا کرتی تھی، مگر وہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ الگ تھلگ ہی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی راہ چلتے بچوں اور بوڑھوں سے بات کرنا شروع کر دیتی، تو کبھی کسی بزرگ کو روڈ کراس کرانے لگتی اور کبھی کبھی تو گھر تک بھی چھوڑنے چلی جاتی تھی، میں اس کی ان حرکتوں پر چڑ سی جاتی تھی کیونکہ اردگرد کے لوگ کافی عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

''آج ہوا کیا ہے تمہیں۔'' میں نے ٹوکنا ضروری سمجھا۔

''کچھ نہیں بس تم تیار رہنا، ہر بار تمہاری من پسند جگہ جاتے ہیں اس بار میری، ٹھیک ہے نا'' اس نے کہہ کر تائید چاہی۔

''اوکے جناب جو آپ کا حکم۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا، پھر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے فون بند کر دیا، کچھ ہی دیر میں نیند نے مجھے اپنی مہربان بانہوں میں لے کر لوریاں سنانی شروع کر دیں اور میں آہستہ آہستہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگئی۔

''ثمانہ بیٹا اٹھو اتنی دیر ہوگئی ہے، ماریہ کی کال آئی تھی اس نے تم سے تیار رہنے کو کہا ہے، آج کہیں ساتھ میں جانے کو کہا تھا اس نے تم سے؟'' مما کی آواز سن کر میں جلدی سے لحاف سے باہر آئی۔

''اففف مما آپ بس جلدی سے ناشتہ بنائیں میں ابھی آئی، میرے ذہن سے تو بالکل ہی نکل گیا تھا، اب یہ آتے ہی جلدی جلدی کا شور مچائے گی، آپ کو تو اس کی عادت کا پتہ ہے نا'' میں نے جمائی روکتے ہوئے کہا اور جلدی سے واش روم کی طرف بڑھی، ناشتہ کر ہی رہی تھی کہ ماریہ آدھمکی۔

''توبہ ہے ثمانہ یہ کوئی ٹائم ہے ناشتہ کرنے کا، تم تو یار حد کرتی ہو، گیارہ بج رہے ہیں، لوگ اب دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں لگے ہیں اور میڈم کا ابھی تک ناشتہ ہی نہیں ہو، جبکہ میں نے کہا بھی تھا کہ جلدی جانا ہے۔'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''ارے یار سویرا ہی تو ہے، اب بھلا کہیں اتنی صبح صبح منہ اٹھا کر جانا کیا مناسب لگتا ہے، نہیں نا، تو آرام سے چلیں گے۔'' میں نے ناشتہ کی پلیٹ کھسکاتے ہوئے چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا، ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی چائے کا پوچھا جو کہ اس نے منع کر دیا۔

''بس کرو اب، ہر کوئی تمہاری طرح آلسی کا مارا ہوا نہیں ہے۔'' اس کے کہنے پر میں بس اس کا منہ چڑا کر رہ گئی۔

''اچھا چلو کیا یاد کرو گی، بس میں تیار ہوں، چلو۔'' میں کپ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، میرے کہنے پر وہ بھی مسکرا دی۔

''یہ سب کیا ہے۔'' میں نے اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹوں کی جانب رکھے بڑے بڑے شاپنگ بیگز کی جانب اشارہ کیا۔

''سکون۔'' اس کے جواب پر میں نے حیرت سے اسے دیکھا جس کے ہونٹوں پر بہت ہی پیاری سی مسکان بکھری ہوئی تھی۔

''اچھا باقی باتیں راستے میں کرنا، جلدی سے بیٹھو'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے اشارہ کیا میں جلدی سے اندر بیٹھ گئی، پانچ منٹ میں ہی جس جگہ گاڑی رکی میں حیران رہ گئی، یہ وہی مکان تھا جس کو میں روز بہت دیر

تک تکتی رہتی تھی۔ گاڑی سے نکل کر میں سیدھی کھڑی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''یہ کہاں لے کر آئی ہو تم مجھے۔'' میں نے اچھنبے سے پوچھا۔

''آؤ تو سہی'' اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی جانب بڑھی، میں نے اس کی آواز کو نظر انداز کرتے اس مکان کا ایک بار پھر سے جائزہ لینا شروع کیا، ہمیشہ دور ہی دور سے دیکھا تھا، یہ پہلی بار تھا جب میں اس مکان کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی، پیلا مدقوق سا رنگ قریب سے دیکھنے پر اور بھی کریہہ لگ رہا تھا، مگر غور سے دیکھنے پر پتہ چل رہا تھا کہ یہ کوئی رنگ نہیں بلکہ شاید چونے کا کلر وقت کی گردش کے ساتھ گزرتے ماہ و سال میں یہ رنگت اختیار کر چکا تھا، دیواریں الگ دراڑوں سے بھری ہوئی تھیں، چھت اتنی نیچی کہ کوئی بھی دراز قامت شخص آرام سے کود کر بھی اندر جا سکتا تھا۔

''ثمانہ آؤ نا'' ماریہ نے دروازے کے قریب پہنچ کر پھر سے مجھے آواز دی تو میں چونک کر اس کے ہمقدم ہوئی، میں کافی پر جوش بھی ہو رہی تھی اس مکان کو اندر سے دیکھنے کے لیے، جسے اتنے عرصے سے بس باہر سے دیکھ رہی تھی آج اس جادو نگری کو اندر سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ لکڑی کا سال خوردہ دروازہ دستک دینے پر عجیب سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

ایک نحیف سی آواز نے ان کا استقبال کیا۔

''جی بابا، مجھے پتہ نہیں تھا ورنہ تکلیف نہ دیتی۔'' ماریہ نے مؤدب سے انداز میں جواب دیا اور ان کے پیچھے پیچھے اندر کی جانب بڑھی میں بھی اس کے ہمقدم تھی اور نظریں گھما گھما کر چاروں جانب دیکھ رہی تھی، اندر سے بھی دیواروں کا یہی حال تھا بس پیلا پن مفقود تھا، سیلن زدہ دیواروں کے پلستر کہیں کہیں سے اکھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ماریہ نے لایا ہوا تمام سامان ایک طرف رکھ دیا اور کمرے میں موجود چارپائی کی طرف بڑھی اس پر ایک بوڑھی عورت دراز تھی ساتھ ہی ایک اور چارپائی خالی پڑی تھی شاید وہ بوڑھا شخص جس نے ان کا استقبال کیا تھا کچھ دیر پہلے وہیں دراز تھا۔

''ارے بیٹا یہ سب کیا تم، ہمارے لیے تو تمہارا آجانا ہی کافی ہے، بھلا اس سب کی ہمیں کیا ضرورت۔'' بوڑھے نے سامان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''کچھ نہیں ہے بابا بس ضرورت کا ہی تو سامان ہے، آپ شرمندہ تو نہ کریں، میں محبت سے لاتی ہوں۔'' ماریہ نے لاڈ سے کہا تو وہ شخص مزید کچھ کہے بنا مسکرا دیا، میں اس طلسم کدے کو حیرت زدہ انداز میں دیکھ رہی تھی، کتنا کچھ ہماری سوچ کے برعکس ہوتا ہے۔

''اماں آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔'' اس نے بستر پر موجود بوڑھی عورت کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم آگئی ہو نا تو بہت اچھی ہو گئی ہوں، پتہ ہے پورے مہینے بعد آئی ہو'' نحیف و نزار آواز میں بلا کی نرمی اور پیار موجود تھا، ان کی باتوں سے لگا کہ ماریہ وہاں اکثر و بیشتر آتی رہتی تھی۔

''ہاں اماں آج کل امتحانات ہو رہے تھے نا تو ٹائم ہی نہیں ملتا تھا، بس کچھ دن اور پھر باقاعدگی سے آیا کروں گی اور سنائیں بھائی کی کوئی خیر خبر، کوئی فون وغیرہ آیا'' ماریہ کے پوچھنے پر بوڑھی آنکھوں میں جیسے یاسیت سی اتر آئی، بن کہے ہی جواب سمجھ میں آگیا۔

''ارے اماں آپ اداس کیوں ہوتی ہیں میں ہوں نا کراتی ہوں آپ کی بات، ایسے اداس نہ ہوا کریں بس۔'' ماریہ کی باتوں پر بوڑھی آنکھوں میں جیسے زندگی کی کرن جھلملانے لگی، اس وقت ان آنکھوں میں اتنی روشنی بھر گئی تھی کہ میں دنگ رہ گئی، میں نے کبھی زندگی سے اتنی بھرپور آنکھیں نہیں دیکھی تھیں، یہ ماں تا بھی عجیب نکھار چہرے کو بخش دیتی ہے۔ ماریہ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون سے کوئی نمبر ملایا۔

''جی میں ماریہ بات کر رہی ہوں، اماں آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں، جی بس تھوڑی دیر کرلیں، مہربانی ہوگی۔''
ماریہ اپنی آواز دبانے کی کوشش کر رہی تھی، بوڑھی اماں کان لگائے اسی کی طرف متوجہ تھیں، لیکن ماریہ کے زیرِلب انداز ان کے سماعت سے کوسوں دور تھے۔
''بس پانچ منٹ زیادہ نہیں۔'' میں حیرت سے ماریہ کو دیکھ رہی تھی، وہ کس طرح ان بوڑھی امّاں کی وکالت کر رہی تھی، وہ کیسا بیٹا تھا، جس سے بات کرنے کے لیے منتیں درکار تھیں، ماریہ نے فون امّاں کی طرف بڑھایا، اسی لمحے بابا نے اندر قدم رکھا ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس میں چائے کے کپ دھرے تھے، ایک چھوٹی سی پلیٹ میں کچھ بسکٹ بھی موجود تھے، میں کہنے ہی والی تھی کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی اس سے پہلے ہی ماریہ بول پڑی۔
''ارے واہ بابا چائے کی تو بڑی طلب تھی اور آپ کی بنائی ہوئی چائے کی تو کیا ہی بات ہے۔'' اس نے گرمجوشی سے کہتے ساتھ ایک کپ اٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھمایا اور دوسرا خود لیکر چائے کی چسکیاں لینے لگی جبکہ بابا نہال ہوتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔
''ارے احسان کی اماں ساری باتیں خود ہی کیے جاؤ گی یا ہمیں بھی بیٹے کی آواز سننا نصیب ہوگی۔'' بابا نے امّاں کی طرف فون لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، امّاں کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔
''واپس کب آ رہے ہو بیٹا۔'' امّاں کے لبوں سے بے چارگی سے یہ الفاظ ادا ہوئے اور آگے سے نجانے کیا کہا گیا کہ ان کے ہونٹوں پر مایوسی کی کیفیت پھیل گئی اور انہوں نے فون بابا کی طرف بڑھا دیا۔
''ارے نہ بیٹا نہ تنگ ہوا کر تمہاری ماں تو بس ایسے ہی پریشان ہوتی اور کرتی تو خوش رہ بس اور ہمیں کیا چاہیئے، ہم نے تو اپنی زندگی جی لی، ہم کیوں بھلا تجھے پابند کریں اپنا۔'' بابا کے منہ سے نکلتے الفاظ پر بوڑھی امّاں کے آنسو مزید تیزی سے چہرے پر پھیلنے لگے، انہوں نے دوبارہ فون ہاتھ میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن شاید لائن کٹ گئی تھی یا کاٹ دی گئی تھی، بابا نے فون ماریہ کے ہاتھوں میں تھمایا اور خود کمرے سے باہر نکل گئے۔
''ارے کیا ہوا اماں۔'' ماریہ فون کو ایک طرف رکھ کر اماں کو چپ کرانے لگی۔
''وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، کبھی بھی نہیں۔'' وہ ماریہ کے چپ کرانے پر اور زار زار رونے لگیں۔
''نہیں اماں ایسا مت سوچیں، وہ ضرور واپس آئیں گے، آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے۔'' ماریہ نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔
''ہاں آئے گا، شاید ہمارے جنازوں کو کاندھا دینے آئے گا وہ اب۔'' اماں نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں جواب دیا۔
''اماں پلیز ایسی باتیں مت کریں، آپ کو پتہ ہے نا میں اداس ہو جاتی ہوں اور آپ اب چپ کریں ورنہ میں بھی رونے لگوں گی۔'' ماریہ نے اداس سا منہ بناتے ہوئے کہا، میں اپنی جگہ بالکل ساکت و صامت تھی، میرے دھیان کا طلسم جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اس سے بس میں ہی واقف تھی، حیرت کدہ مزید حیرت جگا رہا تھا، سارا شوق بھربھری مٹی کی طرح زمین بوس ہو رہا تھا، میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں جیسے پھنس کر رہ گئی تھی، ماریہ اماں کے ساتھ مگن سی تھی اور اب اماں کے چہرے پر بھی ماریہ کی باتوں کی وجہ سے مسکراہٹیں جگمگانے لگی تھی۔
''اچھا تم ذرا اماں سے باتیں کرو، میں دیکھوں یہ بابا کہاں رہ گئے، میں اتنے دنوں کے بعد ملنے آئی ہوں اور آپ لوگ مجھے اداس کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔'' ماریہ کہتے کہتے کمرے سے باہر نکل گئی، مجھے پتہ تھا وہ اس بوڑھے بابا کو یقیناً دلاسہ دینے گئی تھی، اس کے جانے کے بعد کمرے میں مکمل طور پر خاموشی چھا گئی، میں نظریں جھکا کر بیٹھی گود میں رکھی اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''پڑھتی ہو بیٹا۔'' اماں نے ہی اس طلسم بھری خاموشی کو توڑا۔
''جی ماریہ اور میں ایک ہی کلاس میں ہیں۔'' مجھے بولنے میں بھی دقت سی محسوس ہو رہی تھی، خاموشی ایک بار پھر سے کمرے میں راج کرنے لگی، تھوڑی دیر بعد ماریہ اور بابا ایک ساتھ بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔
''بس اب سے آپ لوگ مجھے اتنا تنگ کریں گے تو پھر میں بھی نہیں آؤں گی یہاں۔'' ماریہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو بابا ہنسنے لگے۔
''ارے پگلی کون تنگ کرتا ہے بھلا اور ہم بڈھا بڈھی کہاں تنگ کر سکتے ہیں کسی کو اور ایک دن تو ایسا ہوگا کہ تم دوسرے گھر چلی جاؤ گی پھر کہاں ہم یاد آئیں گے۔'' بابا نے مسکراتے ہوئے کہا جبکہ ان کی آنکھوں میں ایک یاسیت سی اتر آئی تھی۔
''ارے ایسا سمجھتے ہیں آپ مجھے۔'' ماریہ نے خفگی سے کہتے ہوئے منہ پھلا لیا۔
''ارے نہ نہ بچہ ناراض نہیں ہوتے میں تو بس مذاق کر رہا تھا'' بابا کے لہجے میں ماریہ کے لیے بے تحاشہ محبت رچی ہوئی تھی۔ پھر کافی دیر تک باتیں چلتی رہیں ماریہ کبھی روٹھتی تو کبھی لاڈ دکھاتی، میں بہت حیرت سے اس کے انداز ملاحظہ کر رہی تھی کیونکہ تمام دوستوں میں وہ سب سے زیادہ سنجیدہ شمار ہوتی تھی، مگر اس وقت جیسے ایک چھوٹی سی ننھی بچی بنی ہوئی تھی۔
''اچھا بابا اب ہم چلتے ہیں، کل میں پھر آؤں گی اور لتاں مجھے ایسے بستر پہ نہیں چاہئیں آپ اچھا!'' ماریہ نے کھڑے ہوتے ہوئے منہ پھلانے کے انداز میں کہا تو لتاں اور بابا دونوں مسکرا دیے اور بابا انہیں چھوڑنے دروازے تک چلے آئے۔
''تم سوچ رہی ہوگی کہ میں تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں۔'' ماریہ نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کی بات کے جواب میں، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''مجھے پتہ ہے تم مجھے یہاں کیوں لائی تھیں۔'' میں نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔
''دیکھا نا تم نے! انسان بستے ہیں یہاں، ہم اپنی زندگیوں میں مگن بس ایڈونچر اور تھرل ہی سوچتے رہتے ہیں، ہمارے اتنے نزدیک کیا ہو رہا ہے ہم نہیں جان پاتے۔'' ماریہ کی بات پر آج سے پہلے کبھی اتنا اتفاق نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس وقت ہو رہا تھا۔
''میں بس یہاں ذرا سی امید کا چراغ جلانے آتی ہوں، ان کی اندھیری زندگی اگر میرے چند لمحوں کے ساتھ سے منور ہو سکتی ہے تو میں اسے منور ہی رکھنا چاہوں گی، کیا جاتا ہے بھلا میرا بس کچھ وقت اور بدلے میں میرا دل جس سکون سے مالا مال ہوتا ہے، میں بتا نہیں سکتی۔'' ماریہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''ان کا بیٹا کب کا پردیس گیا، شاید وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے اور ان میں اتنی سکت بھی نہیں کہ اسے چند لمحوں کی کال ہی کر سکیں، میں روز آ کر انہیں ایک امید کا سرا تھما دیتی ہوں، یہ بھی اپنے بیٹے کی آواز سن کر شانت ہو جاتے ہیں۔'' ایسا کہتے ہوئے ماریہ کے چہرے پر بلا کا سکون تھا، میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا دور میدان کے پیچھے، شاہانہ انداز میں محل نما اپنا گھر مجھے آسیب زدہ نظر آ رہا تھا جس کی ساخت اتنی بڑی تھی مگر مکینوں کے دل اپنے اردگرد کے لوگوں سے بیگانہ کیا تھا بھلا اس میں سوائے پیسوں کی ریل پیل کے، کبھی جہاں کھڑے ہو کر مجھے یہ گھر آسیب زدہ لگا کرتا تھا آج وہاں کھڑے ہو کر مجھے اپنا ہی گھر کسی آسیب کا مسکن لگ رہا تھا، واقعی جگہیں بدلنے سے چیزیں اور خیالات بدل جایا کرتے ہیں، بہت قریب سے اگر منظر دھندلے تو بہت دور سے چھوٹے بھی ہو جاتے ہیں۔



ذوق آگہی

سباس گل

اللہ کی نصیحت

"(مسلمانو) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو۔ تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، ان کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اگر تم واقعی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کے حوالے کر دو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔"

(النساء: ۵۸، ۵۹)

افتخار احمد...... کراچی

تکبر کا انجام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت میں ایسا شخص داخل نہ ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور و تکبر ہوگا۔" ایک آدمی نے دریافت کیا: "انسان پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر حق (کے مقابلے میں) اترانے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔"

(مسلم)

تحسین احمد...... کراچی

جاگتے ہیں

سکوں ہے نہ راحت کسی ایک پل کو
مقدر کے مارے بھی جاگتے ہیں
تو اے لوڈ شیڈنگ کوئی بھوت ہے کیا؟
تیرا نام سن کر سبھی بھاگتے ہیں

راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

باپ...... بیٹا

ایک بیٹا اپنے بوڑھے والد کو یتیم خانے میں چھوڑ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ اچانک ہی اسے اپنے والد کی ہنسی کی آواز آئی بیٹے نے پلٹ کر دیکھا تو پتا چلا کہ اس کے والد صاحب یتیم خانے کے سربراہ کے ساتھ ایسے گھل مل کر بات کر رہے تھے کہ جیسے بہت ہی پرانے اور قریبی واقف کار ہوں مارے تجسس کے بیٹے نے یتیم خانے کے سربراہ سے پوچھا آپ میرے والد صاحب کو کب سے جانتے ہیں؟

یتیم خانے کے سربراہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا گزشتہ تیس سال سے جب سے یہ بے اولاد ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس سے ایک یتیم بچہ گود لینے آئے تھے۔

پرنس افضل شاہین...... بہاول نگر

لعنت اور اس کے مستحقین

لعنت نام ہے اللہ کی رحمت سے دوری کا اور انتہائی رسوائی اور ذلت کا جس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا ان کے بارے میں اتنی سخت وعید آئی ہے کہ فرمایا "جن پر اللہ کی لعنت ہے وہ جہاں کہیں بھی ملیں ان کی گردن اڑائی جائے (سورۃ الاحزاب)

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟ لعنت جس قدر بری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں۔ کسی مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے اور کافر پر بھی صرف اس صورت میں کی جا سکتی ہے جبکہ اس کا کفر پر مرنا یقینی ہو۔" حضرت ابوداؤدؓ فرماتے ہیں "میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جب بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے جس پر آسمان کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں پھر وہ زمین کی طرف اترتی ہے تو زمین کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں (یعنی زمین اس لعنت کو قبول نہیں کرتی) پھر وہ دائیں بائیں گھومتی ہے جب کہیں اس کو راستہ نہیں ملتا تو جس پر لعنت کی گئی ہے اس کے پاس پہنچتی ہے اگر وہ واقعی لعنت کا مستحق ہے تو اس پر

پڑتی ہے ورنہ پھر کہنے والے پر پڑ جاتی ہے۔

(ابوداؤد)

ایس حبیب خان......کراچی

دیوار یاجوج ماجوج

یہ ایک روایتی دیوار ہے اس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ کہف میں موجود ہے یہ روایت بہت دلچسپ ہے تبھی اس کو دہرا رہا ہوں یاجوج ماجوج اس مفسد قوم کا نام ہے جس کے انسداد فساد کے لیے ذوالقرنین نے ان کے راستے میں ایک آہنی دیوار کھنچوادی تھی یہ ایک نہایت مستحکم اور عظیم الشان دیوار تھی روایت میں ہے کہ جب ذوالقرنین چلتے چلتے ایک دیہات کے گھاٹ کے دو کگاروں کے بیچ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دوسری طرف قوم آباد ہے جو غیر متمدن اور ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ پریشان حال ہیں۔

بہرحال ان لوگوں نے انہی کی بولی میں عرض کیا کہ اے ذوالقرنین اس گھاٹی کے ادھر ماجوج ماجوج کی قوم ہے اور وہ لوگ ہمارے ملک میں آ کر فساد کرتے ہیں آپ کی مرضی ہو تو ہم آپ کے لیے چندہ جمع کر دیں بشرطیکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ وہ مال جس میں میرے پروردگار نے مجھے پورا اختیار دے رکھا ہے وہ کافی ہے ہاں تم ہاتھ پیروں سے مدد کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔

پھر لوہے کی سلیں لائی گئیں اور ذوالقرنین نے ان سلوں کو گھاٹی کے درمیان بھر دیا پھر ان سلوں کو دہکایا گیا حتیٰ کہ وہ سرخ ہو گئیں پھر ان میں تانبا پگھلا کر ڈالا گیا اس طرح ایک ایسی اونچی اور مضبوط دیوار تعمیر ہو گئی جس کو نہ تو عبور کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس میں سوراخ ہو سکتا تھا پھر فرمایا کہ قیامت کے قریب یہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج باہر نکل آئیں گے۔

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج بربن یافث بن نوح کی اولاد ہیں اور ان کے چار بادشاہ ہیں۔ طوعان، اشمع، عارون اور عاتر۔

ایم حسن نظامی......قبولہ شریف

پشیمانی کے آنسو

حضرت امیر معاویہؓ آرام فرما رہے تھے کہ اچانک کسی نے آپ کو بیدار کر دیا حضرت امیر معاویہ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ان کو کوئی شخص نظر نہ آیا پھر آپ نے دیکھا کہ ایک شخص دروازے کی آڑ میں منہ چھپائے کھڑا ہے آپ نے دریافت کیا ”تو کون ہے؟“

اس نے جواب دیا ”میرا نام ایک زمانہ جانتا ہے میں بدبخت ابلیس ہوں۔“ آپ نے فرمایا۔

”اے ابلیس تو نے مجھے کیوں جگایا؟“ اس نے کہا

”اے امیر نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے آپ کو مسجد کی طرف دوڑ کر جانا چاہیے قبل اس کے کہ وقت نکل جائے۔“

آپ نے فرمایا ”ہرگز یہ غرض تیری نہیں ہو سکتی کہ تو خیر کی طرف کبھی رہنمائی کرے میرے گھر میں چور کی طرح گھس آیا اور کہتا ہے کہ میں پاسبانی کرتا ہوں بھلا میں چور کی بات پر کیسے یقین کر سکتا ہوں اور تو میرا بہی خواہ کب ہو سکتا ہے؟“ ابلیس نے کہا۔

”ہم بھی کبھی فرشتوں میں شامل رہے ہیں اور اطاعت کے راستے کو دل و جان سے طے کر چکے ہیں سفر کرتے ہوئے کوئی خواہ کہیں چلا جائے وطن کی محبت اس کے دل سے کب جا سکتی ہے ہم بھی خدا کے دریائے رحمت سے پانی پی چکے ہیں اور اس کی رضا کے باغ کی سیر کر چکے ہیں بھی ہم بھی اس کی درگاہ کے عاشق تھے اگر اس کے دریائے کرم نے مجھ پر عتاب کیا تو پھر کیا ہوا؟“

حضرت امیر معاویہ نے فرمایا ”اے راہزن مجھ سے بحث مت کر تجھ کو میرے اندر گمراہ کرنے کا راستہ نہیں مل سکے گا میرے اندر راستہ مت ڈھونڈ، سچ سچ بتا کہ تو نے مجھے نماز کے لیے کیوں بیدار کیا تیرا کام تو گمراہ کرنا ہے اس خیر کی دعوت میں کیا راز ہے؟“ ابلیس نے کہا۔

”بدگمان آدمی تو سچی بات کو سو دلیلوں کے باوجود تسلیم نہیں کرتا میرا قصور صرف یہ ہے کہ ایک بدی کر بیٹھا اور دنیا میں بدنام ہو گیا حضور اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ کی نماز فوت ہو جاتی تو دنیا آپ کی نگاہوں میں تاریک ہو جاتی اور آپ شاید غم اور صدمے سے رو رو کر نڈھال ہو جاتے آپ کی یہ آہ و زاری، دل کا سوز و گداز اور درد سو نمازوں کے ثواب سے بڑھ جاتا آپ کے قرب اعلیٰ کے خوف اور حسد نے مجھے آپ کو بیدار کرنے کے لیے آمادہ کیا بھلا مجھ کو یہ

کب گوارا تھا کہ آپ اس قدر زیادہ ثواب حاصل کرلیں آپ کو جگانے کا باعث میرا یہی جذبہ حسد تھا میں نے اسی خوف سے آپ کو بیدار کیا تا کہ آپ کی آہ وبکا مجھے نہ جلا دے میں انسان کا حاسد ہوں میں اس کا بھلا کیسے سوچ سکتا ہوں، اس حسد سے میں نے ایسا کیا ہے میں انسان کا دشمن ہوں میرا دل یہ کیسے گوارا کرتا ہے کہ اسے کوئی فائدہ پہنچے۔

حضرت امیر معاویہ نے فرمایا ”ہاں اب تو نے اصل بات بتائی دراصل تو نہیں چاہتا کہ میں خلوص اور درد کے ساتھ اللہ کے حضور گڑگڑاؤں اور اپنی آنکھوں سے ندامت اور پشیمانی کے آنسو بہاؤں کیونکہ اس آہ وفغاں کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا اجر ہے۔

درس حیات: شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اس لیے ہر لمحہ اس سے چوکنے رہو۔

(حکایات رومی......مولانا جلال الدین رومیؒ)

گل مہر......کراچی

ایڈیسن

یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ بلب کا موجد تھامس ایڈیسن تھا یہ فقرہ اس پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے وہ اندھیرے سے بہت ڈرتا تھا اور اس خوف اور ڈر نے اس سے ایک ایسی ایجاد کرا ڈالی جس سے آج دنیا روشن ہے تھامس ایڈیسن کے متعلق ایک اور بات بھی ہے ایڈیسن کو ایک دفتر میں کام کرتے ہوئے اس کے باس نے سختی سے کہا۔

تم اپنے یہ کھلونے اٹھا کر یہاں سے دفع ہو جاؤ تمہیں یہاں کھیل کھیلنے کے لیے تنخواہ نہیں دی جاتی یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب ابھی ایڈیسن نے بلب ایجاد نہیں کیا تھا اور اس پر کام ہر جگہ کرتا رہتا تھا جنوں جو تھا۔

بہر حال جب ان کھلونوں نے دنیا روشن کردی تو وہی باس پچھتا رہا تھا کہ کاش میں ایڈیسن کو اپنی کمپنی سے نہ نکالتا تو آج اس کی کامیابی کا حصے دار ٹھہرتا اس لیے سیانے کہتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔

ریاض بٹ......حسن ابدال

احتیاط

پہاڑی پر بنے چھوٹے سے گھر میں ایک کمرہ تھا جس کے چاروں طرف کھڑکیاں تھیں گھر میں بوڑھی عورت اپنی جوان اور خوب صورت بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔ان کا گزارہ ایک گائے پر تھا۔لڑکی نے ماں سے کہا میں کھڑکی کے باہر مسلسل دیکھ رہی تھی مجھے کسی کے قدموں کی آواز آئی ہے۔

وہ جوان جہاں لگتا ہے بڑی بڑی موچھیں ہیں۔

بوڑھی نے باقی کی کھڑکیاں بند کرادیں۔تم بالکل باہر نہ دیکھنا۔

بیٹی بولی ماں وہ ہمارے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے اور پولیس کی وردی پہن رکھی ہے۔بوڑھی تیزی سے باہر گئی اور گائے کا رسہ کھولا اور اسے کمرے کے اندر لے آئی پھر اس نے دروازہ مقفل کردیا تھا۔

نتیجہ: جس چیز کو خطرہ ہو اسے بھی محفوظ کرلو اور جب خطرہ ایک دوسری چیز کا ہو جو پولیس والوں سے ہوسکتا تھا اسے بھی جلد محفوظ کرلیا جائے۔

تہمینہ تبسم......کراچی

کون بنے کا خوابوں کی تعبیر

برٹش گورنمنٹ ختم ہوگئی تو انگریز یہاں سے چلا گیا' لیکن خود فوجی جرنیل' بیوکریٹ' جاگیردار' سرمایہ دار اور وہ سیاسی خاندان جو اپنے عہد حکومت میں تیار کرچکا تھا' انہوں نے تو اسی ملک میں رہنا تھا اور اپنے آقا کی غلامی کا حق ادا کرتا تھا' برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی کا جو خواب دیکھا تھا' بدقسمتی سے وہ خواب ہی نہ رہا نہ تو فرنگی جمہوری نظام کی جگہ شرعی اسلامی نظام آیا نہ ہی اقتدار معاشرہ فرنگی نواز ملک وملت کے غداروں کے ہاتھ سے نکل کر صلحاء اور معززین معاشرہ کے ہاتھ آیا اور نہ ہی وہ تاریخی اسلامی خلافت اور مملکت بحال ہوئی' جس کا خواب مسلمانان برصغیر نے دیکھا اور اس کے حصول کے لیے اپنی جانوں اور عصمتوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ ہے کوئی ان متوالوں کے خوابوں کی تکمیل کرنے والا؟

اقبال احمد......اسلام آباد

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں

ضائع کردیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی، چین میں چینی، انگلستان میں انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جا کر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال و پستی اور نالائقی کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوا دیتے ہیں۔

سفیان اشرف......اوکاڑہ

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے، اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شائد آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو ابھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کہیں گم نامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پہ یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں سمجھتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈراما کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پہ بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت، چاہت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جا رہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے ناکام ہونے پہ دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جا رہی ہے اس کو دور نہ جانے دیں اس کا راستہ روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا جنھوں نے محبت وعشق کے لیے سب کچھ قربان کردیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کردیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت وعشق کا سمندر موجزن تھا۔ اس لیے آج بھی کائنات میں محبت وعشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آ کر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

شکیل اختر......سنجر پور



خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

زندگی کی چکی میں

زندگی کی چکی میں
گھن کی طرح ہم پس گئے
ادائیگی میں فرض کی
جسم وجاں لٹادیا
خون بھی سب نچڑ گیا
ہر رشتہ خود سے بچھڑ گیا
زندگی کی چکی میں
یہ بڑی خرابی ہے
سب برابر کرتی ہے
باقی کچھ نہیں رکھتی
اس کے دونوں پاٹوں میں
سارے دانے پستے ہیں
کھوٹے، کھرے
کچے پکے سب ایک برابر پستے ہیں
پھر آٹا، گھن چھٹ جاتا ہے
خالص آگے جاتا ہے
اور کھوٹ دھرارہ جاتا ہے
زندگی کی چکی میں
یہ بڑی خرابی ہے
بخشتی نہیں ہے یہ
شاہ ہو، یا گدا
سب کو پیس دیتی ہے
زندگی کی چکی میں
یہ بڑی خرابی ہے

سباس گل......رحیم یارخان

محبت

محبت کی دنیا بہت ہی وسیع ہے
جس نے محبت کی ہو
اس کی آنکھوں سے پتا چلتا ہے
خدارا میری محبت کو مذاق مت سمجھنا
محبت کی تعریف ناممکن سی بات ہے
محبت کی تعریف کرنا ایسے ہے جیسے
سمندر کو کوزے میں بند کرنا
محبت زندگی بھی ہے محبت دولت بھی ہے
محبت فانی بھی ہے، محبت جاوداں ہی ہے
محبت کا بستا محبت والے ہی جانے میں

ناظم حسین شاہد......سٹی حویلی لکھا

خدا کے بندے

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی ہے دوست خالق دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین وایمان
کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان

شاعر: مولانا الطاف حسین حالی
انتخاب: علی اصغر انصاری......منچن آباد

جاہل

سنو......!
بہت سی ڈگریاں لے کر
ہنر پہ دسترس پا کر
کسی مفلس کا درددل
اگر اس کی آنکھوں سے
پڑھنے سے قاصر ہو
تو جاہل ہو

شاعر: محسن نقوی
انتخاب: ایم جے قریشی......ڈیرہ اسماعیل خان

غزل

میں تیرے پاس ہوں مجھ سے نظر ملا تو سہی
ہے مجھ سے دور کیوں اتنا قریب آ تو سہی

ہوا سے اڑتا ہے آنچل تو اس کو اڑنے دے
چھپا کے رکھا ہے کیا کیا ذرا دکھا تو سہی
قربت قرار آئے نہ تجھ کو تو پھر مجھے کہنا
میرے لبوں کو لبوں سے ذرا ملا تو سہی
بکھر کے آ میری بانہوں میں ایک شب کے لیے
تو اپنے آپ سے پردہ ذرا اٹھا تو سہی
میں اپنے پیار سے تجھ کو نہال کردوں گا
تو مرے پیار کی شدت کو آزما تو سہی
میں سارے دکھ ترے شکوے گلے مٹا دوں گا
تو ایک بار گلے سے مجھے لگا تو سہی
کیا ہے تو نے جو رسوا تو غم نہیں عاجز
کہ تیرے عشق میں ہونا تھا جو ہوا تو سہی

شاعر: افضال عاجز

انتخاب: پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

غزل

بے اثر اپنی دعائیں ہوگئیں
بے حساب ان کی جفائیں ہوگئیں
ان کی قسمت میں خوشی کے پھول ہیں
اپنی قسمت میں بلائیں ہوگئیں
غربت و افلاس آڑے آگئے
چاک یوں ان کی ردائیں ہوگئیں
اور بھی ان کا تکبر بڑھ گیا
اور ہی قاتل ادائیں ہوگئیں
مہکتی تھیں تازہ پھولوں کی طرح
کیوں مکدر وہ فضائیں ہوگئیں
ساتھ اپنوں نے بھی چھوڑا ہے قمر
ہم سے کیا ایسی خطائیں ہوگئیں

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

ایک مدت سے انتظار میں ہوں
ڈھونڈ لو میں یہیں بہار میں ہوں
ہجر کا روگ لگ گیا ہے مجھے
اب کہاں اپنے اختیار میں ہوں
منزلیں ساتھ میرا کیا دیں گی
کارواں کی طرح غبار میں ہوں
وحشتیں چھوڑتی ہیں کب مجھے
میں مسلسل اسی حصار میں ہوں
کوئی میرا پتا بھی لائے عظیم
کب سے اجڑے ہوئے دیار میں ہوں

محمد معظم صدیقی...... لیاقت آباد کراچی

زخم

بہت سے زخم وقت کے ساتھ ساتھ
مندمل ہوتے جاتے ہیں
حتیٰ کہ کبھی کبھی
زبان کے گھاؤ بھی بھر جاتے ہیں
لیکن کچھ زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے
جن زخموں کو وقت بھی بھر نہیں پاتا
وہ زخم حسد کے، عداوت کے
وہ زخم طمع کے، کدورت کے
عدالت، مخاصمت، ذلالت، بغاوت کے
وہ زخم حرس کے، کدورت کے
یہ تمام وقت بوقت
ہرے ہوتے ہی رہتے ہیں
روز و شب کی ہر گھڑی، ظریف احسن
رستے ہی رہتے ہیں

ظریف احسن......

امجد صابری

فن کے قدرداں سارے
چاک گریباں کر کے
خاک بسر پھرتے ہیں
یاد تم کو کرتے ہیں
تم تو سب سے مخلص تھے
پیار کی علامت تھے
ایسا کیا کیا ہم نے

ہو گئے خفا تم بھی
چھوڑ کے جہاں فن
تم کہاں سدھارے ہو
امجد صابری پیارے

نیر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

غزل
زلف نے اس کی کچھ ایسا کمال کردیا
گزرے لمحوں کی یاد نے جینا بے حال کردیا
ریشم سے نازک تھے ہم لوگ کسی دور میں
اب جدائی نے پتھر کی مثال کردیا
دیتا رہا زمانہ گواہی میرے کردار کی
آج میرے پیارے نے میری ذات پہ سوال کردیا
اب خود ہی بچنا پڑے گا زمانے کے وار سے
میرے محبوب نے ہر سو سازشوں کا جال کردیا
نفع و نقصان کی باتیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں
دل رکھ کے ہاتھ پہ اپنا اسے ارسال کردیا
اس محبت کو موت آجائے اے خدا
جس نے سب کا جینا بے حال کردیا
پچھاڑا نہ تھا مجھے کسی نے حیران ہوں مگر
تجھ سے نرم و نازک سے مجھے کیسے نڈھال کردیا
اک لمحے کی جدائی بھی موت کا سماں تھی
بن اس کے جی کے صائم نے کمال کردیا

ظہور احمد صائم......مانگا منڈی لاہور

غزل
کچھ میں بھی ضد کی پکی تھی
کچھ وہ بھی ضبط گنوا بیٹھا
کچھ میں خود سے بھی انجان رہی
کچھ اس نے دل اپنا قربان کیا
کچھ میں بھی راہوں میں بھٹکتی رہی
کچھ وہ بھی منزل پا نہ سکا
کچھ میں اس کی دیوانی تھی
کچھ اس کی محبت میں فراوانی تھی
کچھ یادوں پر اس کا پہرا تھی
کچھ خوابوں میں بھی اس کا چہرہ تھا
کچھ میں اس کی شیدائی تھی
کچھ اس کے جذبوں میں سچائی تھی
کچھ میں نے بھی اس سے وفا نہ کی
کچھ وہ بھی فریب کھو بیٹھا
کچھ میں نے اسے برباد کیا
کچھ اس نے مجھے آباد کیا
کچھ میں نے بھی ہار تسلیم نہ کی
کچھ وہ جیت کر بھی ہار بیٹھا
کچھ پچھتاوا بھی بنا مقدر میرا
کچھ وہ بھی مداوا کر بیٹھا

مدیحہ مدو......بورے والا

غزل
سمندر میں اترتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
تیری آنکھوں کو پڑھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھن گئی جب سے
کوئی بھی نام لکھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
نہ جانے ہوگیا ہوں میں اس قدر حساس کب سے
کسی سے بات کرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
وہ سب گزرے ہوئے لمحات مجھ کو یاد آتے ہیں
تمہارے خط جو پڑھتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
تیرے کوچے سے اب میرا تعلق واجبی سا ہے
مگر جب بھی گزرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے میرے دل پر
وصی میں جب بھی ہنستا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

تانیہ جہاں......سیالکوٹ ڈسکہ

کبھی تم بھی نظر آؤ

کہ تم بھی نظر آؤ
یقین مانو صبح سے شام تک ہم کو
بہت سے لوگ ملتے ہیں
نگاہوں سے گزرتے ہیں

کوئی انداز تم جیسا
کوئی ہم نام تم جیسا
کسی کی آنکھیں تم جیسی
کسی کی باتیں تم جیسی
مگر تم ہی نہیں ملتے
یقین مانو بہت بے چین رہتے ہیں
بڑے بے تاب سے رہتے ہیں
دعا کو ہاتھ اٹھتے ہیں
دعا میں یہ ہی کہتے ہیں
لگی ہے بھیڑ لوگوں کی
مگر اس بھیڑ میں ہم کو
کبھی تم بھی نظر آؤ

انتخاب: جویریہ خان...... کراچی

غزل

ہر بار مجھے زخم جدائی نہ دیا کر
گر میرا نہیں ہے تو دکھائی نہ دیا کر
سچ، جھوٹ تیری آنکھ سے ہو جاتا ہے ظاہر
قسمیں نہ اٹھا اتنی صفائی نہ دیا کر
توفیق نہیں گر تجھے وعدہ نبھانے کی
اوروں کو بھی تو درس وفا نہ دیا کر
اڑ جائیں تو پھر لوٹ کے کب آتے ہیں
ہر بار پرندوں کو رہائی نہ دی کر
معلوم ہے تو رہتا ہے مجھ سے گریزاں
پاس آ کے محبت کی دہائی نہ دیا کر

سیدہ لوبا سجاد...... کہروڑ پکا

غزل

دل میں بے قراری کا سلسلہ بڑھاتی ہے
نیند آتے آتے بھی کتنے غم جگاتی ہے
روشنی مہکتی ہے اور ستارے کھلتے ہیں
رات میرے آنگن میں باغ سا بناتی ہے
تیری میری حمایت کی داستانیں چھڑتی ہیں
شام زرد پتوں سے ہاتھ جب ملاتی ہے

جب یقین ہوتا ہے تم نہیں ہو میرے ساتھ
چاند رونے لگتا ہے چاندنی رلاتی ہے
میں نوید برسوں سے اس نشے کا عادی ہوں
جام تیری یادوں کا تیرگی پلاتی ہے

سائبہ کنول...... سیالکوٹ، ڈسکہ

کوئی یاد بہت آئے

جب ہجر کے لمحوں میں
کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں
حدوں سے گزر جائے
پھر دل کے دریچے سے
ایک چاند کو تم تکنا
بے تاب دھڑکنوں کو
قابو میں مگر رکھنا
گزرے ہوئے لمحوں کو
چپکے سے بلا لینا
مظہر میرے کیا ہو
تم تو میرے جہاں ہو
اب ایک پل بھی تم بن
مجھ سے رہا نہ جائے
جب ہجر کے لمحوں میں کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں حدوں سے گزر جائے

صائمہ ناز...... تاروجبہ



مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر 01

یوں تو وہ کوٹھے پر پیدا ہونے والا ایک معمولی طوائف زادہ تھا

بہت سے ایسے زندہ وجودوں میں سے ایک جو بازار حسن کے کوٹھوں اور گلیوں میں جھڑکیاں اور گالیاں کھائے ہوئے وقت کی ٹھوکروں میں پروان چڑھتے ہیں۔ ہاں البتہ قدرت نے حالات و واقعات کا جو کھیل رچایا تھا اس کی بدولت اس کے وجود کی ترکیب میں ان لطیف جذبوں کا آہنگ یکجا ہو پایا تھا جو جذباتی حالت کی معراج ہوا کرتے ہیں۔

خلوص...... دیانت...... ادب...... ایثار...... خدمت...... شکر گزاری...... کیفیت و احساس کی صورت وجود رکھنے والے محبت کی یہ بنیادی اجزا دودھ اور خون کے ذریعے اس کے جسم و جان کا حصہ بنے تھے۔ بدمعاش کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر...... وہ کسی کا مرید ہو گیا۔

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش...... جس سے سرکار نے عشق کیا اور عشق کی مریدی



"مرشد......" طبلے پر شام کی پہلی تھاپ پڑی تھی۔

"ارے او مرشد......" نزہت جہاں بیگم نے ہال کی طرف بڑھتے ہوئے ایک بار پھر پکارا اور شگفتہ بانو پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ شگفتہ کھڑکی میں کھڑی ہونٹوں پر آتشیں سرخی کی تہہ جمانے میں مگن تھی۔

"اے شگفتہ...... مرشد کی کوئی خبر ہے کیا؟" نزہت بیگم نے ایک ناقدانہ نظر اس کے چیختے چنگھاڑتے بدن پر ڈالتے ہوئے بے چین سے لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں ادھر آیا بھی ہے کہ نہیں۔" اس نے آئینے میں ایک ذرا اپنے لہو رنگ ہونٹوں کا جائزہ لیا۔ "آیا ہے تو ادھر اپنی ماتا جی کے گھٹنے سے لگا بیٹھا ہوگا۔"

"وہاں تو میں دیکھ کر آ رہی ہوں' ادھر نہیں ہے' ایک تو ان نواب صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی ہال میں چلی آئی۔ حسب معمول چاندنی بچھائی جا چکی تھی۔ گدے اور تکیے بھی لگا دیئے گئے تھے۔ اچھو تکیوں کے ساتھ ساتھ چمچماتے ہوئے اُگالدان سجا رہا تھا۔ ایک طرف سازندے اپنے مخصوص آلات ترتیب دینے میں مصروف تھے لیکن نزہت بیگم کو اس وقت جس سے غرض تھی وہ یہاں بھی موجود نہیں تھا۔

"اے اچھو' مرشد کو دیکھا ہے تو نے؟" نزہت بیگم نے اچھو کو مخاطب کیا۔

"ہاں جی' روز ہی دیکھتا ہوں۔" وہ جیسے بائی جی کے سوال پر متعجب ہوا۔

"گھوڑے کی شکل والے' ابھی کہیں دیکھا ہے کیا؟"

"ابھی......" اچھو نے گردن گھما کر پورے ہال میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ "نہیں...... ادھر تو نہیں آیا وہ۔"

"تو جا کے دیکھ مرا اسے کدھر ہے وہ...... اور جلدی سے بلا کر لا۔" نزہت بیگم نے ہونٹوں کے کناروں سے بہہ آنے والی پان کی پیک انگلی سے صاف کرتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔

"ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے اسے اوپری زینوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مغرب کا وقت ہے نا...... میرا خیال ہے اوپر چھت پر نماز پڑھ رہا ہوگا۔"

استاد مبارک علی خان کی بات سن کر اچھو بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔ باقی سازندے بھی نزہت بیگم کی طرف دیکھنے لگے جو خاصی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحے متذبذب سی کھڑی رہنے کے بعد وہ استاد مبارک علی خان سے مخاطب ہوئی۔

"استاد جی آپ خود ہی ذرا جا کر دیکھیں اور جیسے ہی وہ نماز سے فارغ ہو اسے فوراً مہمان خانے میں بھیج دیں۔" وہ ایک ذرا توقف سے پھر بولی۔ "اسے کہیے گا کہ اس کے مہمان آئے بیٹھے ہیں اور اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں دیکھتا ہوں اسے۔" استاد جی ہارمونیم ایک طرف کھسکاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے تو نزہت بیگم واپس مہمان خانے کی طرف پلٹ گئی۔ جہاں صرف اہم اور خاص شخصیات کو ہی بٹھایا' ٹھہرایا جاتا تھا' ان کی خدمت خاطر کی جاتی تھی۔ دلدار چن نے پھر سے طبلہ تھپکا تھا۔



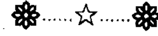
عشق تو اس کو وراثت میں ملا تھا۔ موروثی طور پر اس کے لہو میں اترا ہوا تھا اور پھر لہو کے اندر ہی کہیں گھات لگا کر چھپ کر بیٹھا گیا تھا۔ قدرت کی طرف سے اس کے خلاف ترتیب دی گئی سازش کا حصہ بننے کے لیے ایک طے شدہ وقت کے انتظار میں......

یوں تو وہ کوٹھے پر پیدا ہونے والا ایک معمولی طوائف زادہ تھا' ایک بے حیثیت اور بے وقعت وجود...... بہت سے ایسے دوسرے زندہ وجودوں میں سے ایک جو بازار حسن کے کوٹھوں اور گلیوں میں جھڑکیاں اور گالیاں کھاتے ہوئے وقت کی ٹھوکروں میں پروان چڑھتے ہیں۔ جن کا کوئی شجرہ' کوئی حسب نسب' کوئی خاندانی شناخت نہیں ہوتی...... جنہیں باپ کی بجائے ماں کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خود اسے اور اپنے ماحول سے لڑتے' الجھتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ہیرا پھیری جیب تراشی' ناجائز فروشی' دلالی یا پھر بدمعاشی جن کا ذریعہ معاش بنتی ہے...... مرشد بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ہاں البتہ قدرت نے حالات وواقعات کا جو کھیل رچایا تھا' اس کی بدولت مرشد کے وجود کی ترکیب میں ان لطیف جذبوں کا آہنگ یکجا ہو گیا تھا جو

جذباتی حالت کی معراج ہوا کرتے ہیں۔

خلوص...... دیانت...... ادب...... ایثار...... خدمت...... شکر گزاری...... کیفیت واحساس کی صورت وجود رکھنے والے محبت کے یہ بنیادی اجزاء دودھ اور خون کے ذریعے اس کے جسم وجاں کا حصہ بنے تھے۔



''حسن آرا' ہم خود کو گناہ گار اور...... مجرم محسوس کرتے ہیں۔'' سماتوں کے راستے دل وجان میں اترتی ہوئی اس بھاری مردانہ آواز پر اس نے اپنی سیاہ لانبی پلکوں کی جھالریں اٹھا کر دیکھا...... میر ارشد اللہ گاؤں تکیے سے ٹیک لگائے ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ کسی مقدس خواب کی تعبیر کی طرح...... ایک روشن اور ذی شان حقیقت کی صورت...... وہ بے خودسی ہو کر انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''گزشتہ تین روز سے ہم بے یقینی اور احساس خطا کے درمیانی برزخ میں معلق ہیں...... ذہن ودل میں اذیت وکرب کے بھنور کیسے کروٹیں بدلتے ہیں یہ لفظوں میں بیان کر پانا ہمیں ممکن نہیں لگتا۔'' وہ حسن آرا کے چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی وارفتگیوں سے قطعی بے خبر' اپنے ہی اندر کہیں ڈوبے' سامنے والی کھڑکی پر ہولے ہولے سے لہراتے ریشمی پردے پر نظریں جمائے' ایک استغراقی عالم میں بولے جارہے تھے۔

''ہم یقین ہی نہیں کر پارہے ہیں کہ اس رات ہم جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے تھے کہ انسانی صف سے نکل کر ساری رات یہاں ایک حیوان بنے رہے...... حیوانی جذبوں کی غلامی میں وقت گزارتے رہے' ہم اپنے آپ سے شرمندہ ہیں حسن آرا...... اس قدر شرمندہ ہیں کہ یہ شرمندگی ہمارے گلو کا طوق بن کر رہ گئی ہے...... گھٹن ایسی ہے کہ ہم ٹھیک سے سانس تک نہیں لے پارہے ہیں' آپ یقین کیجیے کہ ہم ڈھنگ سے سو تک نہیں پائے۔''

''نیندیں تو آپ ہماری آنکھوں سے سمیٹ کر لے گئے ہیں میر صاحب...... اب بھلا یہ کس طرح بیان کریں کہ ایک ایک پل ہم نے کس طرح دھڑکنیں شمار کرتے ہوئے بتایا ہے اور ہر دھڑکن کے ساتھ بس ایک دعا...... ایک التجا کہ بس ایک دفعہ...... صرف ایک بار کسی طرح پھر سے آپ کی زیارت نصیب ہو جائے۔ چند لمحے پھر سے آپ کے قدموں میں جینے کا موقع میسر آجائے...... آج سے پہلے تک ہمیں دعاؤں پر بھی کوئی ایسا خاص یقین نہیں تھا مگر آج...... آج ہم کھلی آنکھوں دعا کا معجزہ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کی کرم نوازی' اس کی عطا کو جی رہے ہیں۔''

اس کے اندر کا سچ پورے خلوص اور دیانت داری سے اس کی زبان تک آپہنچا تھا۔ میر ارشد اللہ نے نظروں کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے حسن آرا کی طرف دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں اشتیاق چمک رہا تھا۔ ایک مسرت آمیز اطمینان اس کے نوخیز چہرے میں جیسے گندھا ہوا تھا۔

وہ ایک طوائف زادی تھی۔ خود بھی طوائف ہی تھی۔ ایک ایسی نوعمر طوائف جس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی ابھی ابتدا ہی کی تھی۔ اس نے اپنی حیثیت اور مرتبے کا ابھی پہلا خراج ادا کیا تھا اور اس سے یہ خراج وصول کرنے والے خود میر ارشد اللہ تھے...... وہ خود ہی اس کم سن طوائف زادی کی عصمت اور دوشیزگی کے گواہ تھے اور...... خود ہی لٹیرے بھی۔ چند روز پہلے گزری رات کے نشہ پرور' وصل آگیں لمحات اچانک ان کے اندر سے ابھر کر پردہ تصور پر پھولوں کی صورت کھل آئے تو انہوں نے حسن آرا کے مسکراتے ہوئے اجلے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

''حسن آرا...... آج ہم آپ سے صرف کچھ کہنے سننے کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔''

''کنیز ہمہ تن گوش ہے ارشاد کیجیے...... یا پھر حکم کیجیے۔''

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میر صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

''ہم ایک روایت پرست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی آج تک کی خاندانی تاریخ میں ہم وہ پہلے شخص ہیں جو کسی کوٹھے تک پہنچے ہیں...... ہم بھی اس رات اپنی زندگی میں پہلی بار یہاں...... اس علاقے اور اس کوٹھے پر آئے تھے' کیوں؟ کیسے؟ یہ ایک الگ بحث ہوگی' ہاں ہم اپنے حواسوں میں بہرحال نہیں تھے' شاید اسی لیے ہم اپنی ان اقدار...... ان حدود کو پھلانگ بیٹھے جنہیں ہمارے یہاں جان ومال سے بھی زیادہ اہم گردانا جاتا ہے۔ خود ہم نے کبھی خواب وخیال تک میں ایسا نہیں سوچا تھا کہ ہماری اپنی

زندگی میں کبھی کوئی ایسا کمزور لمحہ...... ایسا وقت آئے گا کہ ہم اپنی مرضی سے اپنی شرافت، اپنی غیرت کو یوں پامال کریں گے...... اپنی خاندانی حرمت اور کردار کا فخر اس طرح گنوا بیٹھیں گے۔'' انہوں نے ذرا توقف سے کام لیا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی فریفتہ نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل کے نہاں خانوں میں جا بسا تھا۔ حالانکہ وہ تو اس کے متعلق ٹھیک سے جانتی بھی نہیں تھی کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ بس وہ آیا اور پہلی ہی نظر میں حسن آرا نے اپنے اندر اس گواہی کو بے دار ہوتے محسوس کیا کہ یہی وہ شخص ہے جو اس کے ان چھوئے' خالص جذبوں سے سیراب ہونے کا حق دار ہو سکتا ہے...... وہ شخصیت ہی کچھ ایسی تھی' گویا کہ کسی غیر مرئی حقیقت کا عکس...... کسی دیوتا کا انسانی روپ اور اس نے اس دیوتا کے چرنوں میں اپنا آپ ارپن کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا تھا جو عورت ذات کے پاس کسی ایک مرد کی امانت ہوتا ہے اور جسے کھو دینے کے بعد عورت خاموشی سے طوائف بننا گوارا کر لیتی ہے۔

''آج ہم اپنی ہی نظروں میں نااہل اور معتوب ٹھہر چکے ہیں۔'' میر ارشد اللہ اپنے سرخ وسپید چہرے پر گمبھیرتا سمیٹے بول رہے تھے۔ ''ہم مجرم ہیں اپنے خاندان...... اپنے لوگوں کے...... اپنی شریک حیات کے جس کا حق ہم نے یہاں آپ کے ساتھ بانٹا ہے...... ہم اپنی اولاد' اپنے دونوں بچوں کے بھی مجرم ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ ہم اللہ کی اور آپ کے بھی مجرم اور گناہ گار ہیں اور...... اور خطا و گناہ کا یہی احساس ہمارے لیے سوہان روح بن کر رہ گیا ہے۔ ہم...... ہم آئینہ دیکھتے ہوئے خود سے بھی ندامت محسوس کرتے ہیں حسن آرا......'' وہ ان کے لہجے کی کربناک دیانت پر تڑپ اٹھی۔

''حسن آرا کی جان آپ پر قربان میر صاحب...... آپ اس اذیت کی پرورش کرتے ہوئے کیوں خود کو ہلکان کیے ہوئے ہیں' آپ نے کسی زور و جبر سے تو کام نہیں لیا' ہم نے اس رات اپنی خوشی اور رضا سے اپنا آپ حضور کے سپرد کیا تھا...... دل و جان سے آپ کو اپنا حق دار تسلیم کیا تھا۔ آپ کی قربت میں گزرے وہ لمحات ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں اور باخدا ہم آخری سانس تک ان لمحات کو اپنی روح کی گہرائیوں میں کسی مقدس امانت کی طرح چھپا کر محفوظ رکھیں گے۔'' میر ارشد اللہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور مضطربانہ انداز میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کے روئیں روئیں سے ان کی بے چینی اور بے سکونی مترشح تھی۔ چند لمحے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہنے کے بعد وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

کھڑکی کے سامنے کھنچا ہوا ریشمی پردہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک طرف ہٹایا اور کھڑکی سے باہر تاحد نظر پھیلے ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھنے لگے' کمرے کے اندر ایک مضطرب سی خاموشی ہلکورے لیتی رہی' وہ منتظر تھی کہ میر صاحب کچھ کہیں گے مگر وہ تو کھڑکی میں کھڑے باہر آسمان کی بے کراں وسعتوں میں جانے کیا دیکھنے' تلاشنے کی سعی میں محو تھے۔

''میر صاحب......'' ہوا کا ایک دھلا نکھرا سا جھونکا کھڑکی سے گزر کر ان کے چہرے سے ٹکرایا۔

''آپ کی اپنی کوئی مجبوری کمزوری رہی ہوگی...... اور ہماری تو خیر تقدیر ہی یہی ٹھہری...... ہم جانتے ہیں کہ ہم آپ کے قابل نہیں' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آپ وہ پہلے انسان ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں...... ہمارے وجود سے واقف ہوئے ہیں۔ ہم نے سب کچھ آپ کی نذر کر دیا۔ آپ اگر یقین کر سکیں تو کر لیں کہ اس سب میں کہیں کچھ بھی جھوٹا یا...... جُوٹھا نہیں تھا...... ہمیں اپنی حیثیت اور اوقات کا بھی بخوبی ادراک ہے' اس کے باوجود ہم خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ اگر ہم آپ کی کسی مشکل یا پریشانی میں کسی بھی طرح...... کچھ کام آ سکتے ہیں تو آپ بس اشارہ کر کے دیکھیے...... یہ کنیز آپ کی ایک مسکراہٹ کے لیے اپنی سانسیں تک قربان کر سکتی ہے۔'' وہ ایک طوائف زادی' ایک آدھی طوائف کے اندر جینے والی لڑکی کا پورا سچ تھا۔

میر ارشد اللہ نے اپنی جگہ سے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا...... چند لمحے گہری نظروں سے دیکھتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

''حسن آرا...... ہم یہاں آپ کی تضحیک کرنے یا اپنا اعلیٰ حسب نسب جتانے کی نیت سے ہرگز نہیں آئے۔ نہ

ہی اس ساری گفتگو سے ہمارا کوئی ایسا مقصد ہے‘ یہ سب تو ہم نے آپ کو اپنی ذہنی وجذباتی حالت سمجھانے کی غرض سے کہا ہے...... شاید کہ آپ کچھ اندازہ کر پائیں کہ ہم کس عذاب کا شکار ہو چکے ہیں...... مختصر الفاظ میں کہنا پڑے تو ہم یوں کہیں گے کہ اس عذاب...... اس وحشت واذیت کو سینے میں دبائے جیئے چلے جانا ہمارے لیے قطعی ممکن نہیں اوراس سے نجات کے ہمارے سامنے صرف دوراستے ہیں‘ اول یہ کہ ہم اپنی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے خود کو شوٹ کرلیں...... بزدلی اور حرام کی موت مرجائیں جو کہ ہمیں بالکل بھی گوارا نہیں...... دوسرا راستہ ایسا ہے کہ اس کا ممکن ہونا نہ ہونا آپ پر منحصر ہے‘ اس کا انحصار آپ کی مرضی پر ہے اور آج یہاں...... آپ کے روبرو ہم پھر سے موجود ہیں تو صرف اسی بنا پر...... آپ کی مرضی اور رضا جاننے کی غرض سے۔‘‘ وہ دھیمے لہجے میں کہتے نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

’’آپ بس حکم دیجیے‘ ہم آپ کے لیے کیا کرسکتے ہیں؟‘‘ وہ سوالیہ انداز میں بولی۔ اس بات کی اسے توقع ہی نہیں تھی...... کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ میر ارشد اللہ کیا کہنے والے ہیں...... وہ کیا ٹھان کرآئے ہیں؟ وہ چند لمحے بالکل بے حس وحرکت اور خاموش کھڑے رہے‘ پھر ان کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

’’ہم آپ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؟‘‘ شاید کوئی کانچ کا برتن گرا تھا‘ ایک چکنا چوری کراہ نے اس کی سماعت سے ٹھوکر کھائی تھی۔ ایک ڈری گھبرائی کپکپی اس کے وجود سے لپٹی اور کھڑکی کی طرف سرک گئی...... باہر کچھ ہلچل‘ کچھ افراتفری سی تھی...... وہ ہڑبڑا کر پلنگ سے اٹھ بیٹھی‘ ٹھیک اسی وقت کمرے کا دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور یکے بعد دیگرے چار پانچ حواس باختہ سی صورتیں اندر لپک آگئیں۔ آگے آگے نزہت بیگم اور استاد مبارک علی خان تھے‘ پیچھے ہاشو کان ایک ٹوٹے پھوٹے بندے کو سہارا سا دیے اندر داخل ہوا...... ان کے ساتھ ہی ٹڈا اچھو بھی تھا۔ وہ بے اختیار پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے کھڑا منظر کسی سنگین گڑبڑ کا مظہر ہی تو تھا۔

’’اے حسن آرا یہ...... یہ دیکھ اپنے میر صاحب کا تازہ

کارنامہ..... دیکھ ذرا۔'' نزہت بیگم نے لپک کر اسے بازو سے آ تھاما۔

''دیکھ کیا حالت کردی ہے اس بے چارے کی۔''

حسن آرا نے دیکھا۔ ''بے چارے'' کا بایاں کھنا' کھلا ہوا تھا' جس میں سے نکلنے والا خون اس کے بائیں رخسار' ٹھوڑی اور گردن کے کھلے حصے کو رنگین بنائے ہوئے تھا' بائیں بازو کو اس نے جس زاویے اور ادا سے سمیٹ رکھا تھا اس سے ظاہر تھا کہ اگر بازو ٹوٹا نہیں بھی ہے تو اندر سے ہڈی کریک ضرور ہو چکی ہے' بے چارے کو دائیں طرف سے ہاشو نے سہارا دے رکھا تھا' یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ادھر والی ٹانگ بھی خاصی متاثر ہے۔

''چل حسن آرا چل ادھر چار بندے اور بھی اس نے دبوچ رکھے ہیں۔ چل کے ان کی جان بخشی کروا' ارے استاد کالے کے بندے ہیں' ان میں ایک..... ایک تو ان کا چھوٹا بھائی ہے' مار مار کے بندر بنا چکا تینوں چاروں کو..... تو جلدی سے چل میرے ساتھ۔'' نزہت بیگم نے ہانپتے ہوئے انداز میں چند جملوں سے صورت حال کی سنگینی واضح کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا تو حسن آراء نے بازو چھڑا لیا۔

''اماں..... مجھے کدھر لے جا رہی ہو؟''

''ارے..... تو چلے گی تو ان کی جان چھوٹے گی نا۔''

''مگر میں کیوں جاؤں۔'' کمر میں ایک ٹیس سی اٹھی اور وہ دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''یہ بھی خوب کہی تم نے.....'' نزہت بیگم نے متعجب انداز میں تالی بجائی۔

''اور کون ہے یہاں' جس کی تیرے میر صاحب مانیں گے اور پھر تجھے اس پر رحم نہیں آتا کیا..... ابھی تو وہ مار اپیٹی کر رہا ہے' کل استاد کالے یا اور کسی ایسے ہی کی لپیٹ میں آ گیا تو آنکھوں میں گھونسے دے دے کر روؤ گی۔'' نزہت بیگم اس کے برابر ہی پلنگ پر ڈھے سی گئی۔ وہ اچھی خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''او..... گھوڑے کی شکل والے..... پانی پلا مجھے کمینے' کھڑا کیا دیکھ رہا ہے تو؟'' نزہت بیگم نے اچھو کو ڈپٹا پھر حسن آرا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تیرے میر صاحب نے بڑوں بڑوں کے ساتھ پنجے پھنسا لیے ہیں..... کسی دن کوئی نقصان ہو جائے گا حسن آرا تو میری بات یاد رکھنا۔''

''استاد کالے بھی تو کوئی کم چیز نہیں ہے بائی جی۔'' ہاشو خان بولا اور مرشد باوا نے اس کے بندوں کے ساتھ ساتھ اس کے سگے بھائی کو بھی پھینٹ کر رکھ دیا ہے۔ ادھر..... جس مکان کو اس نے اپنی بیٹھک بنا رکھی ہے' اس کے باہر گلی میں چاروں کو مرغا بنا رکھا ہے..... اچھا خاصا تماشہ لگا ہوا ہے اور مرشد باوا' اب اپنی کھیڑی سے ان کی چھترول کروا رہا ہے۔''

''چھترول کروا رہا ہے تو کوئی وجہ بھی تو ہو گی ناں..... ان لوگوں نے چھترول کروانے والی کوئی حرکت کی ہو گی۔'' حسن آرا نے مغروب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ضبط کی حدوں پر کھڑا اپنے دردوں کو پی رہا ہے۔

''اے ہے..... حسن آرا' تجھے ذرا بھی کوئی پروا' پریشانی نہیں۔'' نزہت بیگم اس کی بے فکری اور اطمینان پر حیران ہوئیں۔

''کس بات کی پریشانی اماں؟'' اس نے الٹا نزہت بیگم کی بات پر متعجبانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''مرشد..... اب کوئی ناسمجھ بچہ نہیں ہے..... اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے اور اچھے بروں سے نمٹنا بھی جانتا ہے' پھر بھلا مجھے کس بات کی پروا یا پریشانی.....'' نزہت بیگم نے جھنجلائی ہوئے انداز میں اپنی پیشانی پیٹی۔

''میرا ہی دماغ خراب ہے جو تیرے ساتھ مغز ماری کرنے بیٹھ جاتی ہوں..... بھلا آج تک پہلے کبھی تم دونوں ماں بیٹے کو میں کوئی بات منوا' سمجھا سکی ہوں جو اب بیٹھی بک بک کر رہی ہوں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر اب ان بندوں کا کیا کرنا ہے جنہیں مرشد باوا نے وہاں..... اپنی بیٹھک کے سامنے کان پکڑا رکھے ہیں کہ جب تک استاد کالے خود چل کر نہیں آ جاتا' وہ انہیں چھوڑے گا نہیں..... معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔'' ہاشو خان نے الجھن زدہ لہجے میں اندیشے کا اظہار کیا۔

"بگڑ جائے گا تو کیا..... حسن آرا کے میر صاحب ہیں نا..... معاملہ بگڑے گا تو وہ خود ہی سدھار لیں گے۔" نزہت بیگم نے زہر خند سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاشو..... تم دیکھنا..... دیکھ لینا' ایک دن ان ماں بیٹے کی وجہ سے ہم پر بھی کوئی بڑی آفت' بڑا عذاب نازل ہوگا..... ان کی وجہ سے ہمیں بھی پسنا پڑے گا..... دیکھنا تم..... دیکھ لینا۔" وہ جلے کٹے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

"حسن بٹیا..... تم ہمارے ساتھ چل کر ان کی جان چھڑاؤ' بہت بے عزتی اور جوتے سہہ چکے ہیں وہ سب۔" استاد مبارک علی خان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔

"کوئی نہیں استاد جی' غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا تو خود ہی چھوڑ دے گا' آپ ایسے پریشان نہ ہوں۔"

"نہیں چھوڑے گا بائی جی....." ہاشو خان نے فوراً مداخلت کی۔ "وہ صاف صاف کہہ چکا ہے کہ استاد کالے آئے گا تو خود اپنے ان گندے انڈوں کو لے کر جائے گا ورنہ یہ سب یہیں..... اسی حالت میں رہیں گے ایسے....." ہاشو خان نے مضروب کی طرف اشارہ کیا..... "اسے بھی صرف اس لیے چھوڑا گیا ہے کہ یہ جاکر استاد کالے تک مرشد کا پیغام یا فیصلہ پہنچادے اور اس نے بتایا ہے کہ استاد لاہور میں ہے ہی نہیں..... آپ جانتی ہیں کہ مرشد باوا اپنے کہے سے پھرنے والا نہیں اور آپ کے علاوہ وہ کسی اور کی سنے گا بھی نہیں لہٰذا آپ کچھ کریں ورنہ کل صبح تک ان میں سے کوئی ایک آدھ تو جان ہار بیٹھے گا اور ایسے میں پھر..... معاملہ بڑا سنگین ہوجائے گا۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد حسن آرا نے استاد جی کی طرف دیکھا۔

"استاد جی..... جھگڑا ہوا کس بات پر تھا؟"

"وہ بائی جی..... دراصل استاد کے چھوٹے بھائی جی یہاں نہیں رہتے۔" استاد جی سے پہلے مضروب خود بول پڑا تھا۔ "وہ گاؤں سے آئے ہیں' مرشد باوا کو پہچانتے نہیں تھے۔ اس لیے بدتمیزی کر بیٹھے اب غلطی نکلے استاد کی تھی اور مرشد باوا نے ساتھ ہماری بھی مٹی رول کے رکھ دی..... قسم ہے جو ہماری ایک بھی سنی ہو تو..... اب شرط یہ رکھی ہے کہ استاد کالے خود یہاں آکر پوری بات سنے..... اپنے

بندوں کی غلطی تسلیم کرے اور ان کا ذمہ دار و سرپرست ہونے کے ناتے اپنے بندوں کی غلطی پر معافی مانگ کر جائے اور جب تک وہ آ نہیں جاتا یہ لوگ یونہی مرغا بن کر کھڑے رہیں گے..... اب استاد تو گیا ہوا ہے کراچی' وہ کھڑے کھڑے کیسے پہنچ سکتا ہے..... اب ایسے میں آپ ہی بتائیں کہ باوا کے سامنے کون آئے؟ کون سمجھائے اسے؟" اس نے کراہوں اور آہوں کے درمیان گویا مکمل صورت احوال کہہ سنائی۔

حسن آرا کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور سوچ کے تاثرات ابھر آئے تھے' کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ استاد جی سے مخاطب ہوئی۔

"استاد جی..... آپ جائیں اور اسے میرا کہیں کہ فوراً میرے پاس آئے' جہاں اور جس حال میں ہے اٹھ کر چلا آئے' میں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔" حسن آرا بخوبی جانتی تھی کہ اس کا پیغام سنتے ہی وہ فوراً سے پہلے چلا آئے گا۔

"ٹھیک ہے' میں جاتا ہوں..... آؤ بھئی۔" استاد جی نے ہاشو کو اشارہ کیا اور وہ لوگ کمرے سے نکل گئے۔

حسن آرا پھر سے کمرے میں تنہا رہ گئی۔ پر اس نے نظریں اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا' ریشمی پردہ ہولے ہولے لہرا رہا تھا۔ میر ارشد اللہ کا کہیں کوئی شائبہ تک نہیں تھا..... کچھ دیر پہلے تک کمرے کی فضا میں بھرا سارا طلسم کہیں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا..... ہاں البتہ اس کے من کی بستی پر طاری فسوں جوں کا توں تھا..... برسوں بیت چکنے کے باوجود آج بھی میر ارشد اللہ سے پہلی ملاقات..... پہلی نظر اس کے اندر زندہ تھی..... تازہ تھی۔

کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز میں دوبارہ پلنگ پر دراز ہوگئی..... ایک بار پھر وہ ماضی میں جا گری تھی۔

❁.....☆.....❁

نندی پور کے جاگیردار اکبر علی خان کا گھرانہ ایک روایتی جاگیردار گھرانہ تھا۔ اس گھر کے افراد تو روایتی جاگیردارانہ مزاجوں کے مالک تھے ہی' اس گھر کے ملازموں اور مصاحبوں تک کے طور اطوار سے ایک کروفر' ایک رعونت ٹپکا کرتی تھی۔

ابھی چند دن پہلے ہی چوہدری اکبر علی خان نے اپنے منجھلے بیٹے جمال علی اکبر کی منگنی کی تھی۔ لاہور کے کسی بہت بڑے صنعت کار کے ہاں..... شادیوں پر بھی ایسے کیا ہنگامے اور جشن ہوتے ہوں گے جو چوہدری جمال علی اکبر کی منگنی پر ہوئے تھے۔ پورے نندی پور کی دعوت کی گئی تھی۔ علاقے کے پورے تھانے کو الگ دعوت کھلائی گئی تھی۔ تین چار شب و روز ہنگامے جاری رہے۔ حویلی اور ڈیرے پر مہمانوں کا آنا جانا لگا رہا تھا۔ آس پاس کے بھی دیہاتوں کے زمیندار اور وڈیرے حاضری لگوانے آئے تھے۔ اس دوران' کچھ سیاسی لوگوں کے ساتھ ساتھ تین چار انگریز شکلیں بھی دکھائی دی تھیں۔ مہمانوں کے دل بہلاوے اور تفریح طبع کے پیش نظر لاہور سے مسخرے اور طوائفیں بلائی گئی تھیں..... ڈیرے پر شراب و شباب کی محفلیں سجائی گئیں۔ آتش بازی کے ساتھ ساتھ ہوائی فائرنگ نعرے اور بڑکیں..... تین چار روز مسلسل اسی طرح کے ہنگامے اور ہلڑ بازی جاری رہی تھی۔

لوگ ایک سال گزر چکنے کے باوجود ابھی تک چوہدری فرزند علی اکبر خان کی شادی کی دھوم دھام کے تذکرے کرتے تھے اور اب چوہدری جمال علی کی منگنی کے یہ جشن.....

نندی پور کے سبھی لوگ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے سمجھتے تھے کہ منگنی تو بس ایک بہانہ ہے ورنہ یہ سب کھیکھن تو جاگیرداروں کے معمول ہی تھے..... خدا نے جتنے کھلے دل سے ان کو دولت' طاقت اور اختیار سے نوازا تھا' جاگیردار اتنی ہی کشادہ دلی اور لاپروائی سے ان کا استعمال بھی کرتے تھے..... اسی طرح کے مشاغل کی بناء پر گاؤں کے لوگ جاگیرداروں سے خاصے بدظن تھے..... دل سے انہیں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ منہ ملاحظے پر بھی جھک کر یا ہاتھ جوڑ کر ان لوگوں کو سلام کرتے..... غریب اور مجبور جو تھے۔

انہی مجبوروں کی بستی میں ایک گھرانہ ایسا بھی تھا جس کی کبھی کوئی مجبوری یا کمزوری سامنے نہیں آئی تھی۔ گاؤں والوں نے آج تک اس گھر کے کسی بھی فرد کو' جاگیرداروں

کے کسی فرد کے سامنے نہ تو جھکتے دیکھا تھا اور نہ ہی ہاتھ جوڑ کر سلام پیش کرتے۔ اس خودداری کے باعث یہ گھرانہ جاگیرداروں کے دلوں میں کھٹکتا بھی تھا...... اور یہ تھا سید صلاح الدین شاہ کا گھرانہ...... نندی پور کا معزز ترین اور محترم گھرانہ۔

سید صلاح الدین شاہ بہت بڑے تو نہیں البتہ خوش حال زمیندار تھے۔ زمینی معاملات دونوں بڑے بیٹوں کے سپرد کرکے خود انہوں نے مسجد کی امامت سنبھال لی تھی۔ کسی قسم کی کوئی تنگی محتاجی تھی نہیں، گھر میں خوشحالی تھی' بیوی خدمت گزار اور بچے فرماں بردار تھے سو وہ ہر وقت خدا کے شکر گزار رہتے تھے۔ آسودہ حال، مطمئن اور فطری طور پر خوش مزاج آدمی تھے اس لیے کبھی کسی سے کوئی تلخی یا بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں البتہ دوسروں کی مشکلات' باہمی رنجشوں اور پریشانیوں میں وہ ایک صالح کی طرح مداخل ہوجایا کرتے تھے۔ گاؤں والے بھی ان کی عزت کرتے...... ان کی مانتے سنتے تھے۔

چوہدری اکبر علی خان کے چار بچے تھے اور سید صلاح الدین شاہ کے جگر گوشے بھی چار ہی تھے۔ دونوں طرف تین تین بیٹے تھے اور ایک ایک بیٹی...... گاؤں میں دو اسکول تھے ایک لڑکوں کا' ایک لڑکیوں کا...... دونوں ہی پرائمری اسکول تھے۔ بچے اپنی اپنی عمروں کے مطابق ساتھ ساتھ پڑھتے ہوئے اکٹھے بڑے ہوئے تھے۔ اسکول ہی کے دنوں میں جاگیردار کی بیٹی نازیہ اکبر اور سید زادی حجاب بی بی کے درمیان دوستی کا تعلق بنا اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔

اسی طرح سید صلاح الدین کے چھوٹے بیٹے سید اسرار حیدر اور جاگیردار زادے جاوید علی اکبر کے درمیان دوستی قائم ہوئی۔ گو کہ ان کی دوستی نازیہ اور حجاب بی بی جیسی مثالی نہیں تھی پھر بھی وہ دونوں اچھے دوست ضرور تھے۔ باقی جو...... دونوں گھروں کے بڑے تھے' ان کی بات دوسری تھی۔ ان کی آپس میں کوئی خاص لام قاف نہیں تھی۔

جاوید علی تیسری جماعت تک آ کر تھک گیا تھا البتہ نازیہ اور حجاب بی بی نے پرائمری ایک ساتھ پاس کی تھی۔ اس کے بعد نازیہ نے قرآن پاک ترجمے اور تفسیر سمیت پڑھنے سمجھنے کی غرض سے حجاب بی بی کے گھر آنا جانا شروع کردیا۔ گاؤں کی اور لڑکیاں بالیاں بھی حجاب کی والدہ سردار بی بی کے پاس قرآن و تفسیر پڑھا کرتی تھیں۔ سو یہ مدارج بھی دونوں سہیلیوں نے ساتھ ساتھ ہی طے کیے۔

بچپن گزرا' نوجوانی کے موسموں نے اترنا شروع کیا تو دل و جاں کو گدگدانے والے ان ہی موسموں کے ساتھ چھوٹے شاہ جی سید اسرار حیدر بھی چپکے سے نازیہ اکبر کے دل میں اتر گئے۔ وہ آتی تو اس کی نظریں پورے گھر میں اسرار حیدر کو کھوجتی رہتیں...... اسرار نظر آجاتا تو نازیہ کی نگاہیں اس پر صدقے واری ہوتے نہ تھکتیں...... اسرار نے بھی جلد ہی ان آنکھوں کی روشنیوں کو دیکھ لیا اور کسی خودکار ذریعے سے ان روشنیوں کی جگمگاہٹ اسرار کی آنکھوں میں بھی آچمکی...... بچے نہیں رہے تھے مگر ابھی نوجوان ہی تو تھے۔ زندگی اور معاشرتی نظام کی تلخ حقیقتوں کی ابجد سے ابھی ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا لہٰذا آنکھیں بولنے لگیں' آنکھوں ہی آنکھوں میں آشنائی نے رنگ بدلا...... دوستی ہوئی...... مسکراہٹوں میں کلیاں چٹخیں' آوازوں میں ترنم اور ہنسی میں ایک کھنک بیدار ہوآئی۔

حجاب بی بی پر پہلے نازیہ کی حالت منکشف ہوئی اور پھر اسرار حیدر کا حال بھی کھل آیا تو وہ دنگ رہ گئی۔ نازیہ تو اس کی ہم عمر تھی البتہ اسرار ان دونوں سے سال ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ حجاب بی بی نے اپنے تئیں الگ الگ دونوں کی کلاس لی' دونوں کو سخت سست سنائیں...... نازیہ کو اس کے باپ بھائی اور اسرار کو اپنے باپ بھائی یاد دلائے...... دونوں کو آرام پیار اور نرمی کے ساتھ ساتھ بڑوں کے ڈراوے سے پابند کرنے کی کوشش کی مگر...... ان فطری جذبوں کو بھلا کون پابند کرتا جو پابند ہوتے ہی نہیں...... کچھ مانتے سنتے ہی نہیں...... اور نہ ہی کچھ جاننا سمجھنا گوارا کرتے ہیں۔ اس معاملے کی شروعات ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے۔ حجاب بی بی بدستور ان دونوں کے درمیان حائل تھی اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان اظہار و اقرار کے مرحلے طے پاچکے تھے اور گزشتہ کچھ عرصے سے تو وہ کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر ایک دوسرے سے ملنے بھی لگے تھے...... لیکن ان کی رازدارانہ ملاقاتوں کا فی الوقت کسی کو

معلوم نہیں تھا۔

اس صبح صحن میں دری پر دسترخوان سجائے، سبھی بیٹھے ناشتے میں مصروف تھے کہ سید زوار حیدر کی شادی کی بات چل نکلی۔ شروعات ماں جی نے کی تھی۔

''بس اب زوار کی بات تو ہمیں پکی کر دینی چاہیے۔ باجی اور بھاہ جی دونوں ہی ہماری طرف سے اشارے کے منتظر ہیں۔''

''تم نے کوئی اشارہ دے تو نہیں دیا؟'' سید صلاح الدین نے لسی کا گھونٹ لیتے ہوئے سردار بی بی کی طرف دیکھا۔

''لیں...... آپ کی اجازت کے بغیر کیسے کوئی بات کر سکتی ہوں بھلا؟''

''ماں جی...... یہ مکھن ادھر کیجیے ذرا۔'' کرار حیدر کے ٹوکنے پر ماں جی نے مکھن والا پیالہ اس کی طرف سرکا دیا۔

''خدیجہ کروشیا وغیرہ کا کام بھی سیکھ چکی ہے۔ سارا گھر بار سنبھالتی ہے ماشاء اللہ بڑی ہی سلیقہ مند بچی ہے۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر اس بچی کا قد بہت چھوٹا ہے۔ اپنے زوار پتر کے ساتھ اس کا جوڑ کچھ جچے گا نہیں۔''

''تو پھر رضیہ کی بات کر لیتے ہیں اس کا قد تو ٹھیک ہے اور بھاہ جی مرید حسین کی سکینہ بھی ہے...... اس نے تو پرائمری تک پڑھا بھی ہے۔ خوبصورت بھی ہے اور سگھڑ بھی۔''

''نہیں بھئی...... اس کی تو عمر بہت کم ہے وہ تو اپنے اسرار کی ہم عمر ہے...... زوار کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔''

''آپ بھول رہے ہیں، اسرار کی ہم عمر تو ثمینہ ہے، سکینہ تو اپنی حجاب سے بھی چھ مہینے بڑی ہے۔''

''تو بھی زوار کا جوڑ تو نہیں بنتا۔'' انہوں نے لسی کا آخری گھونٹ بھرا اور گلاس رکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں البتہ کرار اور سکینہ کا جوڑ بنتا ہے...... اسرار اور ثمینہ بھی ٹھیک رہیں گے۔''

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں بابا سائیں میرا جوڑ نہ ڈھونڈیے آپ۔'' اپنے ساتھ ثمینہ کا ذکر آتے ہی اسرار فوراً بول پڑا۔ حجاب نے گھور کر دیکھا۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ اسرار کے اعتراض کی اصل وجہ کیا ہے۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے بابا...... بھاہ جی اور ویر جی کی شادیاں ایک ساتھ کر دیں اور اسرار کی ثمینہ سے منگنی یا نکاح کر دیتے ہیں پھر دو چار سال بعد رخصتی لے لیں گے۔'' حجاب بی بی نے فوراً رائے دی۔ زوار حیدر کو بھاہ جی کہتی تھی اور منجھلے بھائی کرار حیدر کو ویر جی...... اسرار چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اسے سیدھے اسرار کہا کرتی تھی۔

''دیکھو باجی، مجھے اس معاملے میں گھسیٹنے کی کوشش نہیں کرو...... بات بھاہ جی کی ہو رہی ہے تو انہی تک رہنے دو۔'' اسرار نے شکوہ کناں نظروں سے حجاب بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے بھی ابھی آزاد ہی رہنے دیں، بس زوار بھائی ہی کی بات پکی کریں آپ لوگ۔'' کرار نے نوالہ چباتے چباتے اظہار کیا تھا۔

''لیں کر لیں بات...... اب بھاہ جی سے بھی پوچھ لیں کہ ان کی کیا مرضی ہے۔'' حجاب بی بی نے چاٹی سے لسی نکالتے ہوئے زوار حیدر کی طرف دیکھ کر کہا جو خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔

سردار بی بی سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی جو مسکرا رہے تھے۔

''بھئی، میرے ذہن میں تو نظام بھائی کا گھر تھا...... اب تم لوگ دیکھ سوچ لو...... جیسے تم سب مشورہ دو ویسے کر لیتے ہیں۔'' سید صلاح الدین کی بات پر سردار بی بی فوراً ہی بول پڑی۔

''نہیں شاہ جی...... وہاں تو بچپن ہی سے آپ نے حجاب کی نسبت طے کر رکھی ہے، وہاں نہیں...... یہ وٹے سٹے والے رشتے تو بڑی پریشانیوں کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔'' اپنا ذکر آتے ہی حجاب بی بی فوراً سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پردہ تصور پر لمحہ بھر کے لیے ایک خوبرو اور وجیہہ سراپا جھلملایا اور دل میں ایک گدگداہٹ سی ہوئی۔ زوار حیدر ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''چل کرار...... کھڑا ہو جا۔''

''بس بھاہ جی، ابھی اٹھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھر...... چھپری ہی پر آ جانا...... اور دیکھنا دیر نہ کر دینا...... میں پانی کھول کے شہر چلا جاؤں گا۔ بیج

بھی اٹھانا ہے اور کھاد بھی۔'' زوار حیدر نے صحن کے کونے میں موجود ڈربے کی چھت سے کسی اٹھا کر کندھے پر ٹکالی۔

''آپ پہنچیں، میں بھی بس آپ کے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔''

''اچھا ماں جی...... بابا سائیں، چلتا ہوں۔'' زوار حیدر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو سید صلاح الدین نے اسے مخاطب کیا۔

''زوار پتر...... تو اپنا ووٹ تو دیتا جا...... خالہ کے گھر بات پکی کریں تیری یا...... مامے کے؟'' ان کے سوال پر زوار حیدر نے ایک ذرا رک کران کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگ بس صلاح مشورے ہی کرتے رہنا۔''

''ککڑوووں...... کڑوووں......'' مرخاب (مرغا) نے جیسے اس کی تائید میں باآواز بلند نعرہ لگایا تھا۔ کرار، اسرار اور حجاب بی بی تینوں بے ساختہ ہنس پڑے اور زوار حیدر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

''سن لیا آپ نے...... اب کیا کہتے ہیں؟'' سردار بی بی نے مسکراتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

''اب تو واقعی فوری طور پر سنجیدگی سے کچھ کرنا پڑے گا بھئی......'' سید صلاح الدین نے داڑھی سہلاتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو کہ ابھی تیاری کرو...... صغراں اور مرید حسین، دونوں کی طرف چکر لگا آتے ہیں...... ایک ایک نظر بچیوں کو پھر دیکھ لیں...... پھر ان ہی دو چار دنوں کے اندر دونوں میں سے کسی ایک جگہ بات پکی کر دیتے ہیں۔''

سردار بی بی تو جیسے شوہر کے اشارے ہی کی منتظر تھیں، دس منٹ بعد ہی وہ تیار کھڑی تھیں۔ سید صلاح الدین بھی اٹھ کھڑے ہوئے...... کرار حیدر بڑے بھائی کے پیچھے زمینوں پر روانہ ہو گیا اور وہ دونوں میاں بیوی گھر سے نکل رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت نازیہ اکبر بیرونی دروازے سے صحن میں داخل ہوئی۔ سید صلاح الدین نے مشفقانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے باپ بھائیوں کی نسبت دو چار رسمی سوال کیے اور پھر دونوں میاں بیوی گھر سے نکل گئے اور نازیہ جیسے اپنی آمد کا اعلان کرتی ہوئی رسوئی گھر کی طرف بڑھ آئی جہاں حجاب بی بی برتنوں کے ساتھ

لعنت اور عذاب رسوائی

''لعنت'' درحقیقت رحمت سے دوری کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سلب رحمت سے عبارت ہے۔ واضح رہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کی راہ اختیار کرتا ہے وہ خود رحمت الٰہی اور رحمتہ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دوری کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ شرک، کفر، معصیت، کفرانِ نعمت، غیر پرستی اور پرستش ہوا ہوس جہاں سچے یکتا خدا کو اذیت دینا ہے وہاں کسی اور کو اس پر ترجیح دینا یا لائقِ پرستش سمجھنا اس کی شانِ کبریائی کی توہین بھی ہے۔ اسی طرح اس کے سچے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب اور نافرمانی اگر اس کے لیے باعثِ اذیت ہے تو اہانت بھی ہے۔ ایسا شخص جہاں رحمت سے دور ہوتا ہے وہاں رسوا کن عذاب رسوائی کا بھی حق دار بن جاتا ہے۔ واقعتاً عذابِ رسوائی، عذابِ جسمانی کی نسبت کس قدر تکلیف دہ ہے۔ جلوۂ محبوبِ حقیقی کی محفل سے محرومی اور اس کی جنت رضوان میں داخلے سے نااہلی اور خبیث، کمینے، ظالم اور معصیت کار لوگوں کی ہم راہی رسوائی کا اتنا بڑا عذاب ہے کہ الامان والحفیظ

(تشریح: سورۂ احزاب (۶) آیت: ۵۷)

انتخاب: افتخار الدین...... وہاڑی

مصروف تھی۔

''میری جان' میری چندا...... لاڈو رانی کیسی ہے؟''
حجاب بی بی رسوئی کے دروازے پر آ گئی تھی۔

''خیر تو ہے؟ آج اتنی صبح کیسے نازل ہوگئی تو' رات نیند نہیں آئی کیا؟'' اس نے بغور نازیہ کو دیکھا تھا۔

''نیند تو مجھے بڑی گوڑھی آتی ہے۔ بس صبح صبح رشیداں نے آ کر ایک ایسی خبر سنائی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں فوراً چلی آئی کہ تجھے بھی حالات حاضرہ سے باخبر کروں۔'' دونوں رسوئی گھر کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اسرار حیدر جو گوجرانوالہ پڑھنے جاتا تھا اور کمرے میں روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ نازیہ کی آواز سن کر دروازے میں چلا آیا۔

''باجی میری کیمسٹری کی کتاب نہیں مل رہی۔ آپ نے کہیں رکھی ہے کیا؟'' وہ مخاطب تو حجاب بی بی سے تھا لیکن اس کی نظریں نازیہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''مجھے کیا ضرورت ہے...... تمہاری کتابوں سے میرا کیا واسطہ بھلا۔''

''کمرے کی صفائی تو آپ ہی کرتی ہیں نا؟''

''ہاں' مگر میں بس صفائی ہی کرتی ہوں۔ چیزیں ادھر ادھر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جدھر رکھی تھی' ادھر ہی دیکھو' پڑی ہوگی۔''

''نہیں ہے نا...... اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔''

''جانتی ہوں میں جو تم دیکھ چکے ہو......'' حجاب بی بی نے ایک نظر نازیہ کے شفق رنگ چہرے پر ڈالی اور پھر اسرار کو گھورتی ہوئی آگے بڑھی اور اس کے برابر سے گزر کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اسرار لبوں پر مسکراہٹ سمیٹے دو قدم آگے بڑھ آیا۔

''کیسی ہو نازو۔''

''اچھی بھلی ہوں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''تو کیا اب میں تمہارے پھر بیمار ہونے کی دعا مانگوں؟''

''آج فرزند بھائی نے لاہور جانا ہے۔ بھابی اور میں بھی ساتھ ہی جا رہے ہیں۔ ہم تو مغرب تک واپس آ جائیں گے فرزند بھائی تین چار دن وہیں رکیں گے۔''

گزشتہ ڈیڑھ مہینے میں وہ دو بار ملے تھے اور دونوں ہی بار نازیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یعنی ایک لحاظ سے دونوں بار اسرار عیادت ہی کے لیے ملا تھا سو ابھی اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے نازیہ نے فوراً ہی دھیمے لہجے میں جیسے اسی آج رات فرزند بھائی کی عدم موجودگی کا نہیں بلکہ ملاقات کا مژدہ سنایا تھا' اسرار کا چہرہ تھوڑا اور کھل اٹھا۔

''تمہاری آنکھیں ہیں یا کاج بٹن۔'' اسرار کچھ بولنا چاہتا تھا کہ عقب میں حجاب بی بی کی آواز سن کر چپ ہو رہا۔

''یہ لو پکڑو اور نکلنے کی کرو اب۔'' حجاب بی بی نے آ کر کتاب اس کے سامنے کر دی۔

''دیکھا...... میں نے کہا تھا نا کہ آپ نے کہیں رکھی ہوگی۔''

''تمہاری اپنی کمسٹری ٹھکانے پر نہیں ہے اور میں سب خوب سمجھتی ہوں۔ چلو پکڑو یہ۔'' اس نے اسرار کو گھورتے ہوئے کتاب اس کے ہاتھ میں تھمائی اور وہ ایک نظر نازیہ پر ڈالتا ہوا مسکرا کر دوبارہ کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

''چل تو ادھر آ۔'' حجاب بی بی نے نازیہ کا ہاتھ تھاما اور صحن کے دائیں کونے میں موجود شہتوت کے درخت کی چھاؤں میں دھری چارپائیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''خیر تو ہے! آج صبح ہی صبح چاچا اور چاچی کدھر گئے ہیں؟''

''ہاں خیر ہی ہے...... تو اپنی سنا' تیرے پیٹ میں کیا مروڑ ہے؟'' دونوں ایک ہی چارپائی پر جا بیٹھیں۔

''رات پینو پھر بھاگ گئی۔'' نازیہ نے رازدارانہ لہجے میں جیسے انکشاف کیا۔

''ہیں......'' حجاب بی بی کو شاید اس کی بات ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔

''سچ کہہ رہی ہوں' ماسی رشیداں اور ولایت کی تو ایک دیوار ہے۔ رشیداں بتا رہی تھی کہ رات پچھلے پہر نکل گئی پینو...... اپنا سارا کپڑا لتہ بھی لے گئی ہے اس بار تو؟''

''کمال ہے ابھی ہفتہ پہلے تو یہ لوگ اسے واپس لائے تھے۔'' حجاب بی بی متعجب ہوئی۔

پروین عرف پینو کچھ عرصہ تک ان کی سہیلی رہی تھی۔

مزاج تو اس کا بچپن ہی سے باغیانہ اور آزادی پسند تھا' پھر ایک سال پہلے جب پہلی بار وہ الیاس جٹ کے ساتھ گاؤں سے بھاگ کر وزیرآباد گئی تو ان کے درمیان فاصلے آگئے تھے۔ اب یہ تیسری بار اس کے بھاگ جانے کی خبر سن رہی تھی وہ۔

''ہاں...... اس کے باپ بھائیوں نے اچھی خاصی پھینٹی بھی لگائی تھی پھر بھی...... رات نکل گئی شیر کی بچی...... رشیداں بتا رہی تھی کہ اس بار گلزار نائی کے پتر جیدے کے ساتھ بھاگی ہے اور اس بار شاید کوئی اس کے پیچھے نہ جائے...... ولایت چاچی کے گھر یہ ہی میٹنگ چل رہی ہے۔ باپ بھائی بری طرح عاجز اور بدظن ہوئے بیٹھے ہیں کہ اب جہاں مرضی مرتی کھپتی پھرے، ہم نہیں پوچھیں گے بلکہ اگر اب پینو خود بھی واپس آئی تو ٹھپے مار کر نکال باہر کریں گے۔''

''اس بی بی کے شروع ہی سے لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ اپنی زندگی تو خراب کی سو کی' ماں باپ کے چہروں پر بھی کالک تھوپی ہے کم بخت نے۔''

''بہرحال بڑا حوصلہ ہے پینو کا۔''

''حوصلہ...... یہ حوصلے کی بات نہیں' غیرت اور حیا کی کمی ہے...... خدا کی پناہ' اپنی عزت کا کوئی پاس نہ خاندان برادری کی کوئی پروا۔'' حجاب بی بی کے لہجے میں ناپسندیدگی اور تاسف تھا۔

''اچھا باجی...... میں جا رہا ہوں پھر۔'' اسرار کتابیں اٹھائے برآمدے سے صحن میں آیا تھا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے اسرار۔'' حجاب بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نازیہ اسرار سے مخاطب ہوئی۔

''زبردست...... اگلے مہینے سے پیپر شروع ہیں۔ آگے بی ایس سی میں داخلہ لوں گا۔'' وہ قریب چلا آیا۔ حجاب بی بی نے ایک نظر دیکھا دونوں ہی کے چہروں پر محبت بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''پیپر ابھی ہونے ہیں' ہوئے نہیں...... پہلے ایف ایس پاس کرلو پھر آگے کا سوچنا۔'' حجاب بی بی نے جیسے مشورہ دیا تھا۔

''آپ کا بھائی پوزیشن ہولڈر رہا ہے باجی۔ دیکھنا ایف ایس سی میں بھی کتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہوں۔''

''جب کی بات اور تھی' ابھی تو تمہیں اپنی کتابوں کا بھی ہوش نہیں رہتا...... پتا نہیں پیپروں میں کیا گل کھلاؤ گے؟''

''یہ آپ کا خیال ہے باجی' مجھے سارا ہوش رہتا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا پھر نازیہ سے مخاطب ہوا۔

''جاوید سے کہنا کہ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں...... آج ہر صورت ملے مجھ سے۔'' گویا یہ ملاقات کا تقاضا کیا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' نازیہ نے مسکرا کر نظریں جھکالیں ملاقات طے پاگئی تھی۔

''اچھا باجی' میں نکلتا ہوں اب۔'' اس نے ایک نظر نازیہ کے چہرے پر ڈالی...... ''خدا حافظ۔''

''اپنا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔'' نازیہ نے اپنائیت سے پر لہجے میں کہا اور اسرار بالوں میں ہاتھ پھیرتا مسکراتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا...... نازیہ کی جگمگاتی آنکھیں عقب سے اس کی بلائیں لینے میں مگن تھیں اور حجاب بی بی خاموش بیٹھی نازیہ کے چہرے سے پھوٹتی مسرت کو تک رہی تھی۔

اسرار دروازے سے نکل گیا تو نازیہ حجاب بی بی کی طرف متوجہ ہوئی اور اسی اپنی طرف گھورتے پا کر حیرانی سے بولی۔

''کیا ہوا...... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' حجاب بی بی ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''دیکھ ناز' تو میری عزیز ترین سہیلی ہے اور اسرار میرا بھائی ہے' تم دونوں ہی کی بہتری اور سلامتی مجھے پیاری ہے۔ مگر میرے بار بار سمجھانے کے باوجود بھی تم دونوں ہی باز نہیں آرہے ایسے میں......''

''کیا باز نہیں آرہے؟'' نازیہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''کون سی غلط بات یا حرکت کی ہے ہم نے جو تو اس طرح بات کر رہی ہے۔ میں تیرے بھائی کو کھائے جا رہی ہوں یا وہ مجھے کھا جائے گا۔''

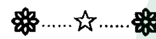
''تم ایک دوسرے کو کھاؤ نہ کھاؤ' اگر تیرے گھر والوں

کواس سلسلے کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ضرور تم دونوں کی بوٹیاں چبانے پر اتر آئیں گے...... تو اچھی طرح اپنے باپ بھائیوں کو جانتی سمجھتی ہے' پھر بھی نادان کیوں بنتی ہے؟ کیوں بات تیری کھوپڑی میں نہیں اترتی۔"

"تو میرے باپ بھائیوں کو مجھ پر چھوڑ دے...... کوئی کسی کی بوٹیاں نہیں چبائے گا اور انہیں کوئی بھنک کیوں ملے گی...... کس بات کی بھنک ملے گی بھلا...... جب ہمارے درمیان کوئی ایسی ویسی غلط بات ہے ہی نہیں تو بلاوجہ کیوں تو اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی دہلانے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔" نازیہ نے بے فکری اور لاپروائی سے کہا۔ حجاب بی بی خاموشی سے بس اسے دیکھے گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا کہے...... اس طرح کی گفتگو تو اکثر ہی ان کے درمیان ہوتی رہتی تھی۔ مگر اسرار اور نازیہ دونوں ہی چکنے گھڑے تھے۔

حجاب بی بی کے اندیشے اور فکر مندی دونوں ہی کو بے معنی اور فضول محسوس ہوتی تھی اور دونوں اسی طرح اس کی باتوں اور نصیحتوں کو لاپروائی سے ہنسی میں اڑا دیا کرتے تھے۔

مزید کچھ دیر بیٹھنے کے بعد نازیہ واپس چلی گئی کہ اسے بھائی بھابی کے ہمراہ لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حجاب بی بی نے بھی سر جھٹکا اور اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔



شام ڈھلتے ہی بازار حسن کے کوٹھوں اور گلیوں میں اینٹھی نحوست زدہ سی کسلمندی کہیں اڑنچھوں ہوجایا کرتی تھی۔ کوٹھوں اور گلیوں میں صفائی ستھرائی کے عمل کے ساتھ ہی وہاں کی ویرانی اور خاموشی دم توڑ دیا کرتی تھی۔ صفائی والے اپنے کام میں جت جاتے...... پھولوں والے پھولوں پر چھڑکاؤ کرتے نظر آتے...... پان والوں کے ہاتھ کتھے چونے اور پان کے پتوں کے ساتھ مصروف ہوجاتے...... کوٹھوں کے باہر' گلیوں' نکڑوں اور تھڑوں پر دلال شکاروں کی تاک میں آبیٹھتے اور ایک ایک کر کے جھروکے آباد ہونا شروع ہوجاتے...... کوٹھوں اور بالاخانوں میں طوائفیں تماش بینوں پر بجلیاں گرانے کی نیت سے ہار سنگھار میں مگن ہوجایا کرتیں۔

مزید دو چار کوٹھوں کے ساتھ نزہت بیگم کے کوٹھے کی بھی بڑی دھوم تھی...... ہیروں کی اس منڈی میں نزہت بیگم کے پاس تین ہیرے تھے اور تینوں ہی انمول...... اپنی مثال آپ' نزہت کی بڑی بیٹی عشرت جہاں' جس کی آواز کے جادو اور گائیکی کے دور دور تک چرچے تھے۔ چھوٹی بیٹی سندس جہاں' ایسی رقاصہ جس کے انگ انگ میں پارہ تھرکتا تھا...... بدن میں گویا بجلیاں بھری تھیں...... تماش بینوں کے لیے اس پر نظر رکھنا مشکل رہتا تھا۔ تیسری اس کی بھانجی تھی...... عشرت جہاں اور سندس جہاں دونوں سے چھوٹی' حسن آرا...... اسم با مسمیٰ...... حسین اور دل کش شکل وصورت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے جسمانی حسن سے بھی ایسے بھرپور انداز میں نوازا تھا کہ دیکھنے والی آنکھ پتھر ہوجایا کرتی تھی۔

نزہت بیگم نے بھی اس کی تربیت میں خوب جی مارا تھا۔ اس کی ماں تو اسے پیدا کرتے ہی دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ نزہت بیگم نے ہی اسے ماں بن کر پالا تھا۔ کوٹھوں کی روایت کے مطابق پیدا ہوتے ہی اس کے پیروں میں نفیس ونازک چاندی کی پازیبیں پہنادی گئیں۔ پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو پازیبوں کی جگہ گھنگھروں نے لے لی۔ مزید ذرا بڑی ہوئی تو باقاعدہ رقص کی تربیت شروع کرادی گئی۔ نازک ایسی تھی کہ اکثر رقص کی کلاس کے بعد اسے بخار آبستا...... نوجوانی کی عمر کو پہنچی تو ایک اچھی رقاصہ بن چکی تھی۔ نزہت بیگم نے سرسنگیت پر عبور کی غرض سے اس کے لیے دو استادوں کا انتظام کیا تھا۔ اور حسن آرا نے اس میدان میں بھی اپنا آپ یوں ثابت کر دکھایا تھا کہ اس کے استاد خود نزہت بیگم سے کہا کرتے تھے۔

"بائی جی...... آنے والا کل صرف حسن آرا کا ہوگا۔ ایسے گن پورے بازار میں اور کسی کو چھو کر بھی نہیں گزرے۔"

پھر حسن آرا نے جس روز اپنی زندگی کا پہلا رقص پیش کیا' اس رات نزہت بیگم نے محفل کا بطور خاص انتظام کیا تھا۔ رات گئے اس محفل میں صرف خواص ہی موجود تھے۔ ایک سے ایک رئیس ابن رئیس' امرا اور نواب نشست انداز

تھے۔ جب حسن آرا پہلی بار سفید غرارہ پہنے جلوہ گر ہوئی..... آنکھیں ایک بار جو اس کی سمت اٹھیں تو گویا پتھرا کر رہ گئیں پھر جب اس نے رقص شروع کیا تو چاروں طرف جیسے ایک فسوں اتر آیا..... حاضرین محفل نظریں جھپکانا اور سانس لینا بھی بھول کر رہ گئے۔ پہلی ہی محفل اور پہلے ہی رقص پر حسن آرا کا طوطی بول اٹھا تھا۔ تماش بینوں کے کلیجوں پر چھریاں چل گئیں اور قدردانوں کے دل کباب ہو گئے..... اس رات کے اس آخری پروگرام میں نزہت بیگم پر دھن یوں برسا کہ وہ نہال ہو کر رہ گئی۔

اس رات کے بعد روز اور بار بار حسن آرا کے رقص کی فرمائش ہونے لگیں لیکن نزہت بیگم بڑی گھاگ تھی۔ اس نے کسی بنیے کی طرح ناپ تول کر حسن آرا کو خرچ کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ رات کے ایک آخری رقص اور بس.....

حسن آرا کے نوخیز چہرے پر ناتجربہ کاری اور کم سنی کا بھولپن تھا۔ نازک اور پُرلوچ بدن میں دوشیزگی کا حیاانگیز سحر تھا اور یہ سب اس لیے تھا کہ ابھی اس کی نتھ نہیں اتری تھی..... ابھی اس کا حسن ان چھوا اور ان مسلا تھا..... وہ ایک ایسا ترشا ہوا ہیرا تھا جو ابھی تک کسی انگوٹھی کا نگینہ نہیں بنا تھا۔ صاحب نظر اور قدرشناس جوہریوں نے اس ہیرے کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول کر نزہت بیگم کے سامنے کر دیے تھے کہ جتنا چاہو سمیٹ لو۔ مگر نزہت بیگم نے کسی کو کوئی آس امید نہیں دلائی تھی..... اس لیے کہ حسن آرا اور نزہت بیگم کے درمیان اس حوالے سے ایک معاہدہ تھا..... اس نے جب بھی حسن آرا کے سامنے کسی جوہری کی حیثیت اور شخصیت کا معاملہ رکھا' حسن آرا نے اسی معاہدے کے تحت انکار کر دیا۔

''اماں..... ساری زندگی یہی کچھ بھوگنا ہے..... اسی سب کو جینا ہے میں نے' پھر اتنی عجلت اور بے صبری کس لیے..... پھر میں نے تم سے کہہ رکھا ہے ناکہ اپنی زندگی کا پہلا مرد میں خود چنوں گی..... اپنا آپ اسے لوٹنے دوں گی جسے دل مانے گا۔''

''تیری اسی بات سے تو مجھے الجھن ہوتی ہے حسن آرا..... ہمارے یہاں یہ دل ول والی باتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا..... ہم طوائفیں ہیں' ہمارا بھلا ایسی باتوں سے کیا واسطہ۔''

''بس اماں اب تم گھسی پٹی باتیں مت شروع کر دینا..... میں یہیں پلی بڑی ہوں..... جانتی ہوں اس عمر میں تم بھی ایسی ہی تھیں اور پھر میں نے کوئی انکار تھوڑے ہی کیا ہے..... میں یہیں کی مٹی ہوں اماں' مجھے یہیں کے طور طریقوں سے جینا ہے..... یہ بات سمجھتی ہوں میں' ساری زندگی تمہارے حوالے ہے' تمہاری مرضی سے گزارنی ہے لیکن شروعات اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں۔ کیا اتنا حق اور اختیار بھی نہیں دو گی تم؟''

''مجھے تو بس یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں کوئی گھاٹے کا سودا نہ کر لے تو..... کسی بے حیثیت کو نہ منتخب کر بیٹھے۔''

''بے حیثیتوں کا بھلا یہاں کیا کام اماں؟''

''میرا مطلب تھا کہ کوئی کم حیثیت بندہ نہ ہو..... تیری نتھ اتارنے کے خواہش مندوں میں بڑے بڑے رئیس اور نواب پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ سونے اور ہیرون کا بیوپار کرنے والے..... اب تو کہیں انہیں نظرانداز کر کے کسی چاندی فروش کے کندھے پر ہاتھ نہ رکھ بیٹھنا۔''

''بے فکر رہو اماں..... مجھے اپنی قدروقیمت کا بڑی اچھی طرح اندازہ اور احساس ہے۔'' حسن آرا کو لاشعوری طور پر انتظار رہتا تھا..... وہی بے شکل انتظار جو اس عمر میں فطری طور پر جذبات واحساسات میں آ بیٹھتا ہے..... کسی ایسے اجنبی آشنا کا انتظار جسے دیکھتے ہی اندر سے یہ گواہی ملے کہ ہاں..... یہی ہے وہ شخص جس پر سب کچھ نچھاور کیا جا سکتا ہے..... جسے بے دھڑک اور بے جھجک اپنا آپ سونپ دینے کو جی چاہے۔

جب لٹنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر کیوں نہ کسی ایسی کے ہاتھوں لٹا جائے کہ لٹتے ہوئے کسی افسوس' کسی دکھ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

حسن آرا کو انتظار تھا اور قدرت نے جلد ہی اس کے اس بے شکل انتظار کو ایک صورت دے دی..... میر ارشد اللہ کی صورت۔ اس رات جب وہ رقص کے لیے حال میں داخل ہوئی تو پہلی ہی طائرانہ نظر میں میر صاحب ٹھاہ کر کے اس کے کلیجے میں لگے تھے..... اور لوگ بھی تھے..... مگر پورے کورم میں ان کی چھب ہی کچھ نرالی تھی..... ایک الگ

سی سنجیدگی اور وقار ان کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھا...... باقی حاضرین محفل کی طرح ان کی نگاہیں بھی حسن آرا کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں مگر ان نگاہوں میں وہ ندیدہ پن اور بھوک نہیں تھی جو باقی تمام آنکھوں سی چھلکی پڑتی تھی۔

حسن آرا کو پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص اس دنیا کا باشندہ نہیں ہے...... پتا نہیں کیسے یہ اس طرف آن نکلا ہے......بس پھر اس روز حسن آرا پر بن پیئے ہی ایک سرمستی اتر آئی...... اس نے رقص شروع کیا اور اپنے آپ سے غافل ہوتی چلی گئی۔ بیسیوں تپش دیتی آنکھوں میں وہ دو نرم اور ٹھنڈی آنکھیں حسن آرا کے اندر کی آگ اشتیاق کو یوں بھڑکا گئیں کہ خود حسن آرا اپنے من کی حالت پر حیران رہ گئی۔

رقص ختم کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو وہ دو آنکھیں بھی اس کے ساتھ ہی چلی آئیں۔ ایک عجیب سی بے چینی اور اضطراب تھا جو حسن آرا کے اندر ہمکنے لگا تھا...... وہ آنکھیں برابر اسے دیکھے جا رہی تھیں...... شاید کچھ کہہ رہی تھیں...... پوچھ رہی تھیں اور وہ حیران و پریشان سی اپنے بستر پر بیٹھی ان آنکھوں کو تکے گئی۔

''کون ہو؟ کس دیس کے باسی ہو...... اس بستی کی طرف کیسے آ گئے...... تمہارا یہاں کیا کام؟'' اس کے اندر ایک حسن آرا ان آنکھوں سے مخاطب تھی اور...... وہ آنکھیں اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

نزہت بیگم کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''اے حسن آرا...... میں قربان جاؤں میری بچی، دیکھ مرضی تو تیری ہی رہے گی مگر قسمت کی دیوی مسلسل دستک دے رہی ہے، تو کب تک یونہی ٹال مٹول کرتی رہے گی...... کب کوئی تیرے من کو بھائے گا؟ میری مان اور سمجھ داری سے کام لی...... اس من کے چکر سے باہر آ جا میری بیٹی، یہ انسان کو بس خراب و خوار ہی کرتا ہے اور کچھ نہیں۔'' نزہت بیگم نے آتے ہی اس کی بلائیں لیں اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''اماں...... وہ جو سامنے کے رخ گدے پر دو آدمیوں کے درمیان سرخ و سپید چہرے والے مہمان بیٹھے تھے...... جنہوں نے واسکٹ پہن رکھی تھی...... وہ کون تھے؟ پہلے تو کبھی دکھائی نہیں دیئے وہ؟'' حسن آرا نے آج پہلی بار کسی کے متعلق اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ نزہت بیگم کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔

''وہ...... وہ میر ارشد اللہ ہیں۔ پہلی بار ہی آئے ہیں، بلکہ آئے کیا لائے گئے ہیں...... ان کے دائیں بائیں جو دو افراد بیٹھے تھے، وہ نواب لوگ ہیں، اپنے پرانے قدر دانوں میں سے ہیں...... وہی میر صاحب کو گھیر کر لائے ہیں اور میر صاحب......'' نزہت بیگم نے حسن آرا کا ہاتھ تھام لیا...... ''میر صاحب تو یوں سمجھ لو کہ ہیروں کی کان ہیں حسن آرا...... اور تو خود بھی انہیں دیکھ تو چکی ہے، کیسی شاندار اور بھرپور شخصیت کے مالک ہیں...... ان سے بہتر تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا...... دیکھ بیٹی، میری بات مان لے...... کسی طرح میر صاحب کو اگر تو قابو کر لے تو وارے نیارے ہو جائیں گے...... وہ بیٹھے ہیں ابھی اور...... اور کچھ وقت تیرے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ حسن آرا کی مرضی ہوئی تو ٹھیک ورنہ معذرت...... اب تو ہی بتا کیا جواب دوں انہیں؟'' نزہت بیگم نے پرامید سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''تم نے ٹھیک کہا ہے اماں...... میر صاحب سے بہتر تو شاید ہی کہیں کوئی ہو...... تم نہ آتی تو میں خود بات کرتی تم سے۔'' حسن آرا کے جواب پر نزہت بیگم نے بے اختیار ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔

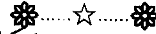
''اللہ میری بچی کو ہر نظر بد سے محفوظ رکھے...... تو پھر میں بلاؤں...... بھیج دوں نا ان کو......؟'' نزہت بیگم نے جیسے پھر سے تصدیق چاہی تھی۔ حسن آرا نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

''جی اماں۔''

''بس تو ٹھیک ہے پھر، میں جاتی ہوں۔'' نزہت بیگم اٹھی اور فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ حسن آرا اپنی جگہ سے اٹھ کر سنگھار میز کے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

دھڑکنیں ایک جذبات انگیز تال میں ڈھل آئی تھیں...... رگوں میں ایک سرور انگیز کسمساہٹ بیدار ہوئی اور حسن آرا کے چہرے پر مسکراہٹ کے دھنک رنگ بکھیر

گئی۔ وہ خوش تھی، مطمئن تھی، اس بات پر کہ ایک خودساختہ ہی سہی...... اپنی پامالی کا من چاہا سا بہانہ بن آیا تھا...... ایک طوائف...... ایک طوائف زادی کے لیے قدرت کا یہ انتظام بھی کسی اعزاز، کسی نعمت غیرمترقبہ سے کم نہیں تھا کہ اس کے ان چھوئے اور خالص جذبات اپنی مرضی اور من چاہے شخص کے ہاتھوں لٹنے جا رہے تھے۔



حجاب بی بی کی سوتے میں سے آنکھ کھلی تھی...... اس کے بعد کافی دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے باوجود نیند نہیں آئی تو وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی، گھر میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یقیناً سبھی سو رہے تھے۔

وہ کچھ دیر تک مسہری پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی رہی، پھر چپل پاؤں میں پھنساتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل آئی...... سردیوں میں تو سبھی کمروں میں سویا کرتے تھے البتہ آج کل موسم کچھ گرم ہو گیا تھا گندم کی کٹائی کے دن قریب تھے۔ اس نے برآمدے ہی میں سے کھلے صحن کا جائزہ لیا...... گیارہویں کے چاند کی ٹھنڈی چاندنی پورے صحن میں بچھی تھی۔ ٹوکہ مشین کے اس طرف چاروں بکریاں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ ایک طرف کرار حیدر چارپائی پر پڑا سو رہا تھا...... زوار حیدر تو زیادہ تر زمینوں ہی پر رہتا تھا...... ہاں کبھی کبھار اس کی جگہ کرار حیدر وہاں رک جاتا تو زوار گھر آ کر سوتا تھا اسرار تھا تو وہ یا تو اپنے کمرے میں سویا کرتا تھا یا پھر چھت پر...... حجاب بی بی نے پہلے تو وضو کر کے تہجد کی نماز پڑھی پھر یونہی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی آئیں۔ پانچ فٹ اونچی چار دیواری کی وجہ سے چھت بھی ایک کشادہ صحن ہی معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرف کاٹھ کباڑ پڑا تھا...... جنوبی کونے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تعمیر کیا گیا تھا اور اس کمرے کے سامنے ہی اسرار کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

حجاب بی بی عقبی دیوار کے قریب جا کھڑی ہوئی...... سارا گاؤں ہی نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات کا دامن گہری خاموشی اور سکون سے بھرا ہوا تھا۔ بس کسی کسی وقت دور سے ایک کتے کی آواز ابھرتی اور اس کے جواب میں دو چار کتوں کی مزید آوازیں، چاندنی میں گھل جاتیں...... دور...... اسکول کے صحن میں لگے پیپل کے درختوں کے جھنڈ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جن کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ پڑھا کرتی تھی...... وہ نازیہ، پروین، کوثر، سلمٰی، گوہر اور کتنی ہی سہیلیاں سکھیاں تھیں جن کا ان درختوں کی چھاؤں میں وقت گزرا تھا۔ اکٹھے پڑھا تھا۔ معصوم معصوم بے ضرر شرارتیں اور مخصوص کھیل کھیلے تھے شٹاپو، کوکلا چھپاکی اور رسی کودنے میں تو کبھی کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکی تھی۔

گزرے دنوں کی خوش گواریاں اس کے چہرے پر مسکراہٹ بن کر اتر آئیں۔ چند لمحے وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ واپس نیچے جانے کی نیت سے سیڑھیوں کی طرف پلٹی اور جاتے جاتے ایک نظر دوبارہ اسرار کی چارپائی پر ڈالتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔

چھٹی حس تھی یا کوئی لاشعوری سرسراہٹ...... چھپن، وہ دبے قدموں چلتی اسرار کی چارپائی کے قریب پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا...... چارپائی پر بس دو تکیے چادر اوڑھے استراحت انداز تھے اور اسرار غائب تھا...... پتا نہیں کب سے...... کیوں؟

حجاب بی بی پریشان سی ہو کر وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی...... یک بہ یک ہی اس کا دل گھبرانے لگا...... رات کے اس پہر اسرار کی عدم موجودگی کوئی معمولی بات نہیں تھی...... یہ ٹھیک ہے کہ وہ سب ایک دوستان اور محبت بھری فضا میں رہتے تھے، سبھی کے مزاج بھی نرم اور ٹھنڈے تھے۔ سید صلاح الدین بے جا سختی اور غصہ پسند نہیں کرتے تھے...... نا ہی زیادہ روک ٹوک سے کام لیتے تھے۔ پھر بھی...... اسرار کی یہ حرکت ایسی تھی کہ اسے حجاب بی بی کے نزدیک دونوں بڑے بھائی نظر انداز کر سکتے تھے اور نہ ہی ماں جی یا بابا سائیں۔

سبھی اپنی اپنی جگہ بنا کہے یا جتائے کچھ مخصوص اقدار کے دائرے میں جیتے آئے تھے۔ اب اگر اسرار کی یہ حرکت گھر کے باقی افراد کے علم میں آ جاتی تو یقینی طور پر گھر میں ایک اچھی خاصی تلخی اور بدمزگی کا باعث بنتی...... حجاب بی بی کو اندازہ تھا کہ ماں جی اور بابا سائیں دونوں کو بہت دکھ پہنچے گا...... افسوس ہوگا...... دونوں بڑے بھائی بھی اس

طرح گھر سے غائب نہیں ہوئے تھے..... اگر کبھی دیر سویر یا رات گھر سے کہیں باہر گزارنے کی نوبت پیش آتی بھی تھی تو وہ پہلے سے بابا سائیں کو بتادیا کرتے تھے۔ ان سے باقاعدہ اجازت لیا کرتے تھے اور اسرار..... اسرار سب کو اپنے چھت پر سونے کا دھوکا دے کر چوری چھپے غائب تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کدھر گیا ہے؟ کس مقصد کے تحت گیا ہے..... اور..... اور اگر آج اتفاقاً حجاب بی بی چھت پر نہ چلی آتی تو یقیناً اسے بھی اسرار کی اس عدم موجودگی کا پتا نہیں چلتا..... خدا معلوم اسرار نے کب سے یہ چلن اپنا رکھا تھا اور اب سے پہلے وہ کتنی راتیں گھر سے باہر کہیں گزار چکا تھا۔ یہ سمجھ تو حجاب بی بی کو اب آرہی تھی کہ اسرار نے تنہا چھت پر سونا معمول بنالیا تھا تو اس کی اصل وجہ اور مقصد یہ تھا کہ وہ رات کو جب چاہے چھت سے غائب ہوجایا کرے اور کسی کو خبر بھی نہ ہو۔

لحظہ بہ لحظہ حجاب بی بی کی گھبراہٹ اور فکرمندی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ لیکن اس کا دماغ اوپر..... چھت پر اسرار کی خالی چارپائی پر بیٹھا رہا..... دل کو یہ دھڑکا لگا رہا کہ اس کے علاوہ کوئی اور اٹھ کر چھت پر چلا گیا تو..... اگر کسی طرح بابا سائیں یا بھاہ جی کو اسرار کی اس وقت اور اس طرح گھر سے غیر موجودگی کا علم ہوگیا تو.....؟ یقینی طور پر اسرار کی اس حرکت کو اس قدر معیوب جانا جاتا کہ وہ لوگ کوئی بھی رعایت برتے بنا اس کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آتے۔

حجاب بی بی خود ہی ہولتی رہیں اور خدا سے خیر کی دعائیں مانگتی رہی..... باقی رات ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگی..... زبان دعاؤں..... اور کان صحن اور چھت کی طرف متوجہ رہے..... بابا سائیں معمول کے مطابق منہ اندھیرے اٹھ کر مسجد کی طرف چلے گئے۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔''

پھر جب مسجد کے اسپیکر سے ان کی آواز بلند ہوئی تو معمول کی حرکت شروع ہوگئی..... ماں جی نے بستر چھوڑ دیا..... صحن میں سویا کرار حیدر بھی اٹھ بیٹھا تھا..... پھر اس وقت حجاب بی بی کی جان میں جان آئی جب سیڑھیوں سے اسرار نیچے اترا۔

''جاگ گئے ہو کرار بھائی..... چلیں؟'' وہ سیڑھیاں اترتا ہوا کرار سے مخاطب تھا۔

''ہوں..... ہاں چلو۔''

''السلام علیکم ماں جی' وہ بشاشت سے بولتا صحن میں اتر آیا تھا۔

''وعلیکم السلام پتر! جیتے رہو میرے لال' اٹھ گئے..... مسجد پہنچو میرا بچہ۔''

''حجاب بیٹی اٹھ جا' صبح ہوچکی پتری۔'' ماں جی نے اسرار کو جواب دینے کے بعد برآمدے میں سے اسے آواز دی تھی۔ انہیں تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ کب سے جاگ رہی ہے۔

''اٹھ چکی ہوں ماں جی آتی ہوں۔'' اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ماں جی کو جواب دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ٹھان لی تھی کہ آج اسرار سے سیدھے صاف اور دوٹوک بات کرے گی۔ ایسی کان کھینچے گی کہ تیر کی طرح سیدھا کردے گی۔ کرار اور اسرار تو فوراً ہی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکل گئے تھے۔ حجاب اور ماں جی بھی نماز ادا کرنے کے بعد روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

سورج نے ایک ذرا صحن میں جھانکا تو زوار حیدر بھی پہنچ گیا۔ حسب معمول ناشتا سب نے اکٹھے ہی کیا تھا۔ آج بھی ناشتے کے دوران زوار کی شادی ہی کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ قرعہ فال خالہ کی بیٹی رضیہ کے نام نکلا تھا اور اب باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پایا تھا کہ آئندہ نوچندی جمعرات کو منگنی کی رسم پوری کرلی جائے اور چھ ماہ بعد کی کوئی تاریخ شادی کے لیے طے کرلی جائے۔

ناشتے کے بعد سبھی اپنے اپنے معمول پر ہولیے۔ اسرار بھی کتابیں سنبھال کر گوجرانوالہ روانہ ہوگیا۔ حجاب بی بی کو اس کے کان کھینچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ البتہ جب سہ پہر کو اس کی واپسی ہوئی تو صورت حال بن آئی..... ماں جی اس وقت شہتوت کی چھاؤں میں بیٹھی تھیں۔ آس پڑوس کی دو چار عورتیں بھی آئی بیٹھی تھیں۔ وہ سب آپس میں خوش گپیوں میں مگن تھیں۔ جب اسرار صحن میں داخل ہوا اور سلام کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ تبھی حجاب بی

بی چکے سے اس کے سر پر جا پہنچی۔
"رات کہاں تھے تم؟" حجاب بی بی نے عقب سے اچانک ہی جیسے اسرار کے سر پر ہتھوڑا کھینچ مارا تھا۔
"کہاں تھا......! کیا مطلب کہاں تھا؟" وہ کتابیں تپائی پر رکھتے ہوئے جھٹکے سے پلٹا۔ چہرے کی رنگت پر ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ کا پھیکا پن چھلکا تھا۔
"میں نے یہی پوچھا ہے...... رات بھر کہاں تھے؟" حجاب بی بی نے سیدھے سبھاؤ بات کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ رات سے اب تک جو اضطراب اس کے دماغ میں پکتا رہا تھا یہ کچھ وہی جانتی تھی۔
"پہلے روز کہاں ہوتا ہوں......" اسے گڑبڑ کا اندازہ تو ہوگیا تھا مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا۔ "اوپر چھت پر تھا...... خاصا لیٹ سویا تھا۔ کیوں...... کوئی خاص بات ہے کیا؟"
"بکواس نہیں کرو۔ سیدھے طریقے سے صاف صاف بتادو رات کہاں تھے؟"
"بتایا تو ہے...... اور کیا بتاؤں؟" وہ متعجب سے انداز میں بولا اور چارپائی پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔
"میں آخری بار پوچھ رہی ہوں اسرار مجھے بتادو کہ رات کہاں گئے ہوئے تھے نہیں تو پھر یہی بات تم سے بھاہ جی اور بابا سائیں ہی معلوم کریں گے؟" اس دھمکی کا اسرار پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے تسمے کھولتے ہاتھ رک گئے اس نے سر اٹھا کر حجاب بی بی کی طرف دیکھا۔ جو دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑی گہری سنجیدہ نظروں سے اس کی صورت تک رہی تھی۔
"سب خیریت تو ہے نا......! آخر بات کیا ہے؟" اس بار اسرار کا لہجہ شکست خوردہ سا تھا۔
"جو پوچھا ہے اس کا جواب چاہیے بس۔" اسرار کچھ دیر تو خاموشی سے حجاب بی بی کی طرف دیکھتا رہا پھر نظریں چراتے ہوئے بولا۔
"چھت پر ہی تھا...... صرف تین چار گھنٹے کے لیے باہر گیا تھا۔"
"کہاں گئے تھے؟" سوال جوں کا توں موجود تھا۔
"بابے جلال کے ڈیرے پر۔"
"کس لیے گئے تھے؟"
"بابے کمال کے پتر اکمل نے دعوت کی ہوئی تھی۔ کچھ اور یار بیلی بھی تھے۔ وہ لوگ ساری رات وہیں رہے ہیں۔ وی سی آر کا پروگرام تھا۔ میں بس ایک فلم دیکھ کر واپس آ گیا تھا۔" اس نے تسمے کھول کر جوتے نکالے اور جرابیں اتارنے لگا۔
"یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟"
"کون سا سلسلہ؟"
"یہی...... راتیں باہر ڈیروں پر گزارنے کا۔"
"کوئی سلسلہ نہیں چل رہا...... بس رات ہی ایسا ہوا ہے۔" اس نے روانی سے جھوٹ بولا۔
"اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ اگر آج سے پہلے اس کی غیر موجودگی کسی کے علم میں آئی ہوتی تو پہلے ہی کلاس لگ گئی ہوتی۔"
"اور کون کون تھا تمہارے ساتھ؟" حجاب بی بی نے ایک اور سوال داغا۔
"آپ سب کو تو نہیں جانتیں...... پھر کیا بتاؤں کہ کون کون تھا۔"
"جاوید بھی تھا؟"
"ہاں جی...... وہ بھی تھا۔" کچھ دیر کے لیے دونوں خاموش رہے پھر حجاب بی بی آگے بڑھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں کتنی پریشان رہی ہوں...... تمہاری کتنی فکر رہی ہے مجھے۔"
"فکر کس بات کی بھلا؟ میں اب کوئی بچہ تو رہا نہیں۔"
"ہاں...... داڑھی مونچھیں تک تو سفید ہو آئی ہیں تمہاری۔" حجاب بی بی نے اس کی گردن دبوچ کر ہلکی سے جھنجوڑا۔ "تمہیں ذرا خیال نہیں آیا کہ اگر کسی کو تمہاری یوں غیر موجودگی کا علم ہوگیا تو کیا ہوگا؟ بھاہ جی اور بابا سائیں کا ردعمل...... ان کا رویہ کیا ہوگا؟"
"آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے جیسے شرمندگی کے اظہار کے طور پر گردن جھکالی تھی۔
"ہاں، خیال رکھنا بھی چاہیے، تم اب کوئی بچے تو رہے نہیں اسرار، تمہیں سمجھنا چاہیے کہ جو کام دوسروں سے چوری

چھپے کرنا پڑے وہ درست نہیں ہوسکتا...... اس کے غلط ہونے کا اتنا ثبوت ہی کافی ہے کہ وہ دوسروں سے چھپ کر کرنا پڑ رہا ہے۔"

"جی باجی...... دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔"

"وعدہ؟"

"ہاں جی وعدہ رہا۔ اب تو یہ اس کا اندر ہی جانتا تھا کہ اس وعدے کی کیا حقیقت ہے۔ وہ تو بس یہ وقت گزارنا چاہتا تھا کہ باجی کہیں سچ میں یہ معاملہ بھاہ جی یا بابا سائیں تک نہ پہنچادے۔

"یہ ہوئی نا بات۔" حجاب بی بی چہک اٹھی۔ "میرا اچھا اور بیبا ویر...... تم ہاتھ منہ دھولو میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی ہوئی باہر نکل گئی اور اسرار ایک طویل اور گہری سانس لیتا ہوا وہیں بیٹھے بیٹھے پشت کے بل لیٹ گیا...... گزری ہوئی رات کی سحر انگیزی اس کی پور پور میں رقص انداز تھی...... اس کے روئیں روئیں میں ایک خمار انگیز گدگداہٹ جگائے ہوئے تھی۔

اس نے تین چار گھنٹے نہیں پوری رات ہی گھر سے باہر گزاری تھی اور یہ سارا وقت بابے جلال کے ڈیرے پر نہیں...... بلکہ جاگیرداروں کی حویلی میں گزارا تھا۔ تین چار گھنٹے جاوید علی اکبر کے کمرے میں وی سی آر دیکھتے ہوئے اور پھر جاوید کو سلانے کے بعد فجر کی اذان سے تھوڑا پہلے تک کا وقت نازو کے ساتھ...... اس کے کمرے میں...... ڈھیروں ڈھیر سرگوشیاں کرتے ہوئے جن کی بازگشت ابھی تک اس کے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھی۔ اس کے نازک نازک نرم و ملائم گلابی ہاتھوں کا لمس ابھی تک اس کے اپنے ہاتھوں میں زندہ تھا اور...... اور آج سحری کے وقت جب وہ واپسی کے لیے نکل رہا تھا تو پہلی بار وہ چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو وقتی طور پر الوداع کہنے کے لیے......

اس لمحے سے اس وقت تک اسرار ان چند لمحوں کے جادوئی حصار سے نکل نہیں پایا تھا...... وہ نرم و گداز لمحات ایک خوش گوار تحیر کی صورت اس کے لہو سے روح تک میں جا اترے تھے اور وہ...... وہ ششدر تھا اپنے ہی اندر کی اس انوکھی حالت سے جو نازو کے اس کے سینے سے لگتے ہی یکا یک اس کے اندر ابھر آئی تھی...... اس سے پہلی کبھی بھی اس کا ایسی حالت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کوئی تجربہ نہیں تھا اس کا اور اب اس لمحاتی تجربے کے سامنے جیسے باقی سب کچھ بے اثر بے معنی اور ہیچ ہو کر رہ گیا تھا۔

نازو پہلے ہی اس کے نزدیک کچھ غیر معمولی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھی اور اب تو گویا وہ اس کے سر پر سوار ہوگئی تھی...... ان کے درمیان طے پایا تھا کہ چار پانچ روز کے لیے فرزند بھائی اپنے گرگوں سمیت لاہور میں ہیں تو اس دوران زیادہ نہیں تو دو چار گھنٹوں کے لیے تو روز ملا جاسکتا ہے...... اسرار نے جاوید کو بھی اس بات پر تیار کرلیا تھا کہ فرزند بھائی کی واپسی تک روز ایک آدھ فلم دیکھا کریں گے...... اب یہ تو جاوید علی اکبر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اصل میں فلم چل کون سی رہی ہے...... اس کا دوست اور لاڈلی بہن خود کون سے کردار نبھا رہے ہیں؟



منہ پر پڑنے والی ٹھوکر اتنی زوردار تھی کہ وہ درد کی شدت سے چیختا ہوا فرش پر پلٹی کھا گیا۔ ہاتھ پشت پر نائیلون کی رسی سے اس قدر کس کر باندھے گئے تھے کہ وہ رسی اس کی کلائیوں کے گوشت میں دھنسی ہوئی تھی۔ لال دین عرف لالے نے بے دردی سے اسے بالوں سے پکڑ کر پھر سے فرش پر سیدھا بٹھا دیا۔ اس کے سامنے چوہدری فرزند علی اکبر کھڑا خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر شراب کی تپش اور آنکھوں میں غصے اور جنون کی سرخی...... لالہ پسٹل سنبھالے اس کے سر پر سوار تھا اور چوہدری فرزند علی اکبر کے دائیں ہاتھ کھڑا گاما بھی سفاک نظروں سے اسی کو گھور رہا تھا۔ اس کے کندھے کے ساتھ رائفل جھول رہی تھی۔

"ہم نے یہاں کی مکمل ذمہ داری تجھے سونپ رکھی تھی منظورے پھر تیرے ہوتے ہوئے وہ حرامی اس چار دیواری میں داخل ہوا تو ہوا کیسے؟"

"چوہدری صاحب ایک بار معاف کردیں آئندہ کوئی کوتاہی کوئی غلطی......" چوہدری صاحب کی دوسری ٹھوکر نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی اور وہ ایک بار پھر چیختا ہوا دائیں طرف لڑھک گیا...... لالے نے پھر اسے بالوں

سے پکڑ کر بٹھا دیا..... منہ میں بھر آنے والا نمکین خون اس کی باچھوں سے بہہ نکلا تھا۔

''معافی..... غلطی..... تیری اس غلطی سے ہمارا کیا نقصان ہوا ہے' تجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہے کتے کے جنے..... یہ ہماری آن کا معاملہ ہے اور تو..... تو کوتاہی اور غلطی کی بات کر رہا ہے۔'' چوہدری فرزند کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

منظورے کی حالت انتہائی ابتر تھی' خون آلود قمیص کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ گریبان ناف تک پھٹا ہوا تھا' ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہونے کو تھی۔ دائیں کنپٹی اور گال پر جما ہوا خون سیاہی مائل رنگت اختیار کیے ہوئے تھا اور پیشانی کے بال بھی خون کی چپچپاہٹ کی وجہ سے آپس میں چپکے ہوئے تھے۔ اس کی زبوں حالی سے صاف ظاہر تھا کہ اب سے پہلے بھی اس پر اچھا خاصا وحشیانہ تشدد کیا گیا ہے۔

''آپ کو خدا رسول کا واسطہ چوہدری صاحب' خدا کے لیے..... خدا کے لیے مجھے بخش دیں..... ایک بار..... صرف ایک بار مجھے معاف کر دیں میں ساری زندگی آپ کی غلامی میں گزار دوں گا..... بس ایک بار معاف کر دیں۔'' منظور پھر سے گھگھیایا تھا۔

''ٹھیک ہے..... معاف کر دیں گے..... تیرے جیسے نمک حراموں کی ہمیں ضرورت بھی تو نہیں ہے نا۔'' چوہدری فرزند علی کے چہرے پر ایک سفاک سی مسکراہٹ تھی۔ منظور کی رنگت بالکل زرد پڑ گئی۔

''چوہدری صاحب..... میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہیں..... میرے علاوہ گھر میں کمانے والا اور کوئی نہیں' آپ ہی کے ٹکڑوں.....''

''بس بس..... اپنی اس کتے والی زبان کو پٹہ ڈال..... پہلے ہم اس حرام خور کا کچھ کر لیں پھر تیری معافی شافی کا کرتے ہیں کچھ۔'' چوہدری فرزند علی نے انتہائی ناگواری سے کہا اور پھر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا واپس پلٹ گیا..... منظور عقب سے دہائیاں اور واسطے ہی دیتا رہ گیا اور چوہدری فرزند علی دروازے سے نکلتا چلا گیا۔ گاما اور لالہ بھی اس کے پیچھے ہی باہر کو لپکے تھے..... لالے نے آہنی دروازے کو باہر سے بند کرتے ہوئے اس پر بڑا سا تالا ڈالا اور تیزی سے چوہدری صاحب کے پیچھے ہولیا جو راہداری کے کونے میں موجود سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے..... چوہدری فرزند علی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چھت پر آیا۔ ذرا رکتے ہوئے اس نے اطراف میں نظر دوڑائی' کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف' پانی والی ٹنکی کے قریب کوئی موجود تھا۔ وہ خاموشی سے اس طرف بڑھ گیا..... وہاں موجود شخص نے اپنے عقب میں آہٹ محسوس کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے پلٹا' اس کے ہاتھوں میں چھوٹے بیرل کی ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور بائیں آنکھ پتھر کی تھی..... چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کی آنکھ کا پتھر چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چوہدری فرزند علی پر نظر پڑتے ہی اس کے تنے ہوئے اعصاب فوراً ڈھیلے پڑ گئے۔

''کیوں حکم داد' کیا صورت حال ہے؟'' چوہدری فرزند علی کی آواز نشے سے بوجھل تھی۔

''ہم لوگ تاک میں بیٹھے ہیں چوہدری صیب..... ابھی تک تو وہ خنزیر کا بچہ نہیں آیا۔'' اس کی کھڑکھڑاتی سی آواز بھی اس کی شکل ہی کی طرح بھیانک تھی۔

''سانگھا اور قادر کدھر ہیں؟''

''وہ دونوں نیچے پوزیشنیں سنبھالے ہوئے ہیں۔''

''خیال رہے حکم داد..... اگر آج وہ آنے کے بعد زندہ واپس نکل گیا تو ہم اپنے ہاتھوں سے تم سب کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے..... یہ بات اچھی طرح اپنے بھیجے میں بٹھا لو۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں چوہدری صاحب..... بس ایک بار اس کتیا کے جنے کو آنے دیں بس..... جندہ کیا' اس کا مردہ بھی نہیں جانے دیویں گے ہم۔'' حکم داد کا لہجہ اعتماد سے پُر تھا۔

''ہوں.....'' فرزند علی نے ہنکارہ سا بھرا۔ ''ٹھیک ہے ہم نیچے اپنے.....'' یک بہ یک فرزند علی کی زبان کو بریک لگ گئے۔ اس کی آنکھیں کوٹھی کی بغلی دیوار کی طرف جم کر رک گئی تھیں۔

''ہوشیار حکم داد' آ گیا.....'' فرزند علی کی آواز میں سانپ کی سی پھنکار تھی' باقی سب کو بھی وہ ہیولہ دکھائی دے

گیا تھا جو ایک ذرا دیوار پر ٹھہرتے ہوئے اندر کو دآیا تھا۔
حکم داد نے فوراً ہی رائفل کندھے سے لگالی۔ خود چوہدری فرزند علی نے جھپٹ کر گامے سے رائفل پکڑی اور حکم داد کے برابر ہی پوزیشن سنبھال لی' سبھی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو چکی تھیں...... رائفل چوہدری صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔ ایک ذرا کمی بیشی کی صورت نتیجہ ان سب کے اپنے حق میں کس قدر خراب اور جان لیوا رخ اختیار کرسکتا تھا یہ خیال ہی ان کے جسموں میں سرد لہریں دوڑا گیا تھا۔

''احتیاط حکم داد...... اسے تھوڑا آگے آنے دو۔'' حکم داد کے کانوں سے چوہدری صاحب کی زہریلی سرگوشی ٹکرائی مگر وہ جواب میں کچھ بولا نہیں اس کی انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی اور پورا وجود گویا آنکھ بن چکا تھا۔
پھر چوہدری فرزند علی کے ٹریگر دباتے ہی حکم داد نے بھی فائر کھول دیا...... ساتھ ہی کوٹھی کے نچلے حصے سے بھی فائرنگ کی آواز بلند ہوئی تھی۔ رات کا سناٹا اس اچانک شروع ہونے والی فائرنگ سے کرچی کرچی ہو کر رہ گیا...... انہوں نے واضح طور پر دیکھا کہ ان کا شکار نشانہ بنتے ہی گرا' پھر لڑکھڑا کر اٹھا اور دوبارہ اچھلتا ہوا زمین بوس ہو گیا تھا۔

''یہ...... مارا......'' فرزند علی نے جوش وجنون سے چھلکتی آواز میں جیسے نعرہ سا لگایا اور پھر تقریباً دوڑنے والے انداز میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا...... اس کے تینوں گرگوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔
فرزند علی بہ عجلت سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچا اور تیزی سے لان کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں ان کی گولیوں کا نشانہ بننے والا شکار اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا...... وہ ایک کتا تھا...... سیاہ کتا' کئی ایک گولیاں اس کے وجود میں سوراخ کر گئی تھیں اور ان سوراخوں سے بھل بھل خون ابل رہا تھا۔ حکم داد' گامے اور لالے کے علاوہ قادر اور سانگھا بھی رائفلیں سنبھالے فرزند علی کے قریب پہنچ گئے تھے اپنے چوہدری صاحب کے چہرے پر فتح مندانہ سی چمک دکھ کر ان پانچوں کے چہروں پر بھی اطمینان اتر آیا تھا۔

دم توڑتے کتے پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور اس کے حلق سے عجیب پھنسی پھنسی سی اذیت ناک آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔
''ویسے لگتا تو یہ بھی کسی اعلیٰ نسل کا ہے۔'' درنے بغور کتے کو دیکھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
''جتنی بھی اعلیٰ نسل کا ہوا اپنی پوشا کی نسل سے ہیں ہے سو اس کی یہی سزا بنتی تھی...... اس سے کم کچھ نہیں!'' فرزند علی نے حقارت سے کہا۔ ٹھیک اسی وقت پوشا بھی کسی طرف سے نک کر وہیں پہنچ آئی اور سیدھی لان کے گھاس پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑے اس سیاہ کتے کی طرف لپکی' اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی بے قراری اور بے تابی تھی۔ پہلے وہ ہلکے ہلکے بھونکی' غرائی جیسے گھاس پر پڑے کتے سے اس کی تکلیف اور حالت کے متعلق استفسار کر رہی ہو...... پھر اس کے گرد گھومتے ہوئے اسے سونگھنے لگی۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے کچھ اس طرح کی کراہتی ہوئی سی آوازیں خارج ہونے لگیں جیسے کسی اپنے کے مرنے پر غمزدہ ہو گئی ہو...... گویا وہ اس کے دکھ...... افسوس اور بے بسی کا اظہار تھا۔
چوہدری فرزند علی اپنی جگہ کھڑا عجیب گھورتی ہوئی نظروں سے پستہ قامت پوشا کی حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا۔
''پوشا......'' فرزند علی نے پکارا مگر پوشا نے اس کی پکار پر توجہ نہیں دی۔
''پوشا...... پوشا رانی......'' فرزند علی نے دوبارہ پکارا مگر اس نے اس بار بھی کان نہیں دھرے' وہ کرلا رہی تھی اور گھاس پر پڑے کتے کے بے جان وجود کو سونگھ رہی تھی' ساتھ کی ساتھ اسے اپنے پنجوں سے چھیڑ بھی رہی تھی۔
''جناور ہے سائیں' اپنے ساتھی کی موت پر غمزدہ ہے شاید۔'' سانگھا کی رائے زنی پر چوہدری فرزند علی نے ایک نظر قہر بار اس پر ڈالی اور قدرے کرخت لہجے میں پھر سے پوشا کو پکارا۔
''پوشا......'' اس بار پوشا نے سر اٹھا کر چوہدری فرزند علی کی طرف دیکھا مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
''پوشا...... ادھر' ہمارے پاس آ ؤ رانی۔'' فرزند علی نے

پچکارا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی دم ہلاتے ہوئے فرزند علی کی طرف دیکھ کر اپنی چھوٹی سی آواز میں دو بار بھونکی...... پتا نہیں وہ کیا کہنا سمجھانا چاہ رہی تھی' فرزند علی کی تیوریاں چڑھ آئیں۔

''پوشا......!'' فرزند علی نے گویا ڈپٹا تھا۔ جواباً پوشا پھر سے بھونکی مگر اس کا بھونکنا دوسری آواز پر ہی چیخ میں بدل گیا۔ فرزند علی نے اچانک ہی ہاتھ میں دبی رائفل سیدھی کرتے ہوئے فائر کھولا تھا...... ایک گولی پوشا کی گردن کے پار ہوئی تو دوسری اس کی پسلیوں میں سوراخ کھولتی ہوئی نکل گئی تھی۔ فرزند علی کے گرگے بے اختیار ایک ایک دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔

پوشا اپنے ساتھی کے قریب ہی گر کر تڑپنے لگی تھی......

ان پانچوں نے حیرت و بے یقینی سے اپنے چوہدری کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی مگر آنکھوں میں افسوس اور حسرت کی پرچھائیاں' سبھی جانتے تھے کہ پوشا چوہدری صاحب کو کس قدر عزیز تھی...... کتنی پیاری تھی انہیں وہ...... اور ابھی ابھی انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے گولی ماردی تھی۔

''لالے......'' چند لمحے بعد فرزند علی نے رائفل ایک طرف پھینکتے ہوئے لال دین کو مخاطب کیا۔

''جی چوہدری صاحب۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا تھا۔

''گاڑی نکالو...... ہم ابھی' اسی وقت واپس گاؤں چلیں گے۔''

''جو حکم چوہدری صاحب۔'' لالہ فوراً ہی پورچ میں کھڑی پراڈو کی طرف دوڑا تھا۔

''حکم داد...... منظورا ابھی تک زندہ کیوں ہے؟'' فرزند علی کی آواز مزید بوجھل ہو چکی تھی۔

''اس کی سانسیں بھی ختم سمجھیں چوہدری صاحب۔'' حکم داد رائفل سنبھالتے ہوئے اندرونی جانب کو بڑھ گیا تو فرزند علی نے سانگھا کو مخاطب کیا۔

''سانگھا!''

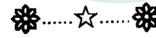
''جی سائیں۔''

''تم اور حکم داد یہیں ٹھہرو گے...... ان تینوں لاشوں

کو ایک ساتھ کہیں ٹھکانے لگانا...... کسی گندی اور غلیظ جگہ پر...... اور کچھ نہیں تو تینوں کو ایک بورے میں ڈال کر کسی گٹر میں پھینک دینا۔''

''ایسا ہی ہوگا سائیں۔'' سانگھا نے گردن جھکاتے ہوئے کہا...... فرزند علی نے ایک نظر پوشا کے مردہ وجود پر ڈالی اور گاڑی کی طرف پلٹ گیا...... قادرے نے اس کی تقلید کی جبکہ گاما ایک طرف گھاس پر پڑی رائفل اٹھاتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف لپکا تھا۔

چوہدری فرزند علی اکبر چار چھ دن یہیں...... لاہور میں گزارنے کا ارادہ کرکے آئے تھے اور اب دوسرے روز ہی...... رات کے اس پہر انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا تو اس کی وجہ چوہدری کے وفادار خوب سمجھتے تھے...... انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس وقت چوہدری صاحب کی طبیعت یہاں سے بالکل ہی اچاٹ ہوگئی ہے...... وہ بری طرح بددل ہوچکے ہیں اسی لیے اب راتوں رات واپس حویلی پہنچنا چاہتے ہیں۔



اسرار حیدر بیڈ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ نازیہ اس کے گلے کا ہار ہوگئی' گویا وہ دروازے کے پاس برسوں سے اسی انتظار میں کھڑی تھی کہ کب اسرار آئے اور وہ اپنے دل کی بے تابیوں کو اس کے سینے کے سپرد کرے۔

''ارے...... ارے پاگلے...... دروازہ تو بند کرنے دے۔'' اسرار ایک ذرا تو اس کی اس وارفتگی پر ذرا سا بوکھلایا ساتھ ہی اس نے اپنے بازو نازیہ کی کمر کے گرد حمائل کردیئے۔ نازیہ یوں اس سے لپٹ گئی تھی جیسے اب تادم آخر جدا ہونے علیحدہ ہونے کا ارادہ نہ رکھتی ہو...... کل بھی جس وقت اسرار واپسی کی نیت سے نکلنے لگا تھا تو نازیہ یونہی اچانک اس کے گلے سے آن لگی تھی اور اسرار کے ہوش وحواس بھک سے اڑ گئے تھے۔

''نازو...... او جھلیے' دروازہ بند کرنے دے...... اگر کوئی اچانک ادھر آنکلا تو قیامت آجائے گی۔'' اسرار کو اپنی ہی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ایک انوکھی خمار آلود سرشاری اس کے حواس پر اترتی رہی تھی۔

نازیہ ہر بات سے بے نیاز و بے پروا گلوں کی بیل کی طرح اس سے لپٹی رہی۔ اس کی گرم سانسیں اسرار کے سینے کو سہلا رہی تھیں۔ آخر اسرار نے پاؤں کی مدد سے اپنی عقب میں دروازے کو بند کیا اور پھر ہاتھ اٹھا کر چٹخنی چڑھا دی۔

''کیا بات ہے نازو...... آج یہ دیوانگی کیسی؟'' اسرار نے بھی پوری طرح اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ نازیہ کے بالوں سے اٹھنے والی عود و عنبر سی مہک اسرار کے نتھنوں میں داخل ہورہی تھی۔

''کتنا انتظار کروایا ہے تم نے...... جانتے ہو میں ایک ایک پل کس طرح گن گن کر کاٹتی رہی ہوں۔'' وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے جیسے سسکی تھی۔

''اللہ کی بندی' تمہیں کیا پتا ادھر...... مردان خانے سے یہاں تمہارے بیڈ روم تک کا فاصلہ طے کرکے آنا کتنے جان جوکھم کا کام ہے...... تمہارے باپ بھائیوں کے وفاداروں اور پالتو کتوں سے نظر بچا کر یہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام تھوڑے ہی ہے اور پھر...... جاوید کو بھی تو نیند کی گولی دینی پڑتی ہے...... ویسے تو اس الو کے پٹھے کو نیند آتی نہیں۔'' نازیہ نے ایک ذرا سر اٹھا کر اسرار کی آنکھوں میں جھانکا پھر اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔

''تم...... میرے ابا کو الو کہہ رہے ہو۔'' اسرار نے اس کی مرمریں کمر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اپنا سینہ تھاما تو نازیہ بھی اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

''پٹھا شاگرد کو کہتے ہیں...... پتر کو نہیں...... اس لحاظ سے الو تمہارے ابا نہیں بلکہ تمہارے ویر کی استاد محترم ٹھہرے۔'' اسرار نے گویا اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

نازیہ نخریلے انداز میں چلتی ہوئی بیڈ پر جا بیٹھی۔

''اگر مجھ تک آتے ہوئے تمہیں اتنا ہی ڈر لگتا ہے تو پھر آئے ہی کیوں...... نا آتے۔''

''ہاں...... ڈر تو واقعی لگتا ہے مگر یہ ہے نا......'' اسرار نے سینے پر دل کی جگہ تھپتھپائی۔ ''اس کم بخت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یہ نہیں مانتا سنتا...... اور پتا ہے' کل رات میرے گھر سے غائب ہونے کا حجاب باجی کو پتا چل گیا

تھا۔''

''اوہ پھر؟'' نازیہ قدرے چونکی۔

''پھر کیا..... کالج سے واپس آتے ہی مجھے گھیر لیا انہوں نے۔'' اسرار آگے بڑھ کر اس کے برابر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''اور شروع ہو گئیں..... کہاں تھے..... کس کے ساتھ تھے..... کیوں تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

''پھر تم نے کیا بتایا؟'' نازیہ کے انداز میں تشویش محسوس کرتے ہوئے اسرار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں نے بابے جلال کے ڈیرے کا بتایا ان کو کہ وہاں تھا..... دوستوں کے ساتھ وی سی آر دیکھ رہا تھا۔''

''پھر تو آج دوبارہ کلاس لگے گی تمہاری۔''

''امید تو نہیں ہے..... کیوں کہ آج جائے میں ایک گولی باجی کو بھی دے کر آیا ہوں..... اب صبح ماں جی کے جگانے پر ہی جاگیں گی اور اگر بالفرض آج بھی انہیں پتا چل گیا تو پھر کوئی نہ کوئی بہانہ' کوئی جھوٹ بولنا پڑے گا۔''

''اسرار..... ہماری اس محبت کا انجام کیا ہوگا..... کبھی کبھی تو یہ سوچ کر مجھے بڑی گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔'' نازیہ نے سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''انجام کیا ہونا ہے..... شادی..... یا پھر..... پتا نہیں۔''

''تم لوگ سید..... ہم گجر..... یہ شادی بھلا کیسے ہوگی' ہمارے بڑے تو اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔''

''اگر تو شریعت کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو پھر تو کوئی مسئلہ' کوئی رکاوٹ نہیں..... میرے بڑوں کا بھی اتنا مسئلہ نہیں ہے..... ہاں البتہ تمہارے باپ بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔''

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' نازیہ کے سوال پر اسرار نے ہاتھ بڑھا کر اسے گردن سے تھاما اور نازیہ اس کے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ ہی اس کی ران پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''تم بتاؤ..... تم کیا چاہتی ہو..... کیا کرنا چاہیے ہمیں؟'' اسرار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

''میں بھلا کیا بتاؤں..... مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتی..... اتنا پتا ہے کہ ہمارا ایک ہونا' قبول نہیں کیا جائے گا اور..... اور اگر تم سے ہٹ کر کچھ سوچنے کی کوشش بھی کروں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر تم سے جدا رہ کر جینا پڑا تو..... تو میں مر جاؤں گی۔'' نازیہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی..... اسرار قربان ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا..... دونوں ایک دوسرے میں یوں گم تھے کہ انہیں دنیا جہان کی جیسے کوئی ہوش..... کوئی فکر نہ ہو۔

''میرا بھی یہی حال ہے نازو..... اور تمہیں سچ بتاؤں..... مجھے لگتا ہے کہ میری عمر بھی بہت تھوڑی ہے..... یا تو میں تمہارے باپ بھائیوں کے ہاتھوں کسی روز مارا جاؤں گا یا..... یا پھر.....''

''بکواس مت کرو.....'' نازیہ نے روہانسی آواز میں اس کی بات کاٹی' ساتھ ہی دو سفید چمکدار موتی سے اس کی آنکھوں کے کناروں سے ٹوٹ کر کنپٹیوں کی طرف پھسل گئے اور اس نے بے اختیار ہو کر اپنا منہ اسرار کے سینے میں چھپا لیا' اسرار کی اپنی آنکھیں جھلملا اٹھی تھیں۔ اس نے بیٹھے بیٹھے نازیہ کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔

''میرا بس چلے تو میں تمہیں اپنے سینے میں چھپا کر یہاں سے کہیں دور..... بہت دور لے جاؤں..... جہاں تمہارے بڑے کبھی نہ پہنچ سکیں..... کوئی تمہیں مجھ سے جدا نہ کر سکے۔''

''کیا اس زمین پر کوئی ایسی جگہ ہو سکتی ہے؟'' اسرار کے سینے پر دل کے قریب نازیہ کے ہونٹ تھرتھرائے' دونوں ہی کے لہجوں میں ایک خواب ناکی گھلی ہوئی تھی۔

''یہ زمین..... یہ دنیا بہت بڑی ہے نازو..... تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔''

''تو..... تو پھر مجھے لے چلو اسرار..... ہمیشہ کے لیے۔'' اسرار نے اسے خود سے تھوڑا الگ کرتے ہوئے اس کی خمار آلود آنکھوں میں جھانکا۔ اس کا ایک بازو نازیہ کے سر کے نیچے تھا اور دوسرا اس کے پہلو سے ہوتا ہوا کمر کے گرد۔

''سوچ لو نازو......''

''اب کیا سوچوں اسرار؟''

''کہاں تک میرا ساتھ دو گی؟''

''اس زمین کے آخری کنارے تک......دل کی آخری دھڑکن تک......سانس کی آخری رمق تک۔''

''ہوسکتا ہے میرے ساتھ تمہیں زمین پر سونا پڑے...... میں تمہیں اس حویلی والے عیش و آرام نہیں دے سکوں گا۔''

''میرے جذبوں پر شبہ ہے تمہیں یا میرا امتحان لینا چاہتے ہو؟''

''صرف یہ خیال ہے کہ کہیں بعد میں تم پچھتانے نہ لگو۔''

''تمہارے کندھے کے تکیے اور بازوؤں کے لحاف سے زیادہ عیش میرے لیے اور کچھ نہیں اسرار......ان نعمتوں پر میں ہر نعمت' اور تمام عیش و آرام کو وار کر تنور میں جھونک دوں۔''

''تو کیا میں پھر سچ میں کوئی انتظام کروں...... تمہیں ہمیشہ کے لیے سب سے چرا کر کہیں دور...... لے جانے کا۔''

''انتظام کیسا اسرار...... تم کہو تو میں ابھی اٹھ کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔''

''جھلی نہ ہو تو۔'' اسرار نے مسکراتے ہوئے نازیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا تو نازیہ کی پلکیں خود بخود بند ہوگئیں۔ اس کے گلابی رخسار تمتما رہے تھے اور یاقوتی ہونٹ شدت جذبات سے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ اسرار بے خود سا ہوکر فریفتہ نظروں سے یک ٹک اس من موہنی صورت کو تکنے گیا جو ہمہ وقت اس کے من مندر میں مسکراتی رہتی تھی۔ پڑھتے لکھتے' اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' کبھی خیالوں میں تو کبھی خوابوں میں وہ جس کی دید کی خواہش اسے عزت' ذلت اور زندگی و موت سے بے پروا اور بے نیاز کر کے یہاں تک کھینچ لائی تھی......وہ دونوں ہی سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ کون سا جذبہ ہے...... کون سا طلسم ہے جس نے ان دونوں ہی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہے......بس اپنے اپنے طور پر دونوں ہی نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ یہ محبت ہے......وہی محبت جس کی ہزاروں داستانیں اور ہزاروں قصے دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہی محبت جس کے متعلق انہوں نے پڑھ سن رکھا تھا کہ یہ اندھی ہوتی ہے۔ یہ امیری غریبی' ذات پات اور گورے کالے کا فرق نہیں دیکھ پاتی...... یہ بہری بھی ہوتی ہے' جو کچھ سنتی مانتی نہیں' اور اب یہی اندھی بہری طاقت انہیں اکسا رہی تھی' انہیں اپنی دنیا تلاشنے' بسانے کے رنگین سپنے دکھا رہی تھی اور وہ دونوں بھی راضی خوشی اندھے بہرے بن کر بصد شوق یہ سپنے دیکھنے پر آمادہ و تیار تھے۔ قدرت اور تقدیر سے بے نیاز بیٹھے اپنے آنے والے کل کے متعلق منصوبے ترتیب دینے میں مصروف تھے۔

پھر جب اذانیں ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی رہ گیا تو اسرار اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے نازو...... اذانیں ہونے والی ہیں...... میں اب نکلتا ہوں۔''

''ہیں......اتنی جلدی اذانوں کا وقت بھی ہوگیا' ابھی تو تم آئے ہو۔'' نازیہ نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا تو اسرار مسکرادیا۔

''محبت میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا...... مجھے بابا سائیں کے جاگنے سے پہلے چھت پر پہنچنا ہے۔ اذان ہوتے ہی باقی سب بھی جاگ جاتے ہیں۔''

''اچھا ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔'' نازیہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے چٹخنی گراتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر جھانکا......باہر مکمل خاموشی اور سناٹا تھا۔ اسرار دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ نازیہ نے اطمینان کرنے کے بعد اسرار کی طرف دیکھا اور پھر سے اس کے سینے سے لگ گئی۔

''ہائے اسرار...... کتنی جلدی صبح ہوجاتی ہے' کب یہ مجبوری ختم ہوگی' کب ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہوں گے۔''

''فیصلہ تو کر ہی چکے...... اب چند دن حوصلے اور صبر سے کام لینا ہوگا......اس کے بعد یہ علاقہ تو کیا ہم یہ صوبہ ہی چھوڑ دیں گے۔''

''کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے اسرار......'' اس نے سر اٹھا کر اسرار کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسرار نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔

''خدا نے چاہا تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ چند دن بعد ایک رات ہم چپکے سے نکل لیں گے لیکن ایسا تبھی ہوگا کہ اگر تم اس وقت مجھے واپس جانے دو تو......؟'' اسرار کا مطلب سمجھتے ہوئے نازیہ مسکرا کر اس سے الگ ہوگئی۔

''ٹھیک ہے میں اس رات کا انتظار کروں گی۔'' اسرار نے ایک ذرا خود بھی باہر جھانک کر دیکھا' پھر نازیہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''خدا حافظ نازو...... جلد دوبارہ ملیں گے۔''

''ان شاء اللہ...... خدا حافظ۔'' نازیہ نے خلوص دل سے کہا اور اسرار دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

نازیہ کا کمرہ دوسری منزل پر تھا' کمرے کے سامنے ایک مختصر سی راہداری تھی جو آگے سے دائیں ہاتھ مڑتی تھی اور وہاں سے سیڑھیاں نیچے صحن میں اترتی تھیں۔ اسرار بے قدموں چلتا ہوا راہداری کے کونے تک پہنچا۔ وہاں سے جھانک کر اس نے پھر تسلی کی۔ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا...... سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر اس نے بغور صحن کا جائزہ لیا...... اسے معلوم تھا کہ زنان خانے کے حصے میں صرف ایک کتا رات کو رکھوالی کی غرض سے کھلا چھوڑا جاتا ہے' باقی نوکر چاکر حویلی کے مردانہ حصے میں ہی رہتے تھے اور اصل پریشانی بھی اسی حصے میں آتے جاتے اٹھانا پڑتی تھی۔ بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا اسے۔

اسرار نے پورے صحن میں نظر دوڑائی...... ڈھلتے چاند کی روشنی میں میدان بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کتا یا تو کسی کونے کھدرے میں دبکا اونگھ رہا تھا یا پھر حویلی کے پچھواڑے ڈھور ڈنگر والے حصے کی طرف نکلا ہوا تھا۔

اس نے خدا کا نام لیا اور سیڑھیاں اتر کر صحن میں آ گیا۔ روشنی سے بچنے کی غرض سے وہ فوراً ہی بائیں ہاتھ قطار میں بنے کمروں کے سامنے والے برآمدے میں گھسا اور محتاط مگر تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا...... برآمدے کے آخر پر ایک ذرا کھلا حصہ تھا جو مردان خانے کی دیوار پر ختم ہوتا تھا...... دیوار کے درمیان میں ایک بڑے گیٹ کے سائز کا خلا تھا جو زنان خانے اور مردان خانے کو آپس میں ملاتا تھا۔ یہی دیوار حویلی کے سامنے کے دروازے سے حویلی کی عقبی طرف بنے بھانے نما حصے تک جاتی تھی اور زنانہ مردانہ دونوں حصوں سے بھانے میں داخلے کے رستے بھی اسی دیوار کے آخر میں بنے ہوئے تھے...... مردان خانے میں کتے بھی تھے...... گرانڈیل اور خونخوار کتے مگر ان کی اسرار کو زیادہ فکر اس لیے نہیں تھی کہ وہ عموماً رات کو بھی بندھے ہی رہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ساری رات ادھر چوہدریوں کے مسلح محافظ جاگتے رہتے تھے۔ گھومتے پھرتے رہتے تھے اور وہ اسرار کو جانتے پہچانتے تھے کہ یہ سید اسرار حیدر ہے۔ چوہدری جاوید علی اکبر کا بچپن کا دوست...... اسرار کو بس اتنی احتیاط کرنی ہوتی تھی کہ ان میں سے کوئی اسے زنان خانے سے نکلتے ہوئے نہ دیکھے...... مردان خانے میں اگر وہ گھومتا پھرتا دکھائی دے بھی جاتا تو یہ کوئی ایسی خاص پریشانی والی بات نہ تھی...... جاوید علی سے وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ جاوید تو چاہے جاگتا رہے یا سوئے' میں اذان سے پہلے چپ چاپ نکل جایا کروں گا۔''

کل بھی وہ چپ چاپ نکل گیا تھا اور آج بھی اس کے ویسے ہی چپ چاپ نکل جانے کا وقت ہوا تھا لیکن...... آج کے لیے قدرت نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

وہ بچتا بچاتا جیسے ہی مردان خانے کی دیوار کے درمیانی کھلے حصے میں پہنچا اسے بے اختیار ٹھٹک کر رکنا پڑ گیا...... بالکل قطعی غیر متوقع طور پر...... سامنے ہی بیس پچیس قدم کے فاصلے پر چوہدری فرزند علی اکبر اسی طرف چلا آ رہا تھا...... وہ جسے اس وقت لاہور میں ہونا چاہیے تھا وہ اسرار کے سامنے مردان خانے سے زنان خانے کی طرف چلا آ رہا تھا اور اسرار خود زنان خانے سے مردان خانے کے داخلی حصے میں کھڑا تھا۔ چوہدری فرزند علی نے بھی اسرار کو دیکھ لیا تھا۔ اسرار نے اسے ٹھٹکتے دیکھا۔ گڑبڑ ہو چکی تھی۔ انتہائی بڑی اور شدید نوعیت کی سنگین گڑبڑ...... اسرار کے ذہن میں کچھ دیر پہلے نازیہ سے کہے اپنے ہی الفاظ گونج اٹھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ میری عمر بھی بہت تھوڑی ہے...... یا تو میں تمہارے باپ بھائیوں کے ہاتھوں کسی روز مارا جاؤں گا یا...... یا پھر......''

''خبردار اوئے...... اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔'' چوہدری فرزند علی کی کڑک دار للکار اسرار کے سن ہوتے حواسوں سے ٹکرائی اور موت کی یاد دلاتی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ اسرار نے دیکھا کہ چوہدری فرزند کا دایاں ہاتھ برق رفتاری سے قمیص کے نیچے گیا تھا۔ یقیناً وہ کمر کے ساتھ بندھے ہولیسٹر سے پستل نکالنے والا تھا...... وقت کم تھا...... فوری فیصلے اور عمل کی گھڑی تھی......

کسی قسم کی خوش فہمی اسے تھی نہیں...... اس بات کا پہلے ہی سے پختہ یقین تھا کہ اگر کسی روز یہ معاملہ کھل آیا تو اس کا بچپن کا یار جاوید بھی اسے بے دردی سے قتل کر دینے سے دریغ نہیں کرے گا اور اب معاملہ کھل آیا تھا...... چشمِ تصور میں اس نے خود کو سینے میں گولیاں کھا کر وہیں ڈھیر ہوتے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو پلٹ کر بھاگتے پایا۔

''رک......'' اس کی سماعت سے چوہدری فرزند کی غلیظ للکار ٹکرائی جو فوراً ہی فائر کی آواز میں دب کر رہ گئی۔ اس کے کان کی قریب سے گزرنے والی ایک تیز رو کی آواز یقیناً گولی ہی کی تھی...... اسے اپنے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی پھر بھی وہ دوڑ پڑا تھا۔ کسی لاشعوری قوت نے اس کی ٹانگوں میں جیسے کوئی برقی رو دوڑا دی تھی...... اس کا رخ حویلی کے عقبی حصے میں بنے بھانے کی طرف تھا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی کئی ایک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ اسرار اندھادھند بھاگتا ہوا بھانے میں داخل ہو رہا تھا کہ بھانے سے زنان خانے کی طرف دوڑتے کسی ملازم سے ٹکرا گیا...... دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے...... اسرار کی پسلیوں میں شدید چوٹ آئی مگر وہ دوسرے ہی لمحے اٹھتا ہوا عقبی دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ البتہ اس سے ٹکرانے والے ملازم کو شاید کچھ زیادہ ہی چوٹ آ گئی تھی جو وہ اسی جگہ گٹھڑی سی بن کر پڑا رہ گیا۔

فائر کی آوز اور کتوں کی بھیانک آوازوں کے ساتھ ہی حویلی میں جیسے ایک بھگدڑ سی مچ گئی...... بھانی میں بندھی بھینسیں بھی اس ہاہا کار سے گھبرا کر ڈکرانے لگی تھیں مگر اسرار کو اپنی جان کے علاوہ کسی بات کی پروا نہیں تھی بھاگتے بھاگتے اچانک اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرتا ہوا دو تین قلابازیاں کھا کر ایک بھینس کی ٹانگوں سے جا ٹکرایا...... بھینس خوف زدہ ہو کر اچھلی اور اسرار خود کو اس کے پیروں تلے آنے سے بچاتا ہوا پھر سے اٹھ کھڑا ہوا...... پاؤں اور گھٹنے میں اچھی خاصی چوٹ آئی تھی...... اس کے ہاتھ پاؤں اور کپڑے گوبر میں لتھڑ گئے تھے مگر یہ وقت اس سب پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ بھاگتے دوڑتے قدموں اور لکاروں کی آوازیں بھانے کی طرف بڑھتی آ رہی تھیں۔ اسرار اپنے قریب ہی کہیں کسی کتے کی بھیانک غراہٹ بھی سنائی دی تھی مگر اسے فرصت نہیں تھی کہ وہ غور کرتا کہ کتا کس طرف موجود ہے۔

اس کی حواس باختگی میں صرف ایک خیال کی گونج گردش کر رہی تھی کہ اگر وہ پکڑا گیا تو پھر ذلت آمیز اور اذیت ناک موت سے اسے کوئی نہیں بچا سکے گا...... عبرت ناک موت کی خیال اور زندہ رہنے کی شدید ترین خواہش نے اسے دوسرے ہر خیال اور احساس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

وہ پھر سے اٹھ کر بھاگا...... سامنے ہی دیوار کے ساتھ بھینسوں کو چارہ ڈالنے کے لیے سیمنٹ کی کھرلی بنائی گئی تھی...... اسرار نے بھاگتے بھاگتے چھلانگ لگا کر ایک پاؤں اس کھرلی پر رکھا اور اچھل کر دیوار پر جا پہنچا...... دوسرے ہی لمحے وہ عقبی طرف کود چکا تھا۔

''اب...... اب کیا کیا جائے...... کدھر کا رخ کیا جائے؟ چوہدریوں کے پاس خطرناک اسلحہ ہے، گھوڑے اور گاڑیاں ہیں، جس طرف بھی منہ کروں گا، وہ لوگ لمحوں میں سر پہ پہنچ جائیں گے۔ ہاں، نہر یہاں سے قریب ہے اور نہر کے اس پار اپنی زمینیں اور...... اور زمینوں پر زوار بھاہ جی...... اگر میں کسی طرح بھاہ جی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ یقیناً مجھے اتنی آسانی سے چوہدریوں یا ان کے کتوں کا شکار نہیں ہونے دیں گے...... وہ ضرور معاملہ سنبھال لیں گے۔''

محض چند ثانیوں میں یہ تمام خیالات اسرار کے دماغ سے ہو کر گزرے...... اور پھر وہ نہر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)